دنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

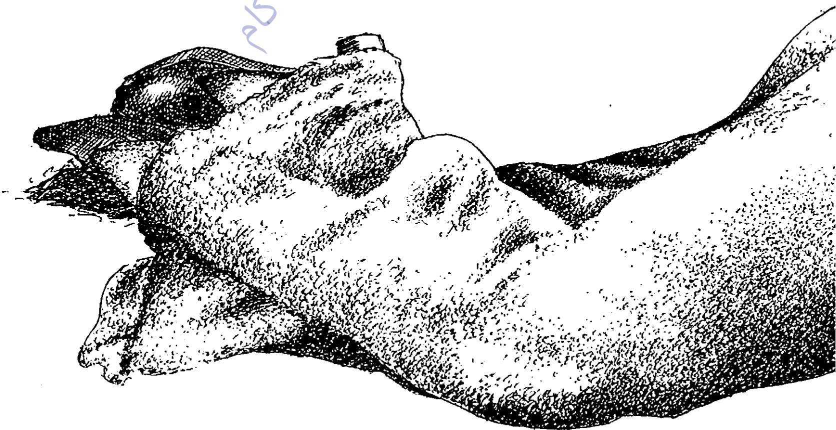
سب رنگ ڈائجسٹ





شمارہ-۱۰- جلد-۵ ✽ فی پرچا-۳ روپے ✽ زرِ سالانہ-۳۲ روپے ✽ سرورق طباعت-ایلیٹ پبلشرز لمیٹڈ
فون نمبر-۲۱۱۹۴۴-۲۱۱۹۶۱ ✽ تار کا پتہ-سب رنگ کراچی ✽ رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

پبلشر/ایڈیٹر شکیل عادل زادہ نے حسین زکریا کے اہتمام میں پاکستان ہیرالڈ پریس ضیاءالدین روڈ کراچی سے چھپوا کر ۵ سی ۲/۴ ناظم آباد سے شائع کیا
پتہ: ۴ بی پریس چیمبرز آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ✱ ذیلی دفتر ـ لطیف ہاؤس کرشن پورہ، پشاور



FIVE OF THE BIGGEST IN ONE OF THE BEST.



FAYYAZ BOKHARI PRESENTS S.F. PRODUCTION'S

رنگین
مس ہپی

MISS HIPPY

COLOR

عیدالفطر کا بے مثال تحفہ

PRODUCED BY
IRFAN MALIK
DIRECTED BY
S. SULEMAN
MUSIC
ROBIN GHOSH

SHABNAM · NADEEM · MUNAWAR ZARIF · SABIHA · SANTOSH

AFZAAL · MUNAWAR SAEED · HANIF · NAZLI · ASIFA GUEST ARTISTS **ALAUDDIN · LEHRI · KAMAL IRANI**

کوہِ نور اور کراچی و حیدرآباد کے منتخب سینما گھروں میں

آدمی

آدمی آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

آدمی کو اپنے آنے کا نہیں تو جانے کا ضرور پتہ ہوتا ہے یعنی یہ کہ ایک دن اُسے ضرور کوچ کرنا ہے اور جب اُسے یہ معلوم ہے کہ ایک دن سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے رخصت ہو جانا ہے، پھر کبھی واپس نہیں آنا ہے تو آدمی، آدمی کیوں نہیں رہتا، جانور کیوں بن جاتا ہے اور فرعون کیوں ہو جاتا ہے۔ ان باتوں پر صدیوں سے آدمی غور کر رہا ہے اور نتیجے میں اس نے کتابوں کے کئی ہزار محل تعمیر کر دیے ہیں جن میں آدمی کی بے ثباتی کا یقین دلایا جاتا ہے، اُس نے کتابیں بھی پڑھی ہیں اور مذہب و اخلاق کے درس بھی سنے ہیں اور اب وہ لباس بھی پہنتا ہے اور اُسے سفید و سیاہ نظر بھی آتا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے صرف اشیا بڑھی ہیں، رنگ بڑھے ہیں اور روشنی زیادہ ہو گئی ہے۔ آدمی وہیں ہے، جہاں پہلے تھا۔ اگر کوئی فرق واقع ہوا ہے تو صرف یہی کہ پہلے اسے بے دریغ چیر پھاڑ کرنے کی عادت تھی اب وہ یہ کام دوسرے انداز سے کرتا ہے، کبھی وہ جیب کترا بن جاتا ہے، کبھی غنڈا، کبھی سرمایہ دار، کبھی حاسد۔ جدھر دیکھیے، وہ ستا رہا ہے، فساد برپا کیے ہوئے ہے، دشمنی پر آمادہ ہے۔ اور اس کی دشمنی اشیا، درختوں اور جانوروں سے نہیں ہے، اپنی ہی نوع سے ہے۔ آدمی آدمی کا دشمن ہے۔

سوال یہ ہے کہ دوسرا آدمی لامحدود زمانے سے پہلے آدمی کا ظلم کیوں سہہ رہا ہے۔ کیا اس لیے کہ اس کا قد چھوٹا اور رنگ کالا ہے؟ کیا اس لیے کہ ایک کا مغز بڑا، دوسرے کا چھوٹا ہے؟ کیا اس لیے کہ ایک کے پاس طاقت ہے، دوسرا کمزور ہے؟ کیا اس لیے کہ ایک پس ماندہ ہے، دوسرا ترقی یافتہ؟ کیا اس لیے کہ ایک کے پاس اشیا و خدمات خریدنے کی قوت ہے، دوسرے کے پاس نہیں؟ کیا اس لیے کہ ایک نے زیادہ کتابیں پڑھی ہیں، دوسرا جاہل ہے؟ ایک آدمی غریب کیوں ہے؟ ایک آدمی امیر کیوں؟ ایک طاقت ور اور دوسرا کمزور کیوں؟ ایک کا قد بڑا، دوسرے کا چھوٹا کیوں ہے؟ ایک کا رنگ سفید، دوسرا کالا کیوں ہے؟ ایک ذہین، دوسرا احمق کیوں ہے؟

اگر ظلم اور ظلم سہنے کی وجوہ یہ ہیں کہ ایک آدمی برتر، دوسرا کم تر ہے تو برتر آدمی کو اس برتری کا دعوا بھی کرنا چاہیے کہ وہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔ اس کے قوا کبھی مضمحل نہیں ہوں گے اور اُسے رنگ برنگا لباس اُتار کے سفید لباس کبھی نہیں پہنایا جائے گا۔ اگر اسے اُٹھ جانا ہے اور اس کا حاصل یہی ہے تو اُس کے ظلم کرنے کا یہ جواز بہت کمزور ہے کہ وہ برتر ہے۔

ایک بات اور تشویش طلب ہے کہ جو آدمی کم تری سے برتری کی منزل میں آجاتا ہے تو اس کے طور طریق جارحانہ کیوں ہو جاتے ہیں؟ اور جو آدمی برتری سے کم تری کے نشیب میں گر جاتا ہے، وہ ظلم سہنے کے لیے تیار کیوں ہو جاتا ہے، یہ بہت دلچسپ صورت ہے اور اس کا دلچسپ تر پہلو یہ ہے کہ آدمی کسی عذر کے بغیر بھی کسی شخص سے نالاں ہو سکتا ہے اور دشمنی پر اُتر آتا ہے۔ کچھ نہیں تو حسد کرنے لگتا ہے۔

یہ بڑے عجیب سوال ہیں۔ جب صدیوں سے کسی نے ان کا جواب نہیں دیا تو ہم جواب دینے کی فکر کیوں کریں؟ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ آدمی کا قیام غلط معاشروں ہی میں رہا ہے۔ یا تو وہ جنگلی تھا جس کے لیے بستیاں تعمیر کر دی گئیں اور جسے کھلونے دے دیے گئے۔ اس کے لیے جنگل ہی مناسب مقام تھا یا پھر وہ آدمی تھا جس کی پرورش جنگل جیسے معاشروں میں ہوئی۔ آدمی کو وہ نہیں ملا جو اسے ملنا چاہیے تھا اور یہ سب خرابی ماحول اور آدمی کی اسی عدم مطابقت کے سبب سے ہے۔ کالا رنگ کسی معاشرے میں حسن کی علامت ہے تو کسی میں بدصورتی کی۔ مغز بڑا چھوٹا ہونے سے ذہانت کے بڑے چھوٹے ہونے کا کلیہ غیر سائنسی ہے۔ پیسہ آنی جانی چیز ہے۔ ایک شخص کی طاقت دس آدمیوں کے مقابلے میں یقیناً کم ہوتی ہے۔ علم کا مطلب غنڈا گردی نہیں، چھوٹے قد سے آدمی کی فکر چھوٹی نہیں ہوتی۔ صرف یہی ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ شروع ہی میں کوئی خرابی ہو گئی کہ آدمی کو موت کا ڈر نہیں رہا۔ آدمی کو آشیانے ٹھیک نہیں ملے۔ ایسے آشیانے جہاں ایک کمزور ہو تو دوسرا اس کی بیساکھی بن جائے۔ اب تو کوئی بڑا انقلاب آئے ورنہ آدمی مرتا رہے گا، آتا رہے گا اور تیر چلاتا رہے گا، تیر کھاتا رہے گا۔

سب رنگ



اس بار آپ تک پہنچنے میں دو تین دن کی تاخیر ہو گئی۔

آخری وقت کہانیوں میں کچھ ردّ و بدل کرنا پڑا۔ دل مطمئن ہی نہیں ہوتا تھا۔ سوچا آپ کے سامنے جائیں گے تو نگاہیں کس طرح ملائیں گے؟ تاخیر کا شکوہ گوارا مگر منافقت کا الزام کیسے برداشت ہو گا؟ تو جب تک سرخ رو پہنچنے کا یقین نہیں ہوا، آپ تک آنے کی جرأت نہیں کی۔ مجھے یاد ہے، ایک بار میں نے کہا تھا کہ ژولیدہ مو، مضمحل اور منتشر آنے سے بہتر ہے نہ آیا جائے اور میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ منہ چھپا لیا جائے۔ عموماً رسالے والے ایک نکتے پر شد و مد سے اصرار کرتے ہیں کہ پرچہ ۳۰ سے پہلے بلکہ خاصا پہلے شائع کر دیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے فروخت میں معقول اضافہ ہوتا ہے۔ سب رنگ کے ایجنٹوں کو عام شکایت ہے کہ وہ دیر سے شائع ہوتا ہے۔ اس عرصے میں مطالعے کے شوقین دوسرے پرچے خرید کے لے جاتے ہیں۔ سب رنگ کے ساتھ عجیب اتفاق ہے، پانچ سال ہو رہے ہیں، عام پرچوں کے معیارِ وقت کے مطابق اکثر و بیشتر تاخیر ہی سے اس کی جلوہ نمائی ہوتی ہے مگر ۵۸ شماروں کے سب کے دیر میں آنے کے باوجود اس کی تعدادِ اشاعت میں عبرت انگیز اضافہ ہوا۔ ملک بھر میں اس نے ایک ہنگامہ برپا کیا، یہ روایت بنا، یہ ایک مثال بنا، اس نے بت توڑے، اس نے کمال کیا۔

اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ یہ سب دیر سے آنے کا کرشمہ ہے، نہ پہلے آنے کا، نہ دیر سے آنے کا میرا خیال ہے، یہ ایک مفروضہ ہے، آنے کا مناسب وقت وہی ہے جب ماتھے پر شکنیں اور چہرے پر زردی اور قدموں میں لڑکھڑاہٹ اور نگاہوں میں جھکاؤ نہ ہو اور عشق انداز و اطوار، چہرے اور چال سے جھلکتا ہو اور اشتیاقِ ملاقات ہر لفظ، ہر پہلو سے عیاں ہو۔ وہ ایک انا، عشق کی انا، وہ ایک غرور، محنت کا غرور، وہ ایک نشہ، فکر اور خیال کا نشہ اور وہ ایک انکسار، اپنی کم مائگی، حدود کا انکسار۔ اس میں شخص سر بسر چُور ہو۔ پھر کہیں بات بنتی ہے، پھر کہیں بساط جمتی ہے۔

اپنا کیا ہے؟ اپنا یہ ہے کہ لوگوں نے مینیا کا مرض تشخیص کیا ہے۔ بہت لوگ ناراض کیے ہیں، بے شمار شامیں اُداس کی ہیں۔ اپنا گھر اجنبی سمجھا ہے، طعنوں، تشنوں، رسوائیوں سے سینہ فگار ہو گیا ہے۔ ہر الزام برداشت کیا ہے لیکن ایک گالی کھانے سے اپنے آپ کو بچائے رکھا ہے کیونکہ وہ گالی برداشت نہیں ہو گی، آئینے کو ٹھیس لگ جائے گی، بدنیتی کا الزام نہیں سہا جائے گا۔ یہی سوچ سوچ کے اپنا یہ حال کیا ہے کہ رشتے ٹوٹ گئے ہیں اور صرف ایک رشتہ رہ گیا ہے، سب رنگ کا خمار ایسا چڑھا کہ کچھ اور دکھائی نہیں دیتا، وہ کرنٹ قائم رکھنے کے لیے زندگی حرام کر رکھی ہے جو سب رنگ کا طرۂ امتیاز ہے۔ ممکن ہے، بعض احباب جو رمزِ عشق سے بے بہرہ ہیں، سرسری گزر جاتے ہوں مگر یہ سب تو وہ جانتے ہیں جو پوری طرح محسوس کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ یہ انفرادیت، یہ ایک تیور شناخت کرانے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ جب مطلب کی چیزیں اکٹھی نہیں ہوتیں تو کیا عالم ہوتا ہے۔ سب رنگ نے ہر کام کا آغاز کیا ہے، دوسرے ہی مہینے یہ طرزِ عام ہو جاتی ہے تو نئے سرے سے غور کرنا پڑتا ہے۔ کہانیوں کی بات چھوڑیے، سرخیاں، اسکیچز، ٹرانسپیرنٹ، لے آؤٹ، ہر لفظ ہر سطر اور ہر صفحہ سب سے ممتاز کرنے کو جی مچلتا رہتا ہے۔

جی کے اسی مچلنے اور عمدگی و خوبی کی فکر مسلط کرنے کا مآل یہ ہے کہ سب رنگ، چاہیے وہ شام کو آئے یا سویرے آ جائے، اس سے تپاک برتا جاتا ہے۔ منتظر آنکھیں اسے تلاش کرتی رہتی ہیں۔ یہ تپاک اور یہ منتظر آنکھیں ہی مجھے خوف زدہ کیے رہتی ہیں، میں سوچتا ہوں کہ اگر میں نے انھیں کسی لمحے مایوس کیا تو کیا ہو گا، اس اندیشے کا نسخہ بھی میں نے پا لیا ہے۔ میں سامنے کیوں آؤں گا؟ میں تو کہیں روپوش ہو جاؤں گا۔ میں دنیا کی سیر کروں گا، بال بڑھاؤں گا، لڑکیوں سے دوستی کروں گا اور گنگناؤں گا میں تو خوب ناچوں گا اور میں تو خوب سوؤں گا۔ سوتا ہی رہوں گا۔



محترم بزرگ عبدالعزیز خاں سمیت بہت سے بزرگوں نے سب رنگ کی سرخیوں کے انداز پر اعتراض کیا ہے۔ ایک نوجوان آرٹسٹ جس کا نام انتظار ہے، وہ انھیں لکھتا ہے، جب وہ حرف طرح طرح گھماتا پھراتا، نچاتا ہے تو مجھے بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اردو لفظ کس کس طرح لکھے جا سکتے ہیں؟ یہ انتظار کا فن ہے، میری گزارش ہے کہ اسے لکھنے دیجیے۔ ذرا زحمت ہو گی اگر کہیں دشواری ہو تو فہرست ملاحظہ فرما لیا کیجیے اور پھر اسے دیکھیے اور لطف اٹھائیے کہ انتظار نے لفظوں سے کیا کھیل کھیلا ہے، میں اپنا دروازہ بند کرتا ہوں، اب اور لوگوں کی سیر کیجیے۔ شکیل عادل زادہ کو پیار کیجیے اور رخصت کیجیے۔

[illegible] بادشاہ

رِیاض فرشوری

دِلّی پھر سوگوار تھی۔

دلّی کا تخت پھر خالی ہو گیا تھا۔ اس تخت کا حقیقی وارث کیخسرو تھا مگر کچھ شراب کا نشہ تھا، کچھ طاقت کا زور، کچھ دلّی کے تخت پر بلاشرکتِ غیرے حکومت کرنے کی ہوس تھی کہ کیقباد نے بلبن حکومت کے حقیقی وارث کیخسرو کے قتل نامے پر دستخط کر دیے۔ دوسرے لمحے کیخسرو کا کٹا ہوا سر کیقباد کے قدموں پر پڑا تھا۔ آٹھویں صدی کے آغاز میں دلّی کے سلاطین کی تاریخ پر خون کا یہ پہلا دھبا تھا۔

کوئی تین سال بعد کیلوکھری کے محل میں مفلوج سلطان معزالدین کیقباد بسترِ مرگ پر پڑا تھا اور اپنے تین سالہ بیٹے شہزادہ شمس الدین کی تخت نشینی کی آخری رسوم سننے کا منتظر تھا۔ کہ زندگی کی شام ڈھل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف سلطانی افواج کے سپہ سالار جلال الدین خلجی کے جاں نثار سرداروں سے معنی خیز انداز میں کمسن بادشاہ کی تخت نشینی پر تبصرہ کر رہا تھا۔ ”خدا نے سلطان کی عمر دراز کرے لیکن کیا اس چھوٹے سے سر پر تاج کچھ بڑا معلوم نہیں ہو رہا ہے؟“

پھر یہ ہوا کہ اسی وقت خلجی سرداروں نے تین سالہ سلطان کو گردن سے پکڑ کے ایک تاریک کوٹھری میں پھینک دیا۔ دلّی کی فضا پھر سوگوار ہوئی لیکن جلد ہی نئے بادشاہ کی تخت نشینی کی منادی ہو گئی۔ جلال الدین خلجی بلبن کا تاج سر پہ پہنے دلی کے تخت پہ فروکش ہو چکا تھا۔ جلال الدین کی عمر اس وقت ستر سال کی تھی اور اس کی آرزو تھی کہ وہ خدا کے سامنے ایک منصف حاکم کے طور پہ حاضر ہو۔ تخت نشینی کے بعد اس نے دربار سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ”دلّی کے تخت کے محافظو! جاں نثارو! دلیرو اور بہادر سردارو! مجھے ایک دن اپنے خدا کو منہ دکھانا ہے۔ معزالدین کیقباد اب بھی میرا آقا ہے اور میں نے اس کا نمک کھایا ہے۔“ یہ اعتراف کرنے کے بعد اس نے ونگ بیچے میں اپنا خطاب جاری رکھا۔ ”لیکن یہ میرا اور میرے آقا کا ذاتی تعلق ہے۔ میں اپنا ذاتی تعلق انصاف کی راہ میں حائل نہیں ہونے دوں گا۔ معزالدین کیقباد پر اگر آپ میں سے کسی کے بیٹے یا باپ کا خون قرض ہے تو میں اس قرض سے اپنے بری الذمہ ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔“

اس اعلان کے چند ساعتوں بعد دلّی کے سابق سلطان مفلوج کیقباد کا جسم بڑے میں لپیٹ دیا گیا اور کئی آدمی برچھوں اور بلموں سے اس میں چھید کرنے کے لیے متعین کر دیے گئے۔ انھی آدمیوں نے اس کی زخمی لاش جمنا میں پھینک دی۔

خلجی خاندان کی حکومت کا یہ پہلا دن تھا۔ دلّی میں چراغاں ہو رہا تھا۔ ہر طرف داد و دہش کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ نصرت نامی حسین و جمیل کنیزِ خاص کو ملکہ جہاں کا خطاب عطا ہوا اور اس کی نازک اندام لڑکی ماہ بانو کے نام کے ساتھ شہزادی کا اضافہ کیا گیا۔ بوڑھے سلطان جلال الدین خلجی نے اپنے نوجوان بھتیجے علائی کو ماہ بانو کے لیے منتخب کیا اور اسی دن اس شادی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس طرح ایک کنیز کو ملکہ کا رتبہ دینے کے علاوہ خلجی خاندان میں باقاعدہ شمولیت کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ جلال الدین خلجی کا بھتیجا علائی ناخواندہ، اکھڑ، بدمزاج اور سرکش نوجوان تھا۔ شاید جلال الدین نے اس کے تیوروں کا اندازہ لگا کے ماہ بانو کو اس کے عقد میں دیا تھا تاکہ وہ ماہ بانو کی گرہ گیر زلف کا اسیر ہو جائے، کچھ ذمے داریاں سنبھال لے اور اپنی سرکش طبیعت پر قابو پائے۔

جلال الدین خلجی کی حکومت اصل میں ملکہ جہاں کی حکومت تھی۔ نام جلال الدین کا تھا، حکم ملکہ جہاں کا چلتا تھا۔ ملکہ جہاں کو گمان تک نہیں تھا کہ قسمت کبھی دلّی کی عظیم الشان سلطنت کی ملکہ کا تاج اس کے سر پر رکھ دے گی لیکن اس نے اپنی ماہ لقا بیٹی ماہ بانو کے لیے بڑے حسین خواب دیکھ رکھے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ کیقباد اور کیخسرو کی جنگ میں وہ بلبن کے بہادر بھتیجے چھجو خاں کو دلّی کے تخت کا اصل وارث سمجھ بیٹھی تھی چنانچہ اس نے ماہ بانو اور ملک چھجو کو ایک دوسرے سے ملنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔ ملکہ جہاں اپنی گل اندام لڑکی کو علائی کی آغوش میں دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی چنانچہ جلال الدین خلجی کے اچانک فیصلے نے اسے کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ ماہ بانو جاہل علائی کو پسند کرنا تو درکنار اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہے۔ ملکہ جہاں ملک بننے سے پہلے بھی علائی کو نفرت کی نظر سے دیکھتی تھی اور اسے جہالت اور بدمزاجی کے طعنے دیا کرتی تھی۔ اب علائی دلّی کے بادشاہ جلال الدین خلجی کا بھتیجا تھا اور ماہ بانو کو اس کے سپرد کرنے کا فیصلہ دلّی کے بادشاہ نے کیا تھا۔ فیصلے سے انکار کی مجال کس میں تھی؟ علائی سے ماہ بانو کی شادی کے باوجود ماں بیٹی نے ذہنی طور پر اسے قبول نہیں کیا تھا بلکہ اسے راستے سے ہٹانے کا عزم کر لیا تھا۔ وہ سوچتی تھیں، کیا ہوا اگر ملک چھجو خاں دلّی کا اقتدار حاصل نہیں کر سکا؟ بوڑھا جلال الدین رفتہ رفتہ قبر کی طرف بڑھ رہا ہے اور ملکہ جہاں کے بے داغ بدن، سرخ و سپید رنگت اور گداز سراپا میں اتنی کشش باقی تھی کہ وہ سلطان کے رعشہ دار ہاتھوں سے ملک چھجو خاں کی ولی عہدی کے فرمان پر دستخط کرا لے۔ وہ اسی خوش نصیب لمحے کی منتظر تھی۔

ملک چھجو خاں نے دو بار جلال الدین خلجی کے اقتدار سے بغاوت کی، دونوں


WILAYAT
AHMED /74

بار وہ گرفتار کر کے دربار میں لایا گیا لیکن ملکۂ جہاں نے سلطان بلبن کے حقِ نمک کا حوالہ دے کے دونوں مرتبہ جلال الدین سے اُسے معافی دلوادی۔ وہ ایک زیرک، باتدبیر اور دُوراندیش عورت تھی۔ بوڑھا سلطان حرم سرا کے اس کھیل سے ناواقف تھا۔ شاید علائی بھی ملکۂ جہاں کی سیاسی چالوں سے ناواقف ہی رہتا، اگر وہ کئی بار ملکۂ جہاں کی سازشوں کے سبب موت کے منہ میں نہ جا چکا ہوتا۔ ملکۂ جہاں نے حرم سرا میں جو بساط جمائی تھی، اس میں مارا جانے والا پہلا مہرہ وہی ہوتا مگر وہ ہر بار زد میں آتے آتے رہ گیا۔ علائی کو تخت و تاج یا ماہ بانو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ملکۂ جہاں کی سازشوں سے تنگ آ چکا تھا اور جتنی نفرت ملکۂ جہاں اُس سے کرتی تھی، اتنی ہی اُس کے دل میں ان دونوں ماں بیٹی کے لیے موجود تھی۔ وہ ملکۂ جہاں اور دربار کے سازشی ماحول سے اتنی دُور بھاگ جانا چاہتا تھا کہ بوڑھے بادشاہ کی مہربان نگاہیں ملکۂ جہاں کی ایما پر اس کے لیے کبھی قہر نہ بن جائیں لیکن دُور جانے کے لیے سلطان کے قریب آنا بھی ضروری تھا اور وہ جتنا سلطان کے قریب آنے کی کوشش کرتا، ملکۂ جہاں کی سازشیں نفرتیں بن پھیلائے اُس کے آڑے آجاتیں۔ ادھر دلّی کا بادشاہ جلال الدین حلم و شرافت، نرمی و لطافت کا پیکر سمجھا جانے لگا تھا۔ یہ خصوصیات بادشاہوں کو راس نہیں آتیں یا لوگ اس کے متحمل نہیں ہو پاتے۔ بادشاہ کی اس نرم خوئی اور سرد مزاجی سے اس کے تخت کی طرف اُٹھنے والی حریص نگاہوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔



رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ موسلا دھار بارش میں جمنا گھاٹ سے بارہ میل اِدھر سمری بن کے گھنے اور گنجان درختوں میں نوجوان مسافر اپنا راستہ کھو بیٹھا تھا۔ تیز بارش، گرجتے بادلوں اور دبیز اندھیروں میں نوجوان کے سفر کی سمت کہیں گم ہو گئی تھی۔ اسے آج رات ہی جمنا پار کر کے دلّی پہنچنا تھا۔ اب اُسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ مغرب کی طرف جا رہا ہے یا لکھنوتی کی طرف واپس ہو رہا ہے؟ اس نے چند ثانیوں کے لیے گھوڑا روک کے جمنا کی پُرشور لہروں کی آواز سُننی چاہی۔ اس کے اندازے کے مطابق جمنا اب پانچ چھ میل سے زیادہ دُور نہیں ہونا چاہیے تھی لیکن جنگل پر بارش اور بجلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ وہ سمت کے تعین کے لیے ایک جگہ ٹھیر گیا اور پھر کچھ سوچ کے اس نے اعتماد کے ساتھ اپنے سفید گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ایک انجانی پگڈنڈی پر گہری تاریکی اور شدید طوفان کے باوجود منزل سے بے نیاز آگے بڑھتا رہا۔ اس نے ایک لمبا فاصلہ طے کر لیا مگر ابھی راستہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ کچھ دُور آگے جا کے وہ پھر رُک گیا اور اپنے آپ سے سوال کرنے لگا۔ ”علائی! اس طرح کب تک اندھیروں میں بھٹکتے رہو گے؟“

جواب دینے والا وہاں کوئی نہیں تھا، وہ خود تھا، اُس نے خود کو جواب دیا۔ ”اُس وقت تک جب تک تختِ دہلی کی ملکۂ جہاں کے تاج اور اس کے خوبصورت چہرے کی نقاب جلا کے خاک نہ کر دوں گا اور اسے اپنے قدموں میں نہ روند دوں گا۔“

اس نے خود پر طنز کیا۔ ”تم کیا، تمھاری بساط کیا؟ تم علاؤالدین، تم محمد، تم علی گرشاسپ، تم اپنے چچا جلال الدین خلجی کے تخت کے ادنا نمک خوار۔ تم اپنی خوش دامن ملکۂ جہاں اور اس کی بیٹی شہزادی ماہ بانو کے سامنے کیا حیثیت رکھتے ہو؟ تم ایک پٹے ہوئے مہرے ہو جسے بیکار سمجھ کر دلّی سے دُور کڑے میں پھینک دیا گیا ہے۔ تمھاری عمر کیا ہے؟ بیس سال کے ناتجربہ کار نوجوان! تمھارا بوڑھا چچا جلال الدین تم پر مہربان سہی مگر وہ کب تک مہربان رہے گا۔ تمھارے حوصلے پست ہو چکے ہیں۔ تم آگرے والی بڑی سڑک سے دلّی آنے کے بجائے چوروں کی طرح ڈرتے سہمے اپنے سائے سے خوف کھاتے جمنا کی لہریں سونگھتے دلّی میں اپنے چچا سے کچھ رعایتوں کی بھیک مانگنے جا رہے ہو۔ تم ایک بدنصیب شخص ہو۔ ناخواندہ، سازشوں کے شکار، گردشوں میں مبتلا، تمھاری بیوی ماہ بانو اپنے شوہر کے بجائے چھجو خاں سے عشق کرتی ہے۔ چھجو خاں کو ملتان میں ماہ بانو کا تحفظ حاصل ہے اور تم دلّی کے تخت کے خواب دیکھ رہے ہو؟ یہ خواب تم جیسے بزدل اور حقیر نوجوان کو زیب نہیں دیتا۔“

علاؤالدین نے اپنے آپ سے نفرت محسوس کی، پھر اُسے غصہ آگیا۔ اس نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور چیخ کر کہا۔ ”ابھی تیر میرے ترکش میں ہیں اور تلوار میری نیام میں ہے۔ میں ناخواندہ سہی لیکن اپنی تلوار کے ہنر سے خوب واقف ہوں۔“ معاً اسے خیال آیا کہ وہ کس سے مخاطب ہے؟ کس کے سامنے چیخ رہا ہے؟ بے خیالی میں اُس کا ہاتھ اپنی تلوار پر پڑا تو اُسے ہوش آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ سمری بن سے باہر نکل چکا ہے اور چاروں طرف سے دلّی کی سلطنت کے نیزہ بردار حبشی غلام اُسے حصار میں لیے ہوئے ہیں اور دھواں دھار بارش میں چڑھتی ہوئی جمنا کی لہریں ایک میل لمبا پاٹ بنائے اس کے قریب شور کر رہی ہیں۔ علاؤالدین کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ کڑے سے اس کی خفیہ روانگی کی اطلاع ملکۂ جہاں کو پہنچ چکی ہو گی اور جمنا کے ساحل کے اُس جانب ملکہ کے نیزہ بردار حبشی غلام اس طوفانی رات میں نیزے تانے اس کی آمد کے منتظر ہوں گے۔ اُس نے حیرت سے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی، نیزوں کے حلقے کے باہر ملکۂ جہاں کا خاص معتمد خضر خاں غیاثی ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑا تھا۔ علاؤالدین کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کے اس نے آگے بڑھ کے ادب سے کہا۔ ”یہ غلام شہزادہ عالی مقام کے لیے علیا حضرت ملکۂ جہاں کی دعائیں لے کے حاضر ہوا ہے۔ علیا حضرت کو اس بات کا افسوس ہے کہ شہزادے نے پایۂ تخت آنے کے لیے اتنا پُرخطر راستہ اختیار کیا۔ اگر شاہی محل کو اطلاع دے دی جاتی تو کڑے کے نائب السلطنت کا شایانِ شان استقبال کیا جاتا۔“

خضر خاں غیاثی کا ہر لفظ علاؤالدین کو زہر میں ڈوبا ہوا محسوس ہوا۔ علائی کو ایسے استقبال کی توقع نہیں تھی۔ وہ تنہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ تختِ دہلی کے بہترین وارث کا خاتمہ قریب آچکا ہے۔ اب وہ حبشی غلاموں کے رحم و کرم پر ہے جو کسی بھی لمحے اس کے اعضا الگ الگ کر کے جمنا کی تند و تیز موجوں میں پھینک دیں گے مگر کڑے میں اُس کے جاں نثاروں کو صرف اتنا علم ہو سکے گا کہ وہ کسی خفیہ مہم پر گیا تھا، راستے میں کسی حادثے کی نذر ہو گیا۔ سلطان جلال الدین خلجی کو زیادہ سے زیادہ اتنا بتایا جائے گا کہ شاہی تخت سے بغاوت کی خاطر ——— علاؤالدین دکن کے ہندو رجواڑوں سے ساز باز کے لیے روانہ ہو گیا ہے۔ وقت

حکم تھا اور اسے اپنی جان بچانے کے لیے جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ نیزوں کا حصار تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں ایک یہی خوبی سب سے نمایاں تھی کہ اس کے حواس عام آدمیوں کی نسبت زیادہ تیز تھے اور وہ مشکل وقت میں حالات سے گھبراتا نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی ایسے کئی حادثوں سے گزر چکا تھا۔ اُس نے ایک باوقار بادشاہ کے انداز میں گردن اُٹھا کے خضر خاں غیاثی کو مخاطب کیا۔ "غیاثی! عُلیا حضرت ملکہ جہاں کی نوازشیں یوں بھی ہم پر بہت رہی ہیں، راستہ پُرخطر ضرور تھا لیکن ہمارے دس ہزار سپاہی پیچھے سمری بن میں کھڑے ہمارے اشارے کے منتظر ہیں۔ یہ سپاہی ہم بھیلسا کی مہم کے لیے سلطان کی خدمت میں بطورِ نذر پیش کرنے لائے ہیں۔ ان جاں نثاروں کی معیت میں دشوار گزار راستوں کے باوجود ہمارا سفر خاصا دلچسپ رہا۔ جب ہم عُلیا حضرت ملکۂ جہاں کو سلطانِ معظم کے لیے ان دس ہزار سپاہیوں کی پیش کش کے بارے میں بتائیں گے کہ اُنھیں خفیہ طور پر لانا کیوں ضروری تھا تو وہ یقیناً ہماری دانش مندی کی تعریف فرمائیں گی۔"

دس ہزار مسلح سپاہیوں کا ذکر سن کے نیزہ بردار حبشی غلاموں کے قدم اکھڑنے لگے۔ خضر خاں غیاثی نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ وہ خود کو علاؤالدین کے قدموں میں گرا دے۔ اس نے یہی کیا اور مرتعش آواز میں بولا۔ "شہزادۂ عالی مقام! رحم — غلام جاں بخشی کا طالب ہے، آپ کی رگوں میں بہادر خلجی خاندان کا خون دوڑ رہا ہے۔ غلام آپ کی پناہ چاہتا ہے۔ عُلیا حضرت ملکہ . . . . ."

"کہو غیاثی! اپنی زبان کو گنہ گار کرو۔" علاؤالدین نے شاہانہ وقار سے کہا۔

"شہزادے!" خضر خاں غیاثی گڑگڑا کے بولا۔ "غلام علیا حضرت ملکہ جہاں کے حکم سے مجبور ہو گیا تھا۔"

"غیاثی! ہمارا بھی تم سے کچھ تعلق تھا۔" علاؤالدین گرجنے لگا۔ "تم غلام ابنِ غلام۔ تمھارے لیے یہی جگہ موزوں ہے کہ تم ہمارے قدموں میں پڑے رہو۔" پھر پلٹ کر اُس نے نیزہ بردار حبشی غلاموں کو اعتماد کے ساتھ حکم دیا کہ وہ اپنے نیزے زمین پر گرا دیں اور جنگل میں چند قدم چل کے ہمارے بھائی شہزادہ الماس بیگ کو آوازیں دیں کہ حسبِ توقع علیا حضرت ملکہ جہاں نے ہمارے دس ہزار سرفروشوں کو محل میں طلب کیا ہے۔ حبشی غلاموں نے یہ حکم سنتے ہی نیزے زمین پر ڈال دیے اور سجدہ ریز ہو کے علاؤالدین کو سلامی پیش کی اور حکم بجا لانے کے لیے جنگل کی طرف دوڑ گئے۔ اُدھر غیاثی علاؤالدین کے قدموں پر پڑا لرز رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی سر اُٹھا کے حکم سننے کے لیے نوجوان علاؤالدین کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ علاؤالدین کی تلوار بے نیام ہو چکی تھی۔ اس کے ایک ہی وار نے خضر خاں غیاثی کو مزید التجا کرنے کی زحمت سے بچا لیا۔ علاؤالدین نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ حبشی غلام بھاگتے ہوئے جنگل میں غائب ہو رہے تھے۔ اس نے بائیں جانب نظر ڈالی تو مسلح حبشی غلاموں کا ایک اور دستہ تیزی سے اس کی طرف آ رہا تھا۔ علاؤالدین جست لگا کے گھوڑے پر بیٹھا اور چشم زدن میں اُس نے خود کو جمنا کی بپھری ہوئی موجوں کے حوالے کر دیا۔ سواروں کا دستہ جب موقع پر پہنچا تو اُنھیں تاریکی میں جمنا کی طوفانی لہروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ قریب ہی زمین پر خضر خاں غیاثی کے کٹے ہوئے سر کی پتھرائی ہوئی آنکھیں بجلی کے کوندے میں اپنے عبرت ناک انجام کی بے لفظ کہانی سنا رہی تھیں۔



علاؤالدین اب سے پہلے بھی کئی بار جمنا کی تیز لہروں کا مقابلہ کر چکا تھا لیکن آج جمنا میں ہر طرف بھنور بہہ رہے تھے۔ ان بھنوروں نے اس کا سفید گھوڑا بھی ہڑپ کر لیا تھا اور اب وہ اُس کے درپے تھے۔ دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ لہریں اتنی مضطرب اور بے قرار تھیں کہ علاؤالدین کبھی اس طرف ہوتا کبھی اُس طرف۔ وہ لہروں کے آگے بے دست و پا تھا اور سوچتا تھا کہ آخر ملکہ جہاں کامیاب ہو گئی۔ اس کا غرور سربلند ہی رہا۔ وہ ملکہ جہاں کے سپاہیوں کے ہاتھوں سے بچ نکل آیا تو کیا ہوا، جمنا کی بے رحم موجوں نے اُسے نگل لیا۔ ایسے وقت بھی وہ اپنی جان بچانے کی جد و جہد کے ساتھ ملکہ جہاں سے شدید نفرت محسوس کر رہا تھا اور زندگی کا آرزو مند صرف اس قدر تھا کہ ملکہ جہاں کی عیاریوں اور گستاخ ماہ بانو کی بے وفائیوں سے نمٹنے کی مہلت مل جائے۔

ملکہ جہاں نے ایک بار کہا تھا۔ اسے وہ نشتر یاد تھے، اُس بددماغ عورت نے کہا تھا کہ علاؤالدین کو اپنی موت پر کوئی رونے والا بھی میسّر نہ آ سکے گا۔ اُسے ملکہ جہاں کے الفاظ سچ ہوتے معلوم ہو رہے تھے کیونکہ وہ ڈوب رہا تھا اور نہ کوئی گواہ تھا اور نہ اس کے لیے کوئی سوگوار دست بہ دعا تھا۔ ماہ بانو نے ایک دن استعمال میں اُس سے کہا تھا۔ "اگر تم میرے برائے نام شوہر نہ ہوتے تو دلّی کے فقیروں کی تعداد میں ایک کا اضافہ اور ہو جاتا۔"

علاؤالدین کے دل و دماغ میں بھی ایک قیامت برپا تھی۔ ملکہ جہاں اور ماہ بانو کے چہروں ہی نے اسے زندہ رہنے کی ایک کوشش اور کر ڈالنے پر اُکسایا۔ اُس نے پانی کی دیواریں دونوں ہاتھوں سے توڑنی شروع کر دیں اور بپھری موجوں سے شکست قبول کرنے کے بجائے ان سے جنگ آزما ہو گیا۔ اس کے بازو شل ہو گئے۔



آنکھ کھلی تو وہ راے تھورا کے قدیم قلعے کی سیڑھیوں پر جمنا کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ جمنا کی لہریں اب بھی اس کے پیروں سے ٹکرا کے اپنی طرف کھینچنے کے لیے زور کر رہی تھیں۔ صبح کا اُجالا پھیل رہا تھا۔ علائی کو فوراً ہوش میں آنا پڑا۔ دوسری زندگی کا یہ نیا دن اُس کی موت کا دن بھی بن سکتا تھا۔ جمنا نے اُسے معاف کر دیا تھا مگر ملکہ جہاں کے جاسوس اسے معاف نہیں کریں گے۔ وہ دلّی کی ایک ایک گلی میں اُسے دیوانہ وار تلاش کر رہے ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے چچا سلطان جلال الدین خلجی کی پناہ میں پہنچے، ملکہ جہاں کے مسلح دستے اس کا سر ملکہ جہاں کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔

سلطان جلال الدین سے اس کی ملاقات صرف رات کو اُس محفلِ رقص میں ہو سکتی تھی جب وہ حرم سرا میں ملکہ کی قید سے اپنا بوڑھا جسم آزاد کرا کے اپنی محبوب کنیز مہر افروز کا تھرکتا ہوا سراپا دیکھتا تھا اور اس کی آغوش کے نشے میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جایا کرتا تھا۔ نشے کے یہی لمحے ہوتے تھے جب جلال الدین ایک بادشاہ ہوتا تھا اور ملکۂ جہاں یا دُنیا کی کوئی طاقت اسے اپنے تمام تر جلال کے ساتھ شاہی احکام صادر کرنے سے نہیں روک سکتی تھی لیکن رات ابھی دُور تھی اور دلّی

بہت قریب تھی۔ پیچھے دلی کی بستیاں سورج کی روشنی میں اُبھر رہی تھیں۔ ملکہ جہاں غیاثی کے قتل کی خبر سن کے زخمی ناگن کی طرح اُسے ڈسنے کے لیے اپنی تمام طاقتیں داؤ پر لگا چکی تھی۔ ادھر کڑے کے حاکم علاؤالدین خلجی کے تیس ہزاری منصب کا فوجی لباس اس کے جسم سے چپکا ہوا تھا اور پیشانی پر تلوار کا ایک گہرا نشان نمایاں تھا۔ یہ دونوں علامتیں دلی میں اسے جلد سے جلد شناخت کرانے کے لیے بڑی کارگر تھیں۔ دور سے دیکھ کر ہی کوئی بتا سکتا تھا کہ شہزادہ علاؤالدین، ماہ بانو کا شوہر دلی سے گزر رہا ہے۔ اس کا یہ لباس ہی ملکہ جہاں اور اس کی بیٹی کی غلامی کی سند تھا۔ صبح کے اُبھرتے اُجالے میں گیلی سیڑھیوں پر آنکھیں کھول کے اس نے اطراف میں بے بسی سے دیکھا۔ اس نے کروٹ بدلنی چاہی تو ایک ایک رگ دُکھنے لگی۔ ملتے بازو اور پیر بے حد وزنی محسوس ہوئے۔ جمنا کا وسیع پاٹ اس کے سامنے تھا۔ دریا ابل رہا تھا۔ تناور درخت چھپر اور مویشی لہروں کے دوش پر تنکوں کی طرح تیزی سے بہتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے قریب سیڑھیوں پر بہت سی چیزیں لہریں چھوڑ کے چلی گئی تھیں۔ اس نے نظر اُٹھا کے دیکھا تو سیڑھیوں پر اسے مرجھائے ہوئے پھول نظر آئے۔ یہ پھول ہندو پجاریوں نے ناراض جمنا جی کو منانے کے لیے نذر کیے تھے۔ یہ سرخ پھول نظر آئے تو علاؤالدین کو پھر بہت سی زہریلی باتیں یاد آنے لگیں۔ ان پھولوں نے بھی اُسے زخمی کیا تھا۔ دربار میں جب سلطان جلال الدین خلجی نے دلی کے تخت پر متمکن ہونے کے بعد اس کی اور ماہ بانو کی شادی کا فیصلہ سنا کے سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا اور ملکہ جہاں کی کوئی سرگوشی کوئی سازش شاہی فیصلہ نہیں بدل سکتی تھی۔ اسے ماہ بانو سے اپنی خلوت کی وہ پہلی رات یاد آئی جب وہ پھولوں سے لدی دلہن بنی حجلۂ عروسی میں بیٹھی تھی۔ وہ دولہا بنا حجلۂ عروسی میں ماہ بانو سے اُس کے نفرت انگیز رویوں کا اگلا پچھلا حساب صاف کرنے کے لیے داخل ہوا لیکن وہ پھول جو ماہ بانو کے سر اور بالوں پر بکھرے ہوئے تھے، وہ انھیں نہ سونگھ سکا۔ انھیں مسلنے کی خواہش اس کے دل ہی میں رہ گئی۔ ملکہ جہاں اور ماہ بانو دونوں برہنہ شمشیر لیے اس کی منتظر تھیں۔ ملکہ جہاں نے علاؤالدین کے اندر داخل ہوتے ہی کہا تھا "علائی دربار کا تماشا ختم ہو چکا۔ پھولوں کے یہ ہار تم شادی کی یادگار کے طور پر اپنی بارہ دری میں واپس لے جا سکتے ہو۔ ہماری بیٹی ایک جاہل شخص سے مفاہمت پر کیسے آمادہ ہو سکتی ہے۔ ہمیں اس کے لیے ذہنی طور پر خود کو تیار کرنا ہوگا۔ آج کی درباری شادی کی تمام رسوم تم ایک خواب سمجھ جاؤ، جا کے آرام سے سو جاؤ، ماہ بانو ہمارے ساتھ واپس جا رہی ہیں۔"

ملکہ جہاں کے اس غیر متوقع عمل پر اسے اظہارِ حیرت کرنے کا وقت بھی نہیں ملا۔ ماہ بانو نے اپنی ماں کے ساتھ باہر جاتے ہوئے پلٹ کر اس سے کہا "علائی! تم جیسے بیوقوف شخص کے لیے اتنا ہی اعزاز بہت ہے کہ دربار میں تم ہمارے شوہر کہلاؤ گے۔"

علاؤالدین نے یہ بے رحم جملہ اپنے ذہن سے جھٹکنے کے لیے طیش میں آ کے سر ہلایا تو پانی میں ڈوبے ہوئے بالوں پر چپکی ہوئی ریت اس کی آنکھوں میں گھس گئی۔ سورج کافی اونچا ہو چکا تھا اور رائے بھنور کے قلعے کی سیڑھیاں اسے اپنے جسم کا حصہ محسوس ہونے لگیں۔ اسے یاد آیا، ایسی ہی سیڑھیاں چڑھ کے شادی کی اگلی صبح وہ سلطان جلال الدین خلجی کی خدمت میں سلام کے لیے ایوان خاص میں داخل ہوا تھا۔ بوڑھے سلطان نے پہلی بار تخت کی تین سیڑھیاں اُتر کے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا "علائی! ہمارے بیٹے! رات ہم تمھیں شادی کا تحفہ دینا تو بھول ہی گئے۔" یہ کہتے ہوئے سلطان نے اپنی انگلی سے ایک انگوٹھی اتار کے علائی کو دیتے ہوئے اُمرائے دربار کو حکم دیا تھا "کڑے کے نئے حاکم اعلا اور ہمارے نائب السلطنت علائی کو دربار کی طرف سے سلامی پیش کی جائے۔" پورا ایوان مبارک سلامت کے شور سے گونج اُٹھا تھا۔ دربار کے اُمرا دو زانو ہو کے علاؤالدین کو سلامی دے رہے تھے۔ بوڑھا سلطان اپنے جذبات پر مشکل سے قابو پا رہا تھا۔ پھر علاؤالدین نے سلطان سے گزارش کی تھی کہ فی الحال اسے الماس بیگ، الغ خاں، ظفر خاں، ملک نصرت خاں اور سنجر الپ خاں کے ساتھ تنہا کڑے جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے تاکہ وہ کڑے کے حالات کا سکون سے جائزہ لے کے صحیح حالات خدمتِ اقدس میں پیش کر سکے۔ غلام کو سلطان کی خسروانہ نوازش سے امید ہے کہ کچھ عرصے بعد شہزادی ماہ بانو کو شاہی محافظوں کے دستے کے ہمراہ کڑے روانہ کر دیا جائے گا۔"

"علائی! تم چاہو تو شہزادی کو آج ہی اپنے ساتھ کڑے لے جا سکتے ہو۔ اس پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔" سلطان نے محبت سے کہا تھا "ہم خوش ہیں کہ تم نے ایک دانش مندانہ فیصلہ کیا ہے لیکن شہزادی کے ساتھ تمھاری والہانہ محبت انتظامی امور میں ایک دیوار ثابت ہو سکتی ہے۔ تم ہماری امیدوں پر ہمیشہ اعتبار سے پورے اُترے ہو۔ خدا تمھارا نگہبان ہے۔ اب جاؤ اور اپنے سفر کی تیاری شروع کرو۔ موجودہ حاکم کڑہ کو ہرکاروں کے ذریعے اطلاع دے دی جائے گی کہ وہ کڑے کی فصیلوں کے باہر تمھارا شان دار استقبال کرے۔"

جب علاؤالدین اس اعزاز پر سلام کر کے رخصت ہو رہا تھا تو بوڑھے سلطان نے دفعتاً اسے مخاطب کیا تھا "ہاں علائی! خیال رہے کہ ہماری ہر ہدایت کی حرف بہ حرف تعمیل کی جائے کیونکہ ان امور میں ہمارا تجربہ تم سے زیادہ ہے۔"

اُسی وقت حرم کی کنیزِ خاص اور ملکہ جہاں کی معتمد نجم السحر نے سلطان کی بارگاہ میں دو زانو ہو کے سلام عرض کیا اور سونے کی منقش تھالی میں ملکہ جہاں کا کوئی رقعہ پیش کیا۔ سلطان نے رقعہ تھالی سے اُٹھا کے اس پر ایک غلط انداز نگاہ ڈالی اور اُسے تھالی میں واپس پھینکتے ہوئے نجم السحر سے کہا "علائی کو اپنے معتمد خود مقرر کرنے کا حق حاصل ہے۔ ملکہ جہاں سے کہو کہ علائی کے ساتھ صرف وہ معتمد کڑے جائیں گے جنھیں علائی خود منتخب کرے۔"

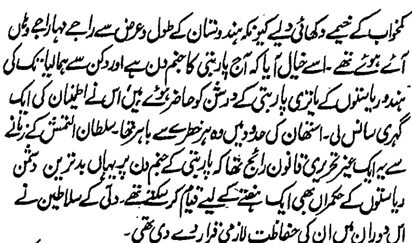
دلی میں ملکہ جہاں کا یہ اُس پر آخری وار تھا۔ روانگی سے پہلے جب ملکہ جہاں نے اسے حرم سرا میں طلب کیا تھا تو اس نے نجم السحر کے ذریعے کہلوا دیا تھا کہ "یہ فقیر ابھی اس قابل نہیں ہے کہ علیا حضرت کو اپنا ناخواندہ چہرہ دکھانے کی جرأت کر سکے۔ خدا نے اگر کسی قابل کر دیا تو سرخرو ہو کے قدم بوسی کی سعادت حاصل کر سکے گا۔" جواب سننے سے پہلے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کڑے روانہ ہو گیا تھا لیکن اس گستاخی کی سزا اُسے کڑے پہنچتے ہی مل گئی۔ سلطان کے پہلے ہی خط میں اسے ہدایت دی گئی تھی کہ ملکہ جہاں کے احکام اور دستوروں کی تعمیل تم پر اسی طرح واجب ہے جس طرح شاہی فرمانوں کی تعمیل واجب ہوتی ہے۔ اس فرمان نما خط میں بوڑھے سلطان نے یہ بھی لکھا تھا کہ ملکہ عالیہ اور ماہ بانو سے ملاقات کے بغیر رخصت ہونے پر لوگ تمھارے اس باغیانہ انداز کے متعلق چہ میگوئیاں کر رہے ہیں لیکن ہمیں تمھاری ہوش مندی سے یقین ہے کہ آیندہ تم نادانی میں کوئی ایسا قدم نہیں

اُٹھاؤ گے جو تمہارے لیے مصیبت اور ہمارے لیے ندامت کا سبب بنے۔"

اودرکڑہ اس کے لیے مشقت کی قید میں تبدیل ہو گیا تھا کہنے کو وہ وہاں کا اعلا حاکم تھا لیکن ہر اہم فیصلے کے لیے اسے ملکہ جہاں سے مشورہ لینا پڑتا تھا بوڑھا سلطان خوش تھا کہ اس کا سعادت مند بھتیجا اس کی اُمیدوں پر پورا اُتر رہا ہے۔ اس کے بھائی الماس بیگ نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ غلامی کی اس زندگی سے تو موت بہتر ہے کیوں نہ لکھنوتی کی جانب کوچ کیا جائے اور وہاں ایک آزاد علائی سلطنت کی بنیادیں استوار کی جائیں مگر علاؤالدین کی نگاہیں دلّی کے تخت پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے قلبی معاملات الماس بیگ سے زیادہ جانتا تھا۔ ماہ بانو اور ملکہ جہاں کے سر اُس کے پیروں کے نیچے ہوں بس یہی اس کی خواہش تھی لیکن تختِ دہلی تک پہنچنے کے لیے سلطان جلال الدین کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ آج کا پُرخطر طوفانی سفر اس نے اسی مقصد سے کیا تھا۔ الماس بیگ اور سنجر الپ خاں کو وہ ایک دن پہلے ہی دلّی روانہ کر چکا تھا جو شہر پناہ کے باہر لاہوری دروازے کے قریب بھیس بدلے رات سے لے جینی کے ساتھ اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ الماس بیگ اور سنجر الپ خاں کا خیال آتے ہی علاؤالدین نے اپنی تمام طاقت مجتمع کر کے ایک بار کھڑے ہونے اور ماضی کی تلخ یادوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اُس کا دماغ اب بھی چکرا رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی اپنا بھیگا ہوا لباس اُتار کر سادھوؤں کے انداز میں لنگوٹی کے طور پر باندھا۔ لنگوٹی کے اندر خنجر اُڑسا اور تیس ہزاری منصب کا امتیازی لباس جمنا کی لہروں کے حوالے کر دیا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ کچھ فاصلے پر بے شمار یاتری صبح کے اشنان کے بعد پوجا پاٹ کے لیے جمع ہو رہے تھے۔

یہ جگہ پاربتی کے استھان کے نام سے مشہور تھی۔ وہاں ایک میلا سا لگا ہوا تھا۔ اس کے لانبے گیلے بال کسی سادھو کی جٹاؤں کی طرح اس کے شانوں پر لٹک رہے تھے لیکن صبح کی سنہری دھوپ میں اس کے ننگے بدن کا سُرخ سنہرا رنگ، غلافی آنکھیں بھرا ہوا چوڑا سینہ اور چہرے پر شاہانہ وقار کسی وقت بھی اسے لوگوں کی نظروں میں مشکوک بنا سکتا تھا۔ ——— خضر خاں غیاثی کے قتل کے بعد ملکہ جہاں کی سازشی حدود میں داخل ہونے سے پہلے اس کے لیے حلیہ بدلنا ضروری تھا میلے کے ہجوم پر نظر پڑتے ہی اُس کے ذہنِ رسا نے ایک منصوبہ سوچ لیا تھا۔ وہ ویران علاقوں کی طرف جانے کے بجائے پاربتی کے استھان کی جانب بڑھتا رہا۔ مندر کا تخت اُونچا تھا اور اس کی عمارت کے نیچے سیڑھیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو جمنا کے پانیوں میں ڈوب جاتا تھا۔ دریا کی لہروں کا رُخ استھان کی سیڑھیوں پر کچھ زیادہ ہی تیز تھا جیسے ہندو عقیدے کے مطابق وہ پاربتی کے قدموں پر جمنا دان کرنے کے لیے بے قرار ہوں۔ اب وہ استھان کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے مُڑ کے دیکھا حسبِ توقع اسے شاہی غلاموں کے لباس میں بہت سے حبشی رائے پتھورا کے پُرانے قلعے کی سیڑھیوں پر چڑھتے نظر آئے۔ قسمت نے اُسے نہ صرف عین وقت پر بچا لیا تھا بلکہ اس کا یہ اندازہ بھی درست نکلا تھا کہ جمنا کے ساحل کی تلاش میں ناکامی کے بعد وہ رائے پتھورا کے اُجاڑ قلعے کی شکستہ راہ داریوں میں اس کا سراغ لگانے کی ایک آخری کوشش کریں گے۔ پھر ملکہ جہاں کو یہ مژدہ سنایا جائے گا کہ رات جمنا نے ایک باغی کو اپنی طرف کھینچ لیا جس نے ہر طرف سے نا اُمید ہو کے جمنا سے پناہ طلب کی تھی۔

علاؤالدین کی نظر پاربتی استھان کے موڑ پر پڑی تو حدِ نگاہ تک اطلس و



کمخواب کے خیمے دکھائی دیے کیونکہ ہندوستان کے طول و عرض سے راجے مہاراجے وہاں آئے ہوئے تھے۔ اسے خیال آیا کہ آج پاربتی کا جنم دن ہے اور دکن سے ہمالیہ تک کی ہندو ریاستوں کے ماتزی پاربتی کے درشن کو حاضر ہوئے ہیں، اس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ استھان کی حدود میں وہ ہر خطرے سے باہر تھا۔ سلطان التمش کے زمانے سے یہ ایک غیر تحریری قانون رائج تھا کہ پاربتی کے جنم دن پر یہاں بدترین دشمن ریاستوں کے حکمران بھی ایک ہفتے کے لیے قیام کر سکتے تھے۔ دلّی کے سلاطین نے اس دوران میں ان کی حفاظت لازمی قرار دے دی تھی۔

علاؤالدین خاموشی سے استھان کی سیڑھی پر آ گیا۔ سیڑھی بار بار پانی کے ریلے میں ڈوب جاتی تھی۔ اس پر دو چار بوڑھے سادھو آلتی پالتی مارے آنکھیں بند کیے، سورج کی طرف منہ کیے پتھر کی مورتی بنے بیٹھے تھے۔ وہ چپ چاپ ان کے قریب بیٹھ گیا۔ ماہ بانو نے شاید سچ کہا تھا۔ واقعی آج والیٔ کڑہ اور دلّی کے سلطان کا بھتیجا ایک فقیر بننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ دوسرے سادھوؤں کے ساتھ پتھر میں تبدیل ہو گیا۔ اُس میں وقت گزرنے کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ وہ یہاں نگاہ بچا کے کسی سادھو کی مالا، جٹا، مرگ چھالا اور اسی نوع کا دوسرا سامان حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ سلطان اور ملکہ جہاں کے جاسوس فریب کھا جائیں۔

رات بھر کی تھکن کے بعد سکون کا یہ لمحہ میسر آیا تھا۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ عمر بھر یونہی بیٹھا رہے۔ اب اس کے ذہن میں نہ ملکہ جہاں کا تصور تھا نہ ماہ بانو کا حسین چہرہ اور نہ تختِ دہلی کا خیال۔ وہ یوں ہی بیٹھا رہنا چاہتا تھا۔ اس یک سُوئی اور انہماک نے اُسے ایسا سکون بخشا جو محلات میں عنقا تھا۔ یہ جمنا کے ٹھنڈے پانی کا اثر تھا یا ماحول کی پراسراریت کہ وہ تھوڑی دیر میں تمام اندیشہ ہائے زندگی سے بے نیاز ہو چکا تھا لیکن اسے ایسا محسوس ہوا بہت سے لوگ اس کے اطراف کھڑے سرگوشیاں کر رہے ہیں، سکون کی دیوار دھڑام سے گر گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ عیار ملکہ کے حاشیہ بردار اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس کی ایک ذرا سی غفلت نے اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے۔ اس نے ایک آخری معرکے کے لیے اپنی آنکھیں کھول دیں کہ اچھا جو ہونا ہے ہو جائے مگر وہ یہ دیکھ کے حیرت میں پڑ گیا کہ ——— جمنا کا پانی اس کے سینے تک آ چکا تھا اور بے شمار یاتری عقیدت سے ہاتھ باندھے اس کے گرد کھڑے تھے جیسے ہی اُس کی آنکھ کھلی ہری ہر شیو شنکر مہاراج، شیو شنکر مہاراج! کا شور اُٹھا۔

علاؤالدین فوراً معاملے کی نزاکت سمجھ گیا۔ اُس نے سکرا کے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ پاربتی دیوی کے جنم دن پر شیو مہاراج دیوی کی محبت میں کسی روپ میں کسی نہ کسی جگہ ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔ علاؤالدین کے سُرخ سنہرے دمکتے جسم، غلافی آنکھوں اور شاہانہ دبدبے نے یاتریوں کو اس کی طرف متوجہ کردیا تھا، اس کے برابر جو سادھو پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے وہ جمنا کے چڑھتے ہوئے پانی سے گھبرا کے پہلے ہی بھاگ چکے تھے لیکن علاؤالدین سکون کی تلاش میں اپنی رُوح کے اندر اتنا اُتر گیا تھا کہ اسے پانی چڑھنے اور یاتریوں کے قریب آنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اس نئی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے وہ سکرا کے مستعد ہوگیا۔ ہندوستان کے تندید توہم پرست لوگوں کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ موقع گھبرانے کا نہیں فائدہ اُٹھانے کا تھا۔ ایک مرتبہ سلطان نے ہندوؤں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ہندوستان پر حکومت کرنا کون سی مشکل مہم ہے؟ یہ اوہام پرستوں کی سرزمین ہے۔ ان ناپختہ ذہن لوگوں پر آسانی سے قابو پایا جاسکتا ہے۔ اب یہی مرحلہ درپیش تھا۔ وہ اپنی غیر معمولی بصیرت سے آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کررہا تھا کہ ایک لرزتی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ ہری ہر شیو مہاراج۔ ہری ہر شیو مہاراج اسیوکوں کو درشن دیجیے، تو پاربتی دیوی کے اس بوڑھے سیوک کی آتما کی بھی چرنوں پر بھینٹ لیجیے کہ جلتے شریر کو تیری ٹھنڈک پراپت ہوجائے۔"

علاؤالدین نے آنکھ کھول کے دیکھا تو شاید پاربتی کے استھان کا بوڑھا پجاری ہاتھ باندھے اس کے سامنے لرز رہا تھا۔ علاؤالدین کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے تھے اس نے اپنے تمام شاہانہ وقار سے ایک نظر اس پر ڈالی۔ بوڑھا پجاری ایک کمزور شاخ کی طرح ٹوٹ کے اس کے سامنے گر پڑا۔ یاتری بوڑھے پجاری کی تعین دہانی پر کہ واقعی شیو مہاراج دیوی کے جنم دن پر انسانی روپ میں ظاہر ہوگئے ہیں دہشت سے اتنے فاصلے پر کھڑے ہوگئے تھے کہ دُور سے آدمیوں کے بجائے کالے دھبے نظر آرہے تھے۔ پاربتی کا پورا استھان آناً فاناً خالی ہوچکا تھا۔ علاؤالدین نے اوہام پرست بوڑھے کی لاش جمنا میں تیزی سے بہتی دیکھی۔ اسے یقین تھا کہ پجاری کی موت اس کی آنکھوں کی چمک سے واقع نہیں ہوئی بلکہ اُس عقیدت کے سبب سے ہوئی ہے جو پجاری شیوشنکر کے لیے اپنے دل میں رکھتا تھا کہ اس کی موت کے لیے اس سے بہتر وقت دوبارہ آنا ممکن نہیں تھا۔ علاؤالدین اپنی جگہ سے اُٹھ کے مندر میں جانے کے لیے پورے جاہ وجلال کے ساتھ آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرنے لگا۔

مندر کے بڑے دروازے کے قریب پہنچ کے اسے اندر سے کسی لڑکی کے گڑگڑانے کی آواز آئی۔ اس نے غور سے سُنا، لڑکی کہہ رہی تھی۔ مہان دیوی! تیری آنکھوں سے دھرتی اور آکاش کا کوئی بھید چھپا ہوا نہیں ہے۔ میری ماں کل تک بھی تیرے سامنے ننگی کھڑی ہے۔ داسی کو مہارانا کانہا کے ظلم سے بچا کے شیو مہاراج کی شرن میں دے دے۔"

"میرے پتا دیوگری کے مہاراج رام دیو، راجپوتوں کے مہارانا کانہا سے بیر لگن کررہے ہیں۔ دیوی! دکن سے دلی تک کی یاترا اس داسی نے صرف تیرے لیے اور تیرے پتی دیو شیوشنکر مہاراج کے لیے کی ہے۔ شیو مہاراج کی آگیا کے بغیر اس دھرتی پر کوئی لگن نہیں ہوسکتا۔ اے مہان دیوی! مجھے راکھشس کانہا کے اس لگن سے آزاد کردے جس کا وچن میرے پتا اُسے دے چکے ہیں۔"

علاؤالدین مندر میں داخل ہوا تو لڑکی اپنی لگن میں دیوی کے پتھر قدموں سے لپٹی اس بُری طرح رو رہی تھی کہ اسے علاؤالدین کی آہٹ سُنائی نہیں دی۔ علاؤالدین فطری طور پر ایک مہم جو نوجوان تھا اسے اپنا یہ نیا روپ اتنا پسند آیا کہ اب وہ خود بھی اس تماشے سے لُطف لینے لگا تھا اور اسے مزید جاری رکھنا چاہتا تھا۔ مندر میں کوئی اور نہیں تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا بھیگا ہوا ہاتھ لڑکی کے سر پر رکھ دیا۔ لڑکی نے گھبرا کے اُچھل کے دیکھا اور اس کے ہونٹ حیرت ومسرت سے کپکپانے لگے لیکن ساتھ ہی علاؤالدین بھی ہوش کھو بیٹھا کیونکہ اس کے سامنے ایک ماہتاب موجود تھا، جس نے اس کی نظروں چکاچوند کردی تھیں۔ لڑکی تھی کہ جوانی کا پہلا خواب تھی۔ اس کے ماتھے پر سُرخ بندی، نیلی آنکھوں کا بہا بہا کاجل سر پر ہیرے جواہر سے دمکتا چھوٹا سا مکٹ ـــ کانوں میں چمکتے آویزے چہرہ ایک گلاب، لب گلاب کی پنکھڑیاں ـــ بدن ایک مجسمہ جسے کسی فنکار نے بنا کے فن سے توبہ کرلی ہو۔

وہ علاؤالدین کو دیکھ کے مبہوت ہوگئی تھی، شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ دیوی نے اس کی پرارتھنا اتنی جلدی قبول کرلی ہے۔ شیو مہاراج کا سونے کا جسم اس کے سامنے موجود تھا۔ علاؤالدین نے آج سے پہلے بہت سی حسین لڑکیاں دیکھی تھیں۔ خود سلطان کے حرم میں خلجی سلطنت کی خوب صورت ترین لڑکیاں موجود تھیں یہ کوئی دوشیزہ نہیں ایک سچ مچ کی دیوی معلوم ہورہی تھی۔ علاؤالدین نے اشتیاق سے اُس سراسیمہ لڑکی پر ایک اُچٹتی نگاہ ڈالی اور دیوی کے مجسمے سے اس کا مقابلہ کرنے لگا۔ پاربتی دیوی کی داسیاں اس سے زیادہ حسین تھیں۔ داسی شیوشنکر کے قدموں پر اپنی جبیں رگڑ رہی تھی اور علاؤالدین کے جسم پر اس کے نازک لمس سے لرزہ طاری ہوگیا تھا۔ لڑکی کے آنسو اس کے قدموں پر گر رہے تھے۔ اِدھر مندر کے بڑے دروازے پر راجے مہاراجوں کے ٹھٹ لگ گئے تھے اور وہ ایک نظر شیو مہاراج کے درشن کے لیے بے تاب تھے۔ وہ اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی خوش طالعی کے منتظر تھے۔ مندر کے اندر داخل ہونے کی ہمت کسی میں نہیں تھی کیونکہ شنکر مہاراج پاربتی دیوی کو درشن دیتے آئے تھے۔ انھیں خلوت کی ضرورت تھی۔ علاؤالدین نے زلفیں کھینچ کے دوشیزہ کو اُٹھایا، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ علاؤالدین کو احساس ہوا اسے زیادہ وقت یہ تماشا جاری نہیں رکھنا چاہیے۔ دیوگری کے مہاراج کا نام سُن کے اس کے مستعد اور خلاق ذہن نے ایک عظیم الشان منصوبے کے خواب دیکھنے شروع کردیے تھے چنانچہ اس نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ آہستہ سے کہا۔ "دیوی! اپنے پتا راجہ دیوگری کو بتا کہ وہ تیری پوجا کرے تو اس سمے پاربتی کا دوسرا روپ ہے اور ہم نے تجھے یہ روپ دیا ہے۔"

یکایک لڑکی کے چہرے سے خوف اور سراسیمگی کی وہ کیفیت ختم ہوگئی، وہ بھاگ کے مندر کے بڑے دروازے پر پہنچی اور بلند آواز میں کہا۔ "دیوگری کے راجہ رام دیو! اِدھر آ اور شیوشنکر مہاراج کے درشن کر۔"

چند ہی لمحوں بعد علاؤالدین نے دیکھا کہ سورج بنسی راجپوتوں کی اُس نسل کا مہاراجہ جو دکن میں جا کے آباد ہوگئی ہے جواہر سے لدا پھندا بھاگتا ہوا مندر میں داخل ہوا اور دُور ہی سے شیوشنکر کو دیکھ کے قدموں پر گر گیا۔

"دیوی!" علاؤالدین نے لڑکی کو مخاطب کیا۔ "دیوگری کے مہاراجہ سے کہہ دے کہ ہم نے تجھے پاربتی کا روپ دے دیا ہے اور وہ تجھے اسی روپ میں قبول کرے جو ہم نے آج سے تجھے دیا ہے۔"

لڑکی کی گردن فخر سے تن گئی اور اُس کی دلکش آواز میں ایک جلال پیدا ہوگیا۔ اُس نے علاؤالدین کی ہدایت پر اپنے باپ دیوگری کے مہاراجہ کو مخاطب کیا۔ "رام دیو! میں پاربتی ہوں، شیو مہاراج نے جو کہا ہے، وہ تو نے سن لیا ہے۔"

رام دیو نے حیرت سے سر اُٹھا کے اپنی بیٹی کو دیکھا اور زیرِ لب کہا "چندراوتی!"

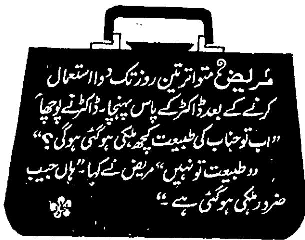
"چندراوتی نہیں، پاربتی دیوی!" علاؤالدین نے اُوپر منہ کیے کیے بلند آواز میں اس طرح کہا کہ اس کی آواز بڑے دروازے سے باہر پہنچ جائے۔ باہر کھڑے ہوئے تمام لوگ سجدے میں گر پڑے۔ رام دیو کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "دیوی! نمسکار دے، تیرے روپ ہزار ہیں، میری آنکھیں تیرا یہ روپ نہ پہچان سکیں میرے بھاگیہ کہ میری چندراوتی شیو مہاراج کی کرپا سے مہان دیوی بن گئی۔"

"رام دیو!" مندر میں علاؤالدین کی آواز پھر گونجی۔ "چندراوتی پاربتی دیوی کے روپ میں آج سے آٹھ دن تک اس استھان پر اپنے سیوکوں کو درشن دے گی، آٹھ دن بعد جب تو دیوگری واپس جائے گا تو چندراوتی تیرے پاس ہماری امانت رہے گی، جب تک ایک نوجوان ندیاں، پربت، جنگل پار کرتا اسے ہمارے نام پر تجھ سے حاصل نہ کرے، اس جوڑے کا کانہا چندراوتی کے چرنوں میں اس سمے تک ہر سویرے پھول چڑھاتا رہے گا جب تک چندراوتی دیوگری میں رہے گی۔" یہ کہہ کے علاؤالدین نے جرأت سے راج کماری چندراوتی کے گلے سے موتیوں کی مالا کھینچ لی اور چندراوتی سے بولا۔ "جو بالک تیری یہ مالا واپس کرے گا، وہی تیرا پتی دیو ہوگا۔"

"مہاراج!" چندراوتی نے روتے ہوئے کہا۔ "میں اب تیرے چرنوں سے جدا ہونا نہیں چاہتی، میں مندر میں اسی لیے چھپ گئی تھی کہ تیرے درشن کیے بنا واپس نہیں جاؤں گی۔ اب مجھے اپنے ساتھ لیتے چلو۔"

"دیوی! تو ہم سے دور کب ہے، ہم جب چاہیں گے تجھے بلالیں گے۔" علاؤالدین نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہندو دیوتاؤں کے مخصوص انداز میں ہاتھ اُٹھا لیا۔ چندراوتی اور رام دیو سجدہ ریز ہوگئے تھے۔ علاؤالدین نے سکون آمیز عجلت کے ساتھ مندر کے فرش سے مرگ چھالا، صندل کا پیالہ، صندل کی بڑی مالا اُٹھائی جو پٹ بدھ تیلو تنکر کے نمودار ہونے کا ذکر سن کے افراتفری میں چھوڑ گئے تھے۔ پھر وہ ایک ہاتھ اُٹھائے اعتماد سے باہر نکلا۔ جیسے ہی وہ دروازے پر پہنچا، پاربتی کے استھان کے تمام پنڈت، داسیاں اور یاتری سجدے میں گر گئے۔ مندر کے دائیں جانب وسیع گھاٹ پر تاحدِ نظر اُسے جھکے ہوئے سر نظر آئے۔ وہ بائیں جانب انتہائی خاموشی سے جمنا میں اُتر گیا اور تیزی سے پانی کے اندر رینگنے لگا اور جب اُس نے سانس لینے کے لیے پانی سے سر اُبھارا اور پلٹ کے دیکھا تو نیچے سے مندر کا کلس نظر آرہا تھا اور غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یاتری ابھی تک سجدہ ریز ہیں۔ ایک بار وہ پھر جمنا کی طوفانی لہروں سے جنگ آزما تھا لیکن اس بار وہ آسانی سے اُن پر قابو پا سکتا تھا۔ وہ لہروں کو شکست دیتا دریا میں دور تک تیرتا گیا اور گھاٹ کے ہجوم کی نظروں سے اوجھل ہونے میں کامیاب ہوگیا۔

درمیان میں وہ کہیں جگہ رک سکتا تھا مگر آباد علاقوں میں رکنا خطرے سے خالی



نہیں تھا۔ شہر پناہ کی فصیلیں نظر میں رکھتا ہوا وہ ایک سنسان مقام پر جا نکلا کنارے پر آکے اس نے اپنا درماندہ جسم خشکی پر ڈال دیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ زندگی نے کتنی ہی بار مشکل وقتوں میں اس سے وفا کی تھی۔ اب علاؤالدین کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ مشیت اُسے زندہ رکھنے کے حق میں ہے، ساتھ ہی اُسے یہ بھی غرہ تھا کہ وہ غیر معمولی خصوصیات کا شخص ہے۔ وہ پاربتی کے استھان پر پیش آنے والے واقعے پر اپنی ذہانت کو داد دے رہا تھا لیکن خود اعتمادی کے اس احساس کے باوجود وہ خود کو بہت کمزور محسوس کر رہا تھا۔ چندراوتی کے حسن نے اُسے کمزور کر دیا تھا۔ وہی اُس کے اعصاب پر حاوی تھی۔ اس کا چہرہ، اس کے بول، وہ اس کی ہر ادا کا اسیر ہو چکا تھا۔ چندراوتی نے دلی کے وارثِ تخت علاؤالدین کو ایک ہی نظر میں جلا دیا تھا اور علاؤالدین کی جگہ اب ایک جلتا، سلگتا آہیں بھرتا ہوا شخص خشکی پر منتشر پڑا تھا۔

پاربتی نے جادو کر دیا تھا۔ علاؤالدین سوچ رہا تھا کہ وہ پھر شیو تنکر کے روپ میں پاربتی کے استھان پہنچ جائے اور اسے لے کے ویرانوں میں نکل جائے۔ اس نے چندراوتی کی یاد بھلانے کی ہزار کوشش کی۔ اس کے باوجود وہ اس میں ایسی تحلیل ہوگئی تھی کہ علاؤالدین کو ایک سُونا پن محسوس ہونے لگا۔ وہ بوجھل قدموں سے اُٹھا۔ پاربتی کے استھان پر دوبارہ جانا ناممکن تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی الماس بیگ شہر میں اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ یہ سوچ کے اس نے اپنے جسم پر خاک ملی اور چہرے پر مٹی تھوپ لی۔ مرگ چھالا اور صندل کا پیالہ پانی میں اس سے چھن چکا تھا۔ وہ چندراوتی کا ہار، چندراوتی کی یاد دل سے لگائے صندل کے موٹے دانوں کی مالا گردن میں ڈالے آگے بڑھا تو سامنے سے اُسے سلطان جلال الدین خلجی کے محافظ دستے کا کماں دار ملک عبدالعزیز تقریباً چالیس پچاس مسلح سپاہیوں کے ہمراہ اپنی جانب آتا نظر آیا۔ وہ چپکے سے پھر پانی میں رینگ گیا اور ایک دوسرے مقام پر جا نکلا۔ یہاں سے اس نے فرار ہونے میں عجلت کی، خاک پھر اپنے جسم پر ملی اور چہرہ لتھیڑا۔ دیر تک پانی میں رہنے کی وجہ سے اس کے جسم پر جگہ جگہ سفید دھبے پڑ گئے تھے۔ اب وہ محتاط قدموں سے دیکھ بھال کے اِدھر اُدھر خطرے سونگھ کے چل رہا تھا، اس کا حلیہ بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ ملک عبدالعزیز کا محافظ دستہ بھی اگر اُسے اس حالت میں دیکھ لیتا تو دھوکا کھا جاتا مگر وہ کوئی ایسا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

جب وہ لاہوری دروازے پہنچا تو سورج اپنے عروج پر تھا۔ تھکن اور بھوک کی وجہ سے اُسے آگے چلنا دوبھر ہو رہا تھا لیکن وہاں الماس بیگ کو دیکھ کے اسے بڑی ڈھارس ہوئی۔ وہ خاموشی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ الماس بیگ کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ وہ بہت پریشان اور متردد نظر آ رہا تھا۔ آج پاربتی کا جنم دن تھا اور

الماس بیگ متعدد سادھوؤں کو صبح سے دیکھ رہا تھا۔ اپنے بھائی کو اس ہیئت کذائی میں دیکھ کے اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ بھی کوئی سادھو ہے جو بھکشا کے لیے شہر میں آیا ہے اور سستانے کے لیے بیٹھ گیا ہے۔ اس نے سادھو پر ایک سرسری نظر ڈالی اور اپنے بھائی کی آمد کی اُمید میں جمنا گھاٹ سے آنے والی سڑک پر نظریں جمادیں۔ الماس بیگ علاؤالدین کا چھوٹا بھائی ہی نہیں، دوست بھی تھا کیونکہ اس کی عمر علاؤالدین سے صرف ڈیڑھ سال کم تھی۔ یکایک سادھو نے الماس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ "بالک! تجھے جس منش کی چنتا ہے اُسے سمری بن میں رات ایک شیر اُٹھا کے لے گیا ہے۔"

یہ سُننا تھا کہ الماس بیگ نے ہر احتیاط بالائے طاق رکھ کے اپنی تلوار نیام سے نکال لی اور غصّے سے گرج کے کہا۔ "اپنے الفاظ واپس لے ورنہ ابھی تیرا ناپاک سر تیری تڑپتی ہوئی لاش کے قریب پڑا ہوگا۔"

"دھیرج بالک دھیرج!" علاؤالدین نے بدلی ہوئی آواز میں الماس بیگ کو تسلی دی۔ "تلوار تو اس شریر کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے پر گیا شیر اب نہیں آنے کا۔"

"یہ جھوٹ ہے" الماس بیگ نے چیخ کر کہا۔ "تو مجھے اُن شاہی جاسوسوں میں سے کوئی جاسوس معلوم ہوتا ہے جو صبح سے شہر میں یہ افواہ اُڑا رہے ہیں کہ علاؤالدین جمنا میں مر گیا یا اُسے شیر اُٹھا کے لے گیا۔"

دفعتہً علاؤالدین کے چہرے پر اس کی جانی پہچانی مسکراہٹ عود کر آئی اُس نے سرگوشی میں کہا۔ "الماس بیگ! ہم نے تم سے احتیاط برتنے کا وعدہ لیا تھا اور تم ایک ہی جملے پر اپنے ہوش کھو بیٹھے۔ تم نے ہمیں پہچانا بھی نہیں، اپنے بھائی کو نہیں پہچانا؟"

الماس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ چند لمحے بُت بنا سادھو کو دیکھتا رہا، پھر فرطِ محبّت سے لپٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ علاؤالدین نے محبت سے اس کی پُشت سہلائی اور کہنے لگا۔ "الماس بیگ! ہمارا حُلیہ ہی ایسا ہے کہ ہم خود اپنے آپ پر شُبہ کر رہے ہیں مگر یقین کرو، یہ ہم ہی ہیں، تمھارے بھائی ـــــ اگر تم عورتوں کی طرح رونے بیٹھ گئے تو ہم اتنا طویل سفر کیسے طے کریں گے؟ مجھے بتاؤ کہ سنجر الپ خاں کہاں ہے اور محل کے کیا حالات ہیں؟"

الماس بیگ نے بمشکل اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ "سنجر الپ خاں! سلطان کی کنیزِ خاص کے ذریعے منٹ منٹ کی خبریں پہنچا رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ آپ کی تلاش میں جمنا کی طرف گیا ہے۔ اُسے مہر افروز سے معلوم ہوا ہے کہ ملکہ جہاں نے سلطان کو یہ باور کرایا ہے کہ آپ اطلاع دیے بغیر کڑے سے سلطان کے قتل کے ارادے سے روانہ ہوگئے ہیں اور آپ نے خود کو چھپانے کے لیے سمری بن کا راستہ اختیار کیا تھا لیکن جیسے ہی ملکہ جہاں کو اس سازش کا علم ہوا، اس نے ملک عبدالعزیز اور خضر خاں عیاشی کے دستے سمری بن میں اس طرح پھیلا دیے کہ وہ آپ کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکیں۔ اتّفاق سے راستے میں طوفان نے آلیا اور اسی دوران میں ایک شیر کی گرج سُنی گئی۔ گمان ہے کہ شیر آپ پر حملہ آور ہوگیا۔ ملکہ جہاں نے سلطان کو یقین دلا دیا ہے کہ وہ آپ کو شاہی دربار میں زندہ پیش کرنا چاہتی تھی، ملک عبدالعزیز اور غیاثی کو تاکید کر دی گئی تھی کہ علائی کو پورے احترام کے ساتھ شاہی محل تک لایا جائے مگر علائی کو بچانے کی کوشش میں خود غیاثی خاں اپنی جان سے گیا۔"

"خوب الماس بیگ!" علاؤالدین نے زہر خند سے کہا۔ "تم نے خاصی دلچسپ معلومات جمع کر رکھی ہیں۔ اُمید ہے کہ خدا ہمیں ملکہ جہاں سے نمٹنے کے لیے ایک موقع ضرور دے گا۔ ہماری زندگی کا مقصد صرف ملکہ جہاں کی سرکوبی ہے اور کچھ نہیں مگر..." یہ کہتے کہتے وہ رُک گیا۔ شاید اسے چندراوتی کا خیال آگیا تھا جو اب اُس کی نظر میں دلّی کے تخت سے زیادہ اہم ہوگئی تھی۔ اس کے اچانک خاموش ہونے اور گم ہو جانے پر الماس بیگ نے ادب سے پوچھا۔

"آقا! آپ کچھ کہتے کہتے رُک کیوں گئے؟ آپ کیا سوچنے لگے؟"

"کچھ نہیں الماس بیگ!" علاؤالدین نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "ہمیں کچھ یاد آ گیا۔ ہمیں یاد آ گیا کہ ابھی تو ہمارے سفر کا آغاز ہوا ہے۔ ہمیں بہت دُور دُور جانا ہے۔" پھر وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ "تم بتاؤ۔ کیا سلطان نے ہماری موت کے بارے میں ملک عبدالعزیز کو شہادت کے لیے طلب کیا؟"

"نہیں۔" الماس بیگ نے جواب دیا۔ "مہر افروز کی اطلاع ہے کہ جب سلطان نے ملک عبدالعزیز کے لیے حاضری کا حکم دیا تو ملکہ جہاں نے یہ عذر پیش کر دیا کہ صدمے نے اس کے اوسان معطل کر دیے ہیں۔ آج شام کسی وقت اسے دربار میں حاضر کر دیا جائے گا۔"

"آخر اس کی وجہ؟" علاؤالدین نے اُلجھتے ہوئے پوچھا۔ "ملک عبدالعزیز کو سلطان کی خدمت میں پیش نہ کرنے میں ملکہ جہاں کی کیا مصلحت ہوسکتی ہے؟"

"آقا!" الماس بیگ حیرت سے بولا۔ "آپ جیسا ذہین آدمی آج کیسی باتیں کر رہا ہے؟ یقیناً آپ اپنے اندر موجود نہیں ہیں، شاید سفر نے آپ کو بہت تھکا دیا ہے۔ ملکہ جہاں کو ابھی یہ یقین کس طرح ہوسکتا ہے کہ آپ جمنا میں ڈوب چکے ہیں۔ سُنا ہے، جمنا کے ساحل پر ملکہ جہاں نے پچاس پچاس کوس تک ماہی گیروں کو تلاش کے لیے روانہ کر دیا ہے اور ملک عبدالعزیز کو حکم دیا گیا ہے، خدانخواستہ آپ کی لاش چاہے وہ کتنی ہی مسخ حالت میں کیوں نہ ہو، اس کے سامنے پیش کرے اور آپ جانتے ہیں ملکہ جہاں کے حکم کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔"

علاؤالدین نے اپنے بھائی کو ہنس کے دیکھا۔ "یہی وجہ ہے کہ وہ بے چارہ اب تھک ہار کے دوبارہ رائے پتھورا کے پُرانے قلعے کی طرف مجھے تلاش کرنے گیا ہے کہ اگر میں زندہ رہا ہوں گا تو جمنا سے نزدیک تر چھپنے کی جگہ ـــــ رائے پتھورا کا شکستہ قلعہ ہی ہوسکتا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ یہاں کچھ دیر بیٹھ کے آرام کروں گا، تمھارے اور سنجر الپ خاں کے ساتھ کہیں مل کے کھانا کھاؤں گا لیکن اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ غریب ملک عبدالعزیز کی مصیبت ختم کی جائے۔ اسے شام تک ہمیں ملکہ جہاں کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ ہمیں اسے مایوس نہیں کرنا چاہیے۔ وہ حسب الحکم ہمیں لے کے دربار میں حاضر ہوگا۔"

"آقا! میری سمجھ میں آپ کا مقصد نہیں آیا۔" الماس بیگ تذبذب سے بولا۔

"سب کچھ سمجھ جاؤ گے الماس بیگ!" علاؤالدین نے تیزی سے کہا۔ "تمھارا گھوڑا کہاں ہے؟"

الماس بیگ نے ہچکچاہٹ سے اشارہ کیا یہ وہ ۔ سامنے"

سامنے ایک درخت کے تنے سے الماس بیگ اور سنجر الپ خاں کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ علاؤالدین کی نظر جیسے ہی گھوڑوں پر پڑی اس نے الماس سے پوچھا۔ "تمہارا سامان تجارت کہاں ہے؟"

الماس بیگ نے اپنی قبا سے ایک تھیلی نکال کے زمین پر الٹ دی کڑے کے خزانے سے لائے ہوئے بہترین ہیرے جواہر خاک پر بکھر گئے۔ علاؤالدین نے جواہر دوبارہ تھیلی میں بند کرتے ہوئے کہا "یہ سامان تجارت ابھی حفاظت سے رکھو اس مال کے بدلے ہم سلطان سے کچھ اچھا سودا کرلیں گے۔ ہم ملکہ جہاں کی رنجشوں کے باوجود اپنے لیے چند رعایتیں حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔"

"آقا! آپ مجھے حکم دیجیے۔ میں ملکہ جہاں کا قصہ ہمیشہ کے لیے تمام کر دیتا ہوں چاہے اس کے لیے میری جان چلی جائے۔"

علاؤالدین نے اپنے بھائی کو سینے سے لگا لیا۔ "نہیں الماس! جانِ برادر! ہم اس طرح اپنے معاملات نمٹنے سے گریز کرتے ہیں۔ ہم رائے پتھورا کے قلعے کی طرف ملک عبدالعزیز کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ سنجر الپ خاں کے آنے کے بعد تم دونوں مجھ سے قلعے ہی میں آ کر ملو۔"

"لیکن آقا!" الماس نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ "ملک عبدالعزیز شاہی محافظ دستے کا کماں دار ہے۔ اس کے ساتھ بہت سے مسلح سوار ہیں گستاخی معاف ہے لیکن میں آپ کو تنہا نہیں جانے دوں گا۔"

الماس کا آخری جملہ علاؤالدین نے اس وقت سنا جب وہ سنجر الپ خاں کے گھوڑے پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے پرانے قلعے کی طرف گھوڑا موڑتے ہوئے مسکرا کے بھائی سے کہا۔ "الماس بیگ! ہم دوبارہ ضرور ملیں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آگے یہ راستہ بند ہے مگر ہم اپنا راستہ بناتے ہوئے قلعے تک جائیں گے۔" علاؤالدین نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دیکھتے دیکھتے اس کی نظروں سے غائب ہو گیا۔

گھوڑے پر سادھو کے حلیے میں بیٹھے وہ عجیب و غریب شخص نظر آ رہا تھا۔ اس لیے وہ نہایت تیزی سے عام گزرگاہوں سے گزرنے کے بجائے الٹے راستوں سے رائے پتھورا کے قلعے کے قریب پہنچ گیا اور دور سے ملک عبدالعزیز اور اس کے سپاہیوں کی موجودگی کا اندازہ کرنے لگا۔ اس کے سپاہی درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ علاؤالدین کو اپنے نہ ملنے پر اس وقت ملک عبدالعزیز کی وحشت کا خوب اندازہ تھا۔ اسے اس حد تک یقین تھا کہ ملک عبدالعزیز اپنے سپاہیوں کو حکم دینے کے باوجود خود اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہو گا۔ وہ صبح کا کھانا بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ نہیں کھائے گا کیونکہ اسے کسی کل چین نہیں ہو گا۔

اگر وہ علاؤالدین کو دستیاب کر سکا تو یہ اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔۔۔

علاؤالدین نے اپنا گھوڑا لوٹا لیا اور قلعے کے عقبی حصے کی طرف آیا۔ وہاں اس نے گھوڑا ایک درخت سے باندھ دیا اور بہت خاموشی سے قلعے کے اندر داخل ہو گیا وہ اپنے خنجر پر گرفت مضبوط کیے دیواروں، ستونوں کی آڑ لیتا ہوا ملک عبدالعزیز کی بو سونگھنے لگا۔ وہ کئی جگہ دیر دیر تک ملک عبدالعزیز یا اس کے ساتھیوں کے جوتوں کی آواز سننے کے لیے ٹھہرا رہا اور جگہ بدلتا رہا۔۔۔ اور اس کی پیش بینی بالکل درست ثابت ہوئی، اپنی اس پیش بینی کی خوبی پر اسے ناز تھا۔ ملک عبدالعزیز تنہا سنسان ویران اندھیری راہداریوں میں اسے تلاش کر رہا تھا اگر ملک عبدالعزیز اس وقت تنہا نہ ہوتا تو علاؤالدین کیا فیصلہ کرتا؟ علاؤالدین کوئی بھی اعلا فیصلہ کر سکتا تھا کیونکہ وہ اس کی بے پناہ قدرت رکھتا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ دور ہی سے خنجر کا نشانہ لیتا اور ملک عبدالعزیز کا کام تمام کر دیتا اور جب تک سپاہی اسے نرغے میں لیتے، وہ کوئی اور فیصلہ کر لیتا۔ اسے معلوم تھا کہ سپاہی الجھنوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کماں دار مارا جاتا ہے تو ان کے حوصلے پست ہو جاتے اور پھر ان کے سامنے علاؤالدین جیسا جری با اثر ذہین اور فاتحانہ صلاحیتوں کا شخص ہوتا تو وہ بھیڑوں کی طرح ایک سمت چل دیتے مگر اس فشار کی نوبت نہیں آئی۔ ملک عبدالعزیز اس کی توقع کے عین مطابق اندھیری راہداریوں میں اسے تلاش کر رہا تھا علاؤالدین اسے دور سے دیکھتے ہی پھرتی سے اپنی جگہ سے پیچھے کی طرف واپس آیا اور اسی راہداری میں کچھ دور ہو کے دم سادھے بیٹھ گیا جہاں سے ملک عبدالعزیز آ رہا تھا تھوڑی دیر میں شاہی محافظ دستے کا کماں دار اس کے قریب پہنچ گیا۔



ملک عبدالعزیز نے دیکھا کہ ایک گندا سا سادھو اندھیری راہداری کے آخری ستون سے پیٹھ لگائے سستا رہا ہے۔ اسے حیرت ہوئی ہو گی کہ ابھی وہ یہاں سے گزرا تھا تو کوئی موجود نہیں تھا۔ اس بات کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا کہ ملک عبدالعزیز علاؤالدین کو یاد بتی کے استھان سے آیا ہوا کوئی سادھو سمجھ کے آگے بڑھ جاتا لیکن سادھو کے ہاتھ میں چمکتے دمکتے موتیوں کی مالا دیکھ کے اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ سلطان اور ملکہ جہاں کو دیوانگی کی حد تک جواہر جمع کرنے کا شوق تھا سلطان اور ملکہ کی اس کمزوری سے ملک عبدالعزیز پوری طرح واقف تھا۔ ممکن ہے اس نے سوچا ہو کہ آب دار موتیوں کی یہ مالا ہی شاید اس کی جان بچانے کا ذریعہ بن جائے سادھو علاؤالدین ملک عبدالعزیز کی آمد سے بے خبر اپنی مالا کے چمک دار موتی اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بچہ اپنے کھلونے سے کھیل رہا ہو۔ ملک عبدالعزیز کو سادھو کی بے وقوفی اور سادگی پر ہنسی آ گئی۔ وہ سادھو کے بالکل پیچھے آ کھڑا ہوا اور اس نے کمال ہوشیاری اور خاموشی سے اپنا خنجر نکالا۔ وہ ننگا خنجر ہاتھ میں لیے سادھو پر اچانک وار کرنے ہی والا تھا کہ علاؤالدین نے اس کی توقعات کے برعکس اپنی جگہ بدل لی اور اچانک پلٹ کے اتنی تیزی سے اس کے منہ پر مکا مارا کہ عبدالعزیز کے کئی دانت وہیں ٹوٹ کر گر پڑے اور منہ سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ دوسرے مکے پر وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور چکرا کر زمین پر گر پڑا۔ علاؤالدین نے خنجر اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے نہایت سکون سے پوچھا۔ "ہاں ملک عبدالعزیز! ذرا ہمیں بھی تو بتاؤ کہ سمری بن کے جنگل میں ہمارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟"

ملک عبدالعزیز کے خون اگلتے منہ سے چند لفظ ہی نکل سکے۔ "شہزادۂ معظم آپ!"

"ہاں ملک عبدالعزیز۔ ہم علاؤالدین خلجی والئی کڑہ سلطان جلال الدین خلجی کے بعد اس کے تخت کے امیدوار تمہارے سامنے ہیں جس کی موت کا جشن تمہاری ملکہ جہاں آج دھوم دھام سے منا رہی ہے ہم نے سوچا، تمہاری مشکل آسان کر دیں، خود ہی

تمھارے پاس چلے آئیں۔" تعجب ہے کہ عُلیا حضرت ملکہ جہاں نے غیاثی کے قتل پر کوئی توجہ نہیں دی یا گراں کی فہم میں یہ بات نہ آئی تھی (تا) ایک نمک حلال ملازم کی حیثیت سے تمھارا فرض تھا کہ انھیں بتاتے کہ علائی کی رگوں میں کنیزوں اور غلاموں کا خون نہیں دوڑ رہا ہے، اس کا تعلق خلجی خاندان سے ہے۔ خیر چھوڑو یہ باتیں اس ہار کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟" علاؤالدین نے انتہائی نرم لہجے میں مدہوش باختہ ملک عبدالعزیز کے سامنے چندراوتی کا ہار لہراتے ہوئے کہا۔ "ان موتیوں کے تین دانے تمھیں خلجی دربار کے بڑے اُمرا کی صف میں بٹھا سکتے ہیں" علاؤالدین کو بہت افسوس ہوا کہ ملک عبدالعزیز اس کی باتوں کا جواب دینے کے بجائے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس نے اس کی زندہ لاش انتہائی احتیاط سے اُٹھائی تاکہ کہیں جھٹکے سے اس کی سانس کی ڈوری نہ ٹوٹ جائے۔ اسے اپنے بھائی الماس بیگ اور دوست سنجر الپ خاں کی ذہانت سے اُمید تھی کہ وہ محافظ دستے کے سپاہیوں کو دیکھ کر عقبی دروازے ہی کی طرف سے آئیں گے لیکن وہ دیر تک اس جگہ ٹھہرنے کی حماقت نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے عقبی دروازے کے قریب ملک عبدالعزیز کا بھاری جثہ ایک طرف ڈال دیا اور تھوڑی دیر الماس بیگ اور سنجر الپ خاں کا انتظار کیا۔ ان کے آنے میں دیر لگی تو وہ ملک عبدالعزیز کو دوبارہ کاندھوں پر لادے عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔ چند ہی لمحوں بعد الماس بیگ اور سنجر الپ خاں وہاں پہنچ گئے۔ علاؤالدین نے بے ہوش ملک عبدالعزیز کو الماس بیگ کے گھوڑے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔ "جلدی کرو۔ اسے شام تک کسی نہ کسی طرح ٹھیک کرکے جہاں افروز کی ڈیوڑھی تک لے آؤ۔ ہم ملکہ جہاں اور سلطان کے ساتھ آج شام حرم کے پائیں باغ میں گزارنا چاہتے ہیں۔"



آج کی شام حرم سرا کے پائیں باغ میں ایک سوگوار شام تھی۔ حالانکہ پائیں باغ کا منظر جنت کا نمونہ تھا۔ سبزہ زار پھولوں سے مہک رہا تھا اور رنگ برنگے پانیوں کے فوارے رواں تھے مگر عُلیا حضرت ملکہ جہاں اور ماہ بانو سَر جھکائے مغموم بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے بوڑھا سلطان جلال الدین بے چینی سے ایک روش پر ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے اچانک رُک کر اس نے انتہائی سرد مہری سے ملکہ جہاں کو مخاطب کیا۔ "کہاں ہے؟ تمھارا وہ عینی شاہد کہاں ہے؟ ہم اس کے منتظر ہیں۔ اُسے جلد سے جلد ہمارے سامنے حاضر کرو، وہ غم کی کسی بھی کیفیت میں کیوں نہ ہو اسے ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔"

"عالم پناہ!" ملکہ جہاں نے غم میں ڈوبی آواز میں کہا۔ "چند لمحے گزر رہے ہیں، بس وہ آیا ہی چاہتا ہے۔ آج کے بعد میں اُس منحوس شخص کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کروں گی جو خود زندہ رہا اور علائی سے بے خبر رہا۔"

"بس بس۔" جلال الدین نے جنونی انداز میں کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ معتبر ذرائع کے مطابق علائی ہمیں قتل کرنے آ رہا ہے۔ وہ معتبر ذرائع کیا ہیں؟"

"ظلِ الٰہی!" ملکہ جہاں نے سلطان کے قریب آ کے خجالت سے جواب دیا۔ "اس کنیز کو جو اطلاع ملی تھی، وہ سلطان کے گوش گزار کر دی۔ علائی ابھی نوجوان ہے، نادانی میں وہ کوئی بھی قدم اُٹھا سکتا ہے، جن لوگوں کے سامنے کرنے میں علائی نے یہ سازش کی تھی، وہ کل دوپہر تک دربار میں پیش کر دیے جائیں گے۔ میں اپنی آنکھیں کھلی رکھتی ہوں کیونکہ یہ تخت ہی میری عزت، میرا وقار ہے۔"

ملکہ جہاں سلطان کو متذبذب دیکھ کے کچھ اور کہنے والی تھی کہ ملکہ کی خاص کنیز نجم السحر نے خوف سے کانپتے ہوئے سلطان کے سامنے دو زانو ہو کر عرض کیا۔ "سلطانِ عالم! شہزادہ علاؤالدین اور شہزادہ الماس بیگ اذنِ باریابی چاہتے ہیں۔"

"کیا؟" سلطان جلال الدین کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ "نجم السحر! کیا تم نے واقعی علائی کو دیکھا ہے؟" وہ اپنی بے چینی چھپا نہ سکا۔

"سلطانِ عالم!" نجم السحر خوف سے سرتاپا لرز رہی تھی۔ "اس کنیز نے نہ صرف دونوں شہزادوں کو دیکھا ہے بلکہ وہ اپنے ساتھ ملک عبدالعزیز کو بھی لائے ہیں اور ــــ اور" ملکہ جہاں کا غصے سے دہکتا ہوا چہرہ دیکھ کے نجم السحر کی آواز حلق ہی میں گھٹ کے رہ گئی۔

بوڑھے سلطان نے یہ کشمکش محسوس کر لی اور سَر ہلاتے ہوئے مسکرا کے کہا۔ "اجازت ہے۔ شہزادوں کے ساتھ ملک عبدالعزیز کو بھی پیش کیا جائے۔"

نجم السحر اُلٹے پیروں تیزی سے سلام کرتی ہوئی واپس ہو گئی۔ ماہ بانو اور ملکہ جہاں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ بوڑھا سلطان اب آہستہ آہستہ روش پر ٹہلتے ہوئے خود سے زیرِلب کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر اچانک وہ ٹھہر گیا اور ملکہ جہاں سے کہنے لگا۔ "ملکہ جہاں! یہ خاصی بڑی خوش خبری ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم نے اور ماہ بانو نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا ہے۔"

"عالم پناہ!" ملکہ جہاں نے نحیف آواز میں جواب دیا۔ "بخدا کنیز نے اتنی بڑی خوش خبری سننے کے بعد بہ مشکل خود پر قابو پایا ہے، اگر سلطانی جلال مانع نہ ہوتا تو شاید اب تک فرطِ مسرت سے بے ہوش ہو چکی ہوتی۔"

پھر اس نے ماہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ماہ بانو تو کل سے اداس بیٹھی تھی اس خبر پر اُسے بھی یقین نہیں آ رہا ہے، ہم دونوں اپنے علائی کو دیکھنے کے لیے مضطرب ہیں۔"

"ملکہ جہاں نے جو فرمایا ہے، وہ درست ہے" ماہ بانو نے مُردہ آواز میں کہا۔ "اور عالم پناہ ــــ کنیز سوچ رہی ہے کہ اُس کی عقل پر پتھر کیسے پڑ گئے؟ اب کوئی شبہ نہیں رہا کہ کنیز کو جو اطلاع ملی تھی، وہ سراسر بہتان تھا۔ کنیز شرم سار ہے۔"

"تمھیں معلوم ہے ملکہ جہاں، ہمیں سکون پسند ہے، اس لیے ہم معاف کر دیتے ہیں، ہمارے کاندھوں پر ایک وسیع سلطنت کا بوجھ ہے۔ سلطنت کے معاملات ہی کچھ کم گراں نہیں ہیں۔ اس پر یہ غلط الزامات، یہ غلط اطلاعیں مستزاد ہیں" سلطان ناراضی کے لہجے میں بولا۔

"آہ عالم پناہ!" ملکہ جہاں نے کرب سے کہا۔ "کیا کنیز امورِ سلطنت میں شریک نہیں ہے؟ کیا سلطانِ عالم کا ہاتھ بٹانے میں اس نے کبھی کوئی کوتاہی کی ہے؟ کیا کنیز کو سازشوں سے باخبر نہیں رہنا چاہیے؟ یہ سب کچھ کنیز اعلیٰ حضرت ہی کے لیے تو کرتی ہے، ہر چند کہ حرم سرا میں خاصی دلچسپیاں ہیں۔" ملکہ کا لہجہ اجنبی تھا۔ بادشاہ اُس سے متاثر معلوم ہو رہا تھا۔

"بے شک ملکہ جہاں!" جلال الدین نے مفاہمت کے لہجے میں کہا۔ "ہم تمھاری خداداد صلاحیتوں کے دل سے معترف ہیں۔ تم نے ہمارے ساتھ امورِ سلطنت میں غیر معمولی تعاون کیا ہے۔ تمھیں یقیناً سازشیوں پر نظر رکھنی چاہیے مگر ہمیں شکوہ ہے

کہ جو کچھ ہمیں بتایا گیا، اس کی تصدیق نہیں کی گئی۔" سلطان نے اپنی روایتی نرمی سے کہا۔

"ظلِ سبحانی سے زیادہ اور کون یہ حقیقت بہتر سمجھ سکتا ہے کہ دربار کے چند لوگ شہزادہ علائی سے خائف رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ رہے سہے کنیز کو جو اطلاعات ملیں اُن میں بھی سازشی عناصر کا ہاتھ ہو؟"

"بہرحال ــــ ملک عبدالعزیز بھی اُن کے ساتھ ہے۔ اب ہمیں بہت سی باتوں کا علم اِسی وقت ہو جائے گا۔" جلال الدین نے بے چینی سے کہا اور ملکہ جہاں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہم اِس وقت تنہائی چاہتے ہیں۔"

سلطان کی زبانی خلوت کی خواہش کا اظہار ہوتے ہی ماہ بانو تیزی سے حرم سرا کی طرف روانہ ہو گئی لیکن ملکہ جہاں اُسی باوقار انداز میں اپنی جگہ بیٹھی رہی اور اُس نے رُک رُک کر واضح الفاظ میں سلطان کو جواب دیا۔ "عالم پناہ! کنیز کی یہ مجال نہیں کہ سلطانی حکم سے سرتابی کرے تاہم ماہ بانو سے شادی کے بعد شہزادہ علائی پر کنیز کا بھی حق ہے اور وہ اس کے دشمنوں کے بارے میں کچھ جاننے کے لیے مضطرب ہے۔ کنیز ملک عبدالعزیز کا اعتراف جرم اپنے سامنے سننے کی خواہش مند ہے۔"

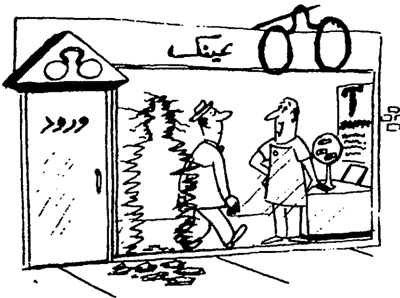
شاید سلطان جلال الدین کوئی جواب دیتا، انکار کر دیتا یا اقرار کر لیتا مگر سامنے سے شہزادہ علاؤالدین پورے کر و فر کے ساتھ شہزادگی کے لباس میں باوقار انداز سے نمودار ہوا۔ اس کے عقب میں شہزادہ الماس بیگ ملک عبدالعزیز کو سہارا دے کے لا رہا تھا۔ ملک عبدالعزیز کے چہرے پر درد و کرب، خوف و دہشت کے اثرات نمایاں تھے۔ اس سے اپنا نڈھال چہرہ سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ شاہی رعب تھا کہ دل پر ہیبت بیٹھی ہوئی تھی۔ سلطان سے کچھ فاصلے پر رُک کے الماس بیگ نے دو زانو ہو کر تعظیم دی اور مؤدب وہیں کھڑا ہو گیا لیکن علاؤالدین نے سجدہ ریز ہو کے پہلے سلطان کو پھر ملکہ کو سلام پیش کیا۔

جلال الدین نے وارفتگی سے بھتیجے کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھایا، بے تابانہ گلے لگایا اور شدتِ جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ "علائی! ہم تمھیں اپنے سامنے دیکھ کے ربّ العزت کا شکر ادا کر رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ تمھیں کچھ ہو جاتا یا پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی تو آج کی رات دربار کی کئی اہم شخصیتوں پر گراں ہوتی۔ نہ جانے ہم کیا حکم صادر کر دیتے؟ ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ــــ خدا کا شکر ہے کہ تم آ گئے۔"

سلطان نے بے اختیار اپنے گلے سے جواہر کا ایک ہار اُتارا اور پشت کی طرف کھڑے ہوئے غلام کی طرف پھینک دیا اور حکم دیا۔ "علائی کی زندگی کا یہ صدقہ ابھی محتاجوں میں تقسیم کر دیا جائے۔"

"اور ہماری جانب سے مزینوں کا ایک طشت ابھی خیرات کر دیا جائے۔" ملکہ جہاں نے علائی کے قریب آ کے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہم تو بالکل نااُمید ہو چکے تھے۔"

ملک عبدالعزیز کی ایک کراہ نے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی۔ وہ شاہی آداب کا خیال نہیں رکھ سکا تھا کیونکہ اس کے دانتوں میں شدید ٹیسیں اُٹھتی تھیں۔ جیسے ہی ملکہ جہاں کی نظر اس پر پڑی، اس نے اپنے مرصّع زہر آلود خنجر کا دستہ ہاتھ میں لیا اور اسے ملک عبدالعزیز کے دل میں پیوست کرنے میں کوئی دیر نہیں



کی ملکہ جہاں کا نشانہ سچا تھا، عبدالعزیز ایک لمحے میں سبزے پر گر گیا اور ہری گھاس لال ہونے لگی "یہی ہے وہ۔" ملکہ جہاں پورے جلال سے بولی "یہی وہ بدبخت ہے جس نے ہماری ماہ بانو کا سہاگ لوٹنے اور ہمیں آزار پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا رکھی تھی، یہی وہ غدار تھا۔ ہم اسے اب مزید زندہ نہیں دیکھنا چاہتے۔"

الماس بیگ اور جلال الدین خلجی استعجاب کی نظروں سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ البتہ علائی کے چہرے پر ایک دل فریب مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے سلطان سے عرض کیا۔ "عکیا حضرت ملکہ جہاں نے جو کچھ کیا۔ اس نمک حرام کی سزا اس سے کہیں زیادہ ہونی چاہیے تھی۔"

"لیکن ــــ لیکن علائی!" بادشاہ نے تلخی سے کہا۔ "ہم اس کی زبان سے سُننا چاہتے تھے کہ اس سازش میں اور کون کون بدبخت شریک تھا۔ ہم جاننا چاہتے تھے کہ تمھارے دشمن کہاں کہاں ہیں؟ نصرت بانو نے بہت عجلت کی۔ ہمیں کچھ راز جاننے سے تشنہ رکھا اور اہم ترین رازوں کی زبان ایک ذرا سی جذباتیت میں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دی۔ اب ہم اس سازش کے پس منظر سے کیسے واقف ہو سکیں گے؟"

ملکہ جہاں علائی کے پہلو میں کھڑی تھی۔ اس نے علائی کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "سلطانِ عالم! کنیز سے یہ غدار شخص دیکھا نہیں گیا اور کنیز کے لیے یہی بہت غنیمت ہے کہ اس کا علائی زندہ ہے، ماہ بانو کا سہاگ قائم ہے۔"

"مگر ــــ مگر ــــ" سلطان کی تلخی میں کمی نہیں آئی تھی۔ "مگر ہم اب بھی اندھیرے میں ہیں۔" سلطان نے نفرت سے ملک عبدالعزیز کی لاش دیکھی جو زہر میں بجھے ہوئے خنجر نے نیلی کر دی تھی۔

"جہاں پناہ!" علاؤالدین نے جرأت کے ساتھ کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ "غلام نے اسے رائے پتھورا کے محل سے گرفتار کیا، اس کی ایک انگلی توڑ دی۔ ایک ایک کر کے اس کے ناخن نوچے اور آخر اُس نے لفظ بہ لفظ سازش کی پوری کہانی اپنی زبان سے بیان کر دی۔ غلام نے اسے ظلِ سبحانی کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے الماس بیگ اور سنجر الپ خاں کے ذریعے ایک ایک بات کی تصدیق کرا لی تھی۔ ملا مل خضر خاں غیاثی نامی شخص شیر کا شکار نہیں بلکہ اس سازش کا شکار ہوا تھا۔" اور یہ کہتے ہوئے اس نے ملکہ جہاں کی طرف دیکھا۔ اس کے سرخ چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔

"خوب ــــ کیا خوب!" سلطان نے بشاشت سے کہا۔ "ہم تمھارے اندر

شادی ایک ایسی کتاب ہے جس کا پہلا باب شاعری اور باقی سارے باب نثر ہوتے ہیں۔ وہ بھی شکستہ خط میں۔

ایک ذہین اور بہادر شخص کی تمام خوبیاں نظر آتی ہیں اور یہ بات ہمارے لیے بڑی سکون افزا اور راحتِ جاں ہے۔ ہم اس سازش میں شریک ہر بدطینت شخص کی مکمل تفصیل سننا پسند کریں گے۔"

علاؤالدین نے ادب سے سر جھکا لیا۔ "بسر و چشم عالی جاہ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے زہرخند سے ملکہ جہاں کی طرف نظر کی۔ "عُلیا حضرت ملکہ جہاں کی اجازت سے ۔۔۔" اس نے دیکھا کہ ملکہ جہاں نے اپنی آنکھیں بند کرلی ہیں ۔۔۔ اس نے اپنے بیان میں کچھ توقف کیا اور ملکہ جہاں کی کیفیت سے لطف لینے لگا۔

جلال الدین کا اضطراب بڑھ گیا تھا۔ "تم ٹھیر کیوں گئے علائی؟" سلطان نے ناگواری سے کہا۔ "ہم ہمہ تن گوش ہیں۔"

"عالم پناہ!" علاؤالدین نے گھبرا کر کہا۔ "اس سازش میں بھیلسے کا راجہ پال سین ملوث ہے۔ اس نے غیاثی اور ملک عبدالعزیز دونوں نابکاروں کو میرے قتل پر اس لیے مامور کیا تھا کہ اس کے شاہی خزانے کے چند نادرِ روزگار ہیرے سلطانی تاج پر سجنے کے قابل ہیں لیکن بھی ہندوستان کے ہندو راجاؤں نے دلّی کی مسند پر ایک مسلمان بادشاہ کو دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ عالی جاہ! غلام نے کڑے میں پال سین کے اشتعال انگیز رویّے اور اس کے خزانے کا حال سن کے عہد کیا تھا کہ جب تک اس حاسد اور نفرت انگیز شخص پال سین کو شکست نہیں دے دوں گا اور جب تک اس کے تمام خزانے اپنے محترم المقام سلطان کے قدموں میں لا کے نہ ڈال دوں گا، اُس وقت تک زمین پر سوؤں گا لیکن غلام کے منصوبے کی اطلاع پال سین کو کسی طرح مل گئی؟ اس نے اپنے خزانے منتقل کرنے شروع کردیے۔ اس سے پہلے کہ پال سین اپنی کوشش میں کامیاب ہوجاتا، غلام دلّی میں اپنی آمد کی اطلاع صیغۂ راز میں رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے پیچیدہ راستہ منتخب کیا گیا۔ دلّی آنے کا مقصد یہ تھا کہ غلام بھیلسا پر یلغار کرنے کے لیے اپنے آقا سے اجازت لے لے۔ سب سے پہلے غیاثی نے سمری بن میں غلام کو اپنے آقا سے جدا کرنے کی کوشش کی، پھر عبدالعزیز نے جمنا میں دھکا دے دیا اور عُلیا حضرت ملکہ جہاں کو آ کے یہ خبر سنادی کہ غلام کو یا تو جنگل میں شیر لے گیا ہے یا وہ جمنا کے طوفان کے نرغے میں آچکا ہے۔" ملکہ جہاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے علائی کا بیان سُن رہی تھی اور غالباً اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ علاؤالدین نے اس کی حالت سے محظوظ ہونے کے لیے چند لمحے توقف کیا پھر اپنا بیان جاری رکھا۔ "عالم پناہ! یہ ہے وہ روداد ۔۔۔ اب غلام کو نذرانہ پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔"

"اجازت ہے۔" زر و جواہر لوٹنے حریص سلطان کی کمزوری تھے۔ وہ سب کچھ بھول کے کڑے کے تحائف دیکھنے کے لیے بے قرار ہونے لگا۔ علاؤالدین نے اپنی عبا سے مخمل کا ایک رُمال نکالا اور اسے پھیلا کے سلطان کے سامنے پیش کردیا۔ رُمال پر ایسے بیش بہا لعل و جواہر جگ مگ کررہے تھے کہ سلطان کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک ناقابلِ بیان چمک پیدا ہوگئی۔ اس نے جلدی سے ہیروں کا مخملی رُمال اپنے ہاتھ میں لے لیا اور علاؤالدین کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "علائی! تم بھیلسے کی مہم پر کب روانہ ہونا چاہتے ہو؟"

"عالم پناہ! میں آج رات ہی یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں تاکہ پال سین پر اچانک ٹوٹ پڑوں۔"

"تمھیں چند دن یہاں ضرور ٹھیرنا چاہیے کم ازکم ماہ بانو کے لیے۔" سلطان نے شفقت سے کہا۔

"عالم پناہ کے ارشاد کی تعمیل غلام کا ایمان ہے۔ خود غلام کی بھی یہی خواہش تھی مگر مخبروں کی اطلاع کے مطابق غلام کو فی الفور اپنی مہم پر روانہ ہوجانا چاہیے۔" علاؤالدین نے نیازمندی سے کہا۔

"تمھیں اجازت ہے۔ شاہی لشکر سے جتنے سوار چاہو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو لیکن روانہ ہونے سے پہلے ہم یہ ضرور جاننا چاہیں گے کہ ملک عبدالعزیز اور غیاثی کے علاوہ ہمارے دربار میں اور کتنے غدار موجود ہیں۔"

"جہاں پناہ۔ جب تک غلام کے سر پر سلطانِ معظم اور عُلیا حضرت ملکہ جہاں کا سایہ موجود ہے اور خدائے ذوالجلال کی تائید حاصل ہے، غلام کو کوئی خوف نہیں ہے۔" علاؤالدین کا لہجہ گمبھیر ہوتا گیا اور اس نے اپنی باتوں کا ردِعمل جاننے کے لیے ملکہ جہاں کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"ایسی بھی کیا عجلت درپیش ہے۔ ابھی آئے ہو، ابھی پابہ رکاب ہو۔" ملکہ جہاں کے لہجے میں اعتماد آگیا تھا۔ پھر اس نے نجم السحر کو اشارہ کیا اور آہستہ سے اس سے کچھ کہا اور علاؤالدین سے مخاطب ہوئی۔ "بخدا ابھی تو ہم نے پوری طرح تمھیں دیکھا بھی نہیں ہے۔ ہم نے نجم السحر کو حکم دیا ہے کہ وہ جلد سے جلد شربت لائے تاکہ دو گھڑی تمھارے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملے۔ ہمیں تمھارے طویل سفر کی تکان کا اندازہ ہے۔"

سلطان نے بھی ملکہ جہاں کی تائید کی اور سونے سے مرصّع کرسی نما تخت پر بیٹھ گیا۔ وہ بار بار رُمال کھول کے لعل و جواہر کی ایک جھلک دیکھ لیتا۔ علاؤالدین سوچ رہا تھا، اگر وہ چندراوتی کی مالا بھی ان لعل و جواہر میں شامل کردیتا تو سلطان کی حیرت کا کیا عالم ہوتا۔ اُدھر سے ملکہ جہاں کے چہرے پر سُرخی دوڑنے لگی اور علاؤالدین کی نظر میں یہ ایک افسوس ناک بات تھی گویا ملکہ جہاں ابھی تک اپنی ریشہ دوانیوں سے باز آنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

سلطان اپنے دونوں بھتیجوں کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرچکا تھا اور عبدالعزیز کی لاش محل کی فصیل سے پھینکنے کا حکم جاری کردیا گیا تھا۔ پھر سلطان نے علاؤالدین سے بھیلسا جانے والی فوج کی تعداد اور دوسرے جنگی امور کے بارے میں مشورہ کیا۔ علاؤالدین اپنے مجوّزہ حملے کے ہر پہلو سے سلطان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہا اور سلطان اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ اس نے سلطان کو بتایا کہ کڑے میں سات ہزار جوان تیار بیٹھے ہیں اور اس چھوٹی سی مہم کے لیے دارالسلطنت سے کوئی فوج لے جانے کی ضرورت نہیں ہے، پھر یہ خبر جلد ہی عام ہوجائے گی اور وہ اپنا منصوبہ اُس وقت تک خفیہ رکھنا چاہتا ہے جب تک پال سین کے قلعے کی فصیلوں کے نزدیک نہ پہنچ جائے۔ سلطان اس کی فراست، جنگی صلاحیت

اور تدبر کی تعریف کرنے لگا۔

اس دوران میں نجم السحر سونے کے تشت میں لاجورد کے چھوٹے چھوٹے پیالوں میں مشروب لے آئی تھی۔ اس نے حسب دستور سب سے پہلے ہر پیالے سے تھوڑا تھوڑا مشروب چکھا۔ سلطان نے رسماً ایک غلط انداز نگاہ سے نجم السحر کو مشروب چکھتے دیکھا پھر ان جواہر کی دید میں مصروف ہو گیا جو کڑے سے اس کا بھتیجا لایا تھا۔ علاؤالدین کو احساس تھا کہ وہ حرم سرا کے پائیں باغ میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس جگہ کے ہر پتے، ہر ذرے پر گویا ملکہ جہاں کا حکم چلتا ہے چنانچہ وہ بہت محتاط اور چوکنا بیٹھا ہوا تھا۔ نجم السحر نے سب سے پہلے سلطان کو مشروب پیش کیا۔ پھر ملکہ جہاں کو، پھر علاؤالدین کو۔ اُس وقت نجم السحر کے ہاتھوں میں سونے کا طشت لرز رہا تھا۔ لاجورد کا پیالہ علاؤالدین کے ہاتھ میں تھا سلطان کا مزاج بہت خوش گوار ہو چکا تھا۔ البتہ ملکہ جہاں اُس وقت کچھ گھبرائی ہوئی اور سراسیمہ نظر آتی تھی۔ نجم السحر نے آخری پیالہ الماس بیگ کو پیش کر دیا۔ اچانک علاؤالدین کھڑا ہو گیا اور سلطان کے سامنے سر جھکا کر ادب سے بولا۔ "عالم پناہ! آج خدا نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ غلام کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنی زندگی کے صدقے کے طور پر سلطانی مشروب نجم السحر کو پیش کرے۔"

یہ الفاظ سنتے ہی ملکہ جہاں کا پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ سلطان نے تعجب سے ملکہ جہاں کی طرف دیکھا۔ "کنیز معافی کی طالب ہے" ملکہ جہاں نے لجاجت سے کہا۔ "لیکن شاہی عنایات صرف شاہی خاندان کے افراد تک محدود رہنی چاہئیں۔ علاؤالدین کی زندگی کے صدقے کا یہ مناسب طریقہ نہیں ہے۔"

"لیکن علائی کی خواہش یہی ہے۔" جلال الدین نے بے پروائی سے کہا۔ "نجم السحر! شہزادے کی خواہش کا احترام کیا جائے۔"

نجم السحر کسی جھجک کے بغیر آگے بڑھی اور دو زانو ہو کے شاہی تحفے کی تعظیم بجا لائی۔ اس کا حسین چہرہ ہر قسم کے جذبوں سے عاری ہو چکا تھا۔ وہ علاؤالدین کے ہاتھ سے پیالے کے ایک ہی بار میں سارا مشروب پی گئی لیکن دوسرے ہی لمحے پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور نجم السحر کا زہر سے نیلا بدن علاؤالدین کے قدموں میں تیورا کر گر چکا تھا۔

ملکہ جہاں کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بیٹھے بیٹھے وہ مر گئی ہے اور اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی ہیں۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور ڈرامائی انداز میں ہوا کہ سلطان خود مبہوت ہو کے یہ منظر دیکھتا رہ گیا۔ علاؤالدین کی آواز نے اس کی محویت توڑی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "جہاں پناہ! غلام کو اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ سفر طویل ہے اور وقت گزر رہا ہے۔"

لیکن الماس بیگ جلال الدین کی موجودگی کے باوجود تلوار نیام سے نکال چکا تھا۔ اس نے برہمی سے سلطان سے کہا۔ "سلطانِ معظم! آقا پر اس دربار میں متعدد حملے ہو چکے ہیں۔ ہم کب تک خاموش رہیں گے؟"

ملکہ مضمحل انداز میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے نفرت سے نجم السحر کی لاش پر ٹھوکر ماری۔ "اب محل میں کسی کی زندگی محفوظ نہیں۔ سازشی اس محل کے اندر موجود ہیں۔ خدا گواہ ہے ہم اسے برداشت نہیں کریں گے۔ ہم اس واقعے کی پوری تحقیق کرائیں گے اور ایک ایک سازشی کو ایسی عبرت ناک سزا۔۔۔"

لیکن علاؤالدین نے ملکہ جہاں کا کلام قطع کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "غلام نادان الماس بیگ کی طرف سے معافی کا خواستگار ہے علیا حضرت! یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔ ملکۂ ذی شان کے اطمینان کے لیے میں اتنا اور عرض کر دوں کہ ملک عبدالعزیز نے غلام کو کچھ اور نام بھی بتائے تھے ہو سکتا ہے نجم السحر بھی خریدی جا چکی ہو۔ غلام جلد سے جلد سلطانِ معظم کی خدمت میں ان تمام بدبختوں کے نام پیش کرے گا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ان کا سرغنہ شاہی محل یا حرم سرا میں نہیں بلکہ کڑے میں موجود ہے۔ میں فوراً کڑے جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کے اُس نے سلطان کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا، رسمی تعظیم دی اور الماس بیگ کے ساتھ پائیں باغ سے نکل گیا۔ بادشاہ پر ابھی تک عالم حیرت طاری تھا۔ علاؤالدین نے پائیں باغ سے نکلتے ہوئے سلطان کا صرف ایک جملہ سنا تھا۔ وہ ملکہ جہاں سے اپنے تمام تر جلال اور دبدبے سے مخاطب تھا۔ کہہ رہا تھا۔ "نصرت بانو! ہماری بوڑھی مگر تجربہ کار آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ہمارے حلم و شرافت سے کم ظرفوں نے غلط فائدے اُٹھائے ہیں۔ اب اگر علائی کی زندگی پر کوئی آنچ آئی تو ہم عفو و درگزر، رحم اور نرمی کا رویّہ ترک کر دیں گے۔ ہمارے عتاب کی کوئی حد نہ ہو گی۔ ہم ماں کا گوشت بیٹی کو اور بیٹی کا گوشت ماں کو کھلانے کی بھی طاقت رکھتے ہیں۔ خدا گواہ ہے ہم۔۔۔۔"



الماس بیگ اور سنجر الپ خاں کا خیال تھا کہ علاؤالدین نے ایک فاش غلطی کی ہے اُسے سلطان کی آنکھوں سے پردے ہٹا دینے چاہئیں تھے۔ اِس سے نادر موقع دوبارہ آنا مشکل ہے۔ علاؤالدین دیر تک ان کے پُرخلوص مشورے تحمل سے سنتا رہا اور جب وہ سب کچھ کہہ چکے تو ایک انگڑائی لے کے بولا۔ "سمجھنے کی کوشش کرو کہ ہم نے یہ موقع کیوں کھو دیا؟ ہم ماہ بانو اور ملکہ جہاں کو اتنی آسانی سے مرنے نہیں دیں گے کہ صرف ان کا سر ان کے بدن سے علیحدہ کر دیا جائے۔ ملکہ جہاں سے ہمارا طویل جھگڑا ہے اتنی جلدی کیسے ختم کر دیا جائے؟ ہم ناخواندہ ہونے کے باوجود زندہ ہیں۔ ہم کیا ہیں؟ یہ بتانے کے لیے ہمیں اُسے زندگی مستعار دینی ہو گی۔ ویسے ملکہ جہاں ان تلخ تجربوں کے بعد اب شاید ہمارے آئندہ منصوبوں کے درمیان حائل ہونے کی کوشش نہیں کرے گی۔ کچھ دنوں تک ہم اپنے قدم آزاد ماحول میں جما سکتے ہیں اور اپنی پشت مضبوط کر سکتے ہیں۔"

الماس بیگ اور سنجر الپ خاں علاؤالدین کی دلیلوں سے متاثر نہیں معلوم ہوتے تھے مگر یہ علاؤالدین کا صرف سیاسی تنازعہ ہی نہیں ملکہ جہاں اور ماہ بانو سے اُس کے بعض قلبی اختلافات بھی تھے جو الماس بیگ اور سنجر الپ خاں کو اتنی شدت سے محسوس نہیں ہو سکتے تھے جتنے علاؤالدین کو کرب و اذیت میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔

علاؤالدین اپنے آخری منصوبے کی تکمیل تک ملکہ جہاں کی دسترس سے زیادہ سے زیادہ دور رہنا چاہتا تھا۔ وہ دلّی کے تخت کے حصول کے لیے جلال الدین کے آخری لمحے تک انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک ایک قدم اپنے منصوبے کے مطابق اُٹھا رہا تھا۔ اگر وہ ملکہ جہاں کو درمیان سے ہٹا دیتا تو سلطان اُس کی موت کے بعد علاؤالدین سے زیادہ محتاط ہو جاتا۔ وہ اور سلطان آمنے سامنے ہوتے۔ یہ اچھی بات نہیں ہوتی۔ سلطان کے تذبذب کی کیفیت ختم ہو جاتی اور بعد کو کسی مرحلے پر اُسے ملکہ جہاں کے اندیشے یاد آتے

تو وہ علاؤالدین کے بارے میں کوئی بھی انتہا پسندانہ فیصلہ کر سکتا تھا۔ علاؤالدین متعدد بار سلطان کو یہ باور کرا چکا تھا کہ ملکہ جہاں اُسے ناپسند کرتی ہے اس کے وجود سے اُسے نفرت ہے چنانچہ جب ملکہ جہاں سلطان کو علاؤالدین کے بارے میں ورغلانے کی سعی کرتی تو سلطان کوئی خاص توجہ نہیں دیتا تھا کیونکہ اسے ملکہ جہاں اور علاؤالدین کے درمیان تکدّر اور ناچاقی کا علم تھا۔ وہ ملکہ جہاں کی طرف سے منتقل کی جانے والی کسی بھی اطلاع پر مشکوک رہتا تھا۔



علاؤالدین جوش اور ولولے سے بھیلسہ کی طرف بڑھا۔ وہاں اس نے اپنے سپاہیوں کو اکٹھا کیا اور میدانِ عمل میں اُتر آیا۔ اس کی فوجیں دندناتی ہوئی بھیلسا کے نزدیک آگئیں، پھر طبلِ جنگ بجا۔ آندھی اور طوفان کی طرح اس نے بھیلسے پر یلغار کی اور میدانِ جنگ میں لاشوں کا انبار لگاتا ہوا بھیلسے کے خزانے تک پہنچ گیا۔ راجہ پال سین کے خزانے کے ہیرے، جواہرات اور سونے چاندی پر قبضہ کر کے اس نے سلطان کی خدمت میں روانہ کر دیئے۔ انعام کے طور پر اودھ کی حاکمیت بھی اُسے دے دی گئی۔ بھیلسے کی شاندار فتح کے بعد دلّی کے دربار میں علاؤالدین کا نام احترام سے لیا جانے لگا تھا۔ حالانکہ پہلے اس کے ذکر کو خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ بھیلسہ کے بعد علاؤالدین نے ارد گرد کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ختم کر کے اپنی فتوحات آگے بڑھائیں۔ دلّی سے آنے کے بعد وہ مسلسل سرگرمِ عمل رہا اور اس کا زیادہ وقت منزلیں طے کرتے ہوئے گزرا۔ علاؤالدین ہر لمحے اپنی تاریخی عظمت سے قریب ہو رہا تھا۔ اس کے وفادار دوست اور بھائی ہر معاملے میں اس کے مشیر تھے پے در پے کامیابیوں سے علاؤالدین کے ہاں برتری کا احساس جاگزیں ہو گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے غیبی طاقتوں کی حمایت حاصل ہے اور اس کا دماغ عام آدمی سے بڑھا ہے۔ وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے علاوہ بعض ماورائی خصوصیات کا بھی حامل ہے۔

اپنی تمام ذہنی اور جسمانی آسودگیوں اور سرشاریوں کے باوجود علاؤالدین ایک ناآسودہ شخص تھا۔ لُٹا پٹا سا کوئی شخص۔ شاید ہی کوئی دن کوئی رات کوئی شام ایسی گزرتی ہو جب اسے چندراوتی نہ یاد آتی ہو۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے چندراوتی اس کے دل و دماغ میں پیوست ہوتی جاتی تھی۔ وہ اس کے حسن کی تعریف میں فارسی اشعار گنگناتا اور بردۂ تنہائی میں لیٹا اس کے بارے میں سوچتا رہتا۔ الماس نے کئی بار اپنے بھائی کی یہ کیفیت دیکھی کہ وہ بیٹھے بیٹھے گم ہو جایا کرتا ہے اشعار گنگنانے لگتا ہے، راتوں کو جاگتا ہے، رقص و سرود کی محفلوں میں بھی کم دلچسپی لیتا ہے بس اُس کا کام آگے کوچ کا حکم دینا اور علاقے فتح کرنا رہ گیا ہے یا پھر سوچتے رہنا۔ الماس بیگ کو کیا معلوم تھا کہ اس کا بھائی ایک پیاسا، ایک شکست خوردہ ایک زخمی شخص ہے وہ ایک نادیدہ آگ میں گھرا ہوا ہے۔

رفتہ رفتہ چندراوتی کا ہیولا کچھ اس طرح اُس پر مسلط ہوا کہ کڑے اور اودھ کی حکمرانی سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں رہی وہ دیوگری جا کے چندراوتی سے ملنا چاہتا تھا لیکن دیوگری جانا آسان کام نہیں تھا۔ دیوگری ایک مشہور ریاست تھی گو اس کے پاس خاصی بڑی تعداد میں فوج تھی اور زر و جواہر سے معمور خزانے تھے اسے سلطان کا اعتماد حاصل تھا لیکن دلّی سے سات آٹھ سو میل دُور دکن میں دیوگری پر حملہ آور ہونے کی اجازت علاؤالدین کو سلطان کیسے دے دیتا؟ علاؤالدین نے اسی لیے سلطان کو دیوگری پر چڑھائی کرنے کے ارادے کے ضمن میں کچھ نہیں لکھا اور خود ہی منصوبے بناتا رہا۔



پھر اُس نے ایک دن سلطان کو چندیری کا احوال کچھ ایسے مؤثر پیرائے میں لکھ کے بھیجا کہ اُسے چندیری پر حملہ کرنے کی اجازت مل گئی۔ وہ اگر دیوگری کے بارے میں لکھتا تو سلطان اجازت دینے میں تامّل کرتا اور ملکہ جہاں کا یہ خیال بھی سلطان کو حزن لگا سکتا تھا کہ شاہی فوجوں کی مدد سے علاؤالدین دکن میں اپنی آزاد ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ جیسے ہی اُسے چندیری فتح کرنے کی اجازت ملی اُس نے ظفر خاں، الغ خاں، الماس بیگ اور سنجر الپ خاں اپنے چاروں سرفروشوں اور سات ہزار سواروں کو کوچ کا حکم دیا لیکن ان کے گھوڑوں کا رُخ چندیری کی طرف نہیں تھا۔ وہ دکن میں دیوگری کی طرف اُونچے پہاڑ، تیز رَو دریا اور گھنے جنگل عبور کرتے ہوئے بڑھنے لگے تھے۔ علاؤالدین کو ہوش نہیں تھا کہ وہ سلطان جلال الدین خلجی کو اپنی اس سرکشی کا کیا جواب دے گا؟ اس کی نظروں میں بس چندراوتی اس کی منزل تھی، چندراوتی! جس کے حسن کا شہرہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی پاربتی جو اپنے شیوشنکر کا انتظار کر رہی ہو گی۔ چندراوتی کی مالا علاؤالدین کے گلے میں تھی جو اُسے تلقین کرتی رہتی تھی کہ جلدی کرو، آگے بڑھو اور چندراوتی کو اپنی باہوں میں لے لو۔

راستے میں کسی ریاست کے فوجی دستے نے مزاحم ہونا چاہا تو علاؤالدین کو اُنھیں خاموش کرنے کے لیے مجبوراً اپنے حوصلہ مند سپاہیوں کو اشارہ کرنا پڑا ورنہ عام طور پر وہ یہی کہتا ہوا گزر رہا کہ دلّی کے سلطان جلال الدین خلجی کا ایک اہم پیغام لے کے دیوگری جا رہا ہے اور ظاہر ہے سات ہزار افراد کی معمولی فوج سے دیوگری جیسی ریاست فتح نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ راستوں میں مختصر پڑاؤ ڈالتے اور تازہ دم ہو کے دیوانہ وار اپنی منزل قریب کرتے رہے۔ تا ایں کہ دوسرے مہینے کی آخری تاریخوں میں وندھیاچل کی پہاڑیوں سے اُتر کے دریائے تاپتی کے کنارے تک آ پہنچے۔ یہاں انھوں نے ڈیرا ڈال دیا۔ دس بارہ میل دُور دیوگری کا دیو ہیکل قلعہ اونچی پہاڑی پر واقع تھا۔ نیچے پہاڑی کے دامن میں دُور دُور تک ایک بستی پھیلی ہوئی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ انھوں نے اپنے خیمے زمین میں نصب کر لیے تھے۔ دریائے تاپتی کے کنارے ان کے گھوڑے سستا رہے تھے۔ علاؤالدین نے کسی تاخیر کے بغیر اپنے جاسوسوں کو بستی میں سرایت ہو جانے کا حکم دیا تاکہ وہ جنگی اہمیت کی ضروری معلومات فراہم کریں۔ اس کا سبز مخملی خیمہ دریا کے کنارے بے شمار خیموں کے ساتھ علیحدہ نظر آ رہا تھا۔ یہ نظارہ بہت دلکش تھا۔ وہ تنہا دریائے تاپتی کے کنارے چہل قدمی کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ چاند کی ٹھنڈی کرنیں تاپتی کے نرم دھاروں میں کانپ رہی تھیں۔ سنہرے پانی میں چاند کی یہ لرزشیں اُسے بڑی بھلی لگیں، وہ اُس منظر کے حسن میں ڈوب کے رہ گیا۔ فضا میں ایک سوندھی سوندھی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ بو چندراوتی کے جسم سے پھوٹ رہی ہو۔ ساری عمر اُس نے ایک سپاہی کی زندگی بسر کی تھی اور صبح و شام اپنی زندگی کے سب سے

محل ناک معرکے سے نبرد آزما ہونے والا تھا لیکن اس وقت وہ ہر طرف سے بے نیاز ہو کے ناپتی کا سنہرا پانی دیکھ رہا تھا، یکایک اس نے اپنا لباس اُتارنا شروع کر دیا۔ صرف چندرا وتی کی مالا اس کی گردن میں رہ گئی۔ وہ پانی میں اُتر گیا اور دیر تک وہیں ڈوبا رہا۔ شاید اس طرح وہ اپنے اعصاب کو سکون پہنچانا چاہتا تھا کہ بارہ میل کے فاصلے پر چندرا وتی کا گھر تھا۔ اس فاصلے نے اسے اور بے حال کر رکھا تھا۔ اب اسے چند ساعتوں کی تاخیر بھی گوارا نہیں تھی۔ چندرا وتی اپنے شیو شنکر کو اچانک دیکھے گی تو کیا کہے گی؟ علاؤالدین پر خوب صورت خیالوں کی یورش تھی۔ اسے یہ کسک بہت مرغوب لگی کہ اس کسک میں ایک میٹھاس تھی، یادوں کی ان چٹکیوں میں مزہ آتا تھا۔ اس درد میں ایک لذت موجود تھی اور یہ نشہ ایسا تھا کہ علاؤالدین نے اس سے پہلے ایسی شراب نہیں تھی۔ جی چاہتا تھا اور چٹکیاں بھری جائیں اور شراب پی جائے۔ علاؤالدین خود کو اور ستانا چاہتا تھا مگر اُسے آتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ دریا کے سنہرے پانی میں خوب سیر ہو کے وہ باہر آ گیا۔

جسم لباس سے آراستہ کیا اور اپنے پڑاؤ کی طرف واپس ہونے لگا، راستے ہی میں الغ خاں اور چند سواروں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ الغ خاں علاؤالدین کو ڈھونڈتا ہوا اُس طرف آ نکلا تھا۔ اُس نے شکوہ کیا کہ وہ کسی کو اطلاع دیے بغیر تنہا اس اجنبی زمین پر سیر کرنے کے لیے کیوں نکل گیا۔ الغ خاں علاؤالدین کا دوست تھا۔ اس طرزِ تخاطب پر علاؤالدین نے اس کے گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اُسے نیچے اُتار لیا اور محبت سے گلے لگا لیا۔ حالانکہ وہ اس طرزِ تخاطب کا عادی نہیں تھا مگر اس وقت علاؤالدین پر گداز چھایا ہوا تھا۔ اس کا لہجہ بھی نرم تھا اور وہ خلافِ معمول آہستہ آہستہ دیوگری کی جنگ کے متعلق الغ خاں سے گفتگو کر رہا تھا۔ علاؤالدین کی اس تبدیلی پر الغ خاں حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

خیموں کی اس بستی میں خاصی چہل پہل تھی۔ جگہ جگہ آگ جل رہی تھی اور کھانے پک رہے تھے سپاہی ایک دوسرے سے چہلیں کر رہے تھے اور نغمہ سرائی میں مصروف تھے۔ علاؤالدین الغ خاں کے ساتھ اپنے خیمے میں داخل ہو گیا مگر ابھی اپنے بستر کے نزدیک پہنچا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور چند ثانیوں کے توقف کے بعد الغ خاں سے پوچھا "ہمارے خیمے پر کون کون سے پہرے دار تعینات ہیں؟"

الغ خاں علاؤالدین کا مزاج شناس تھا، جز بز ہو کے کہنے لگا "غلام سمجھا نہیں آقا کا اشارہ کس طرف ہے؟"

"ہم پوچھتے ہیں کہ کون کون یہاں پہرا دے رہا ہے؟" علاؤالدین نے مشتعل ہو کے کہا۔

"حسبِ دستور وہی جاں نثار جن کی وفاداری ہر شک اور شبہے سے بالا ہے۔ عمران بیگ، ملک سعد اللہ اور نظیر خاں" الغ خاں نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"کیا تم یہاں کسی اجنبی کی بُو سونگھ رہے ہو؟"

"جی" الغ خاں کی نظریں خیمے کا طواف کرنے لگیں اور اس نے اپنا خنجر پھرتی سے سنبھال لیا۔ "غلام کچھ سمجھا نہیں۔" الغ خاں نے عاجزی سے کہا۔

"ہمارے وفادار غلاموں کی موجودگی کے باوجود ہمارا ایک مہمان بے اجازت یہاں داخل ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ دیوگری میں معرکہ دلچسپ رہے گا۔ یہ

> "لوگ کہتے ہیں، خدا دُشمن کے شر سے بچائے لیکن میں کہتا ہوں خدا دوستوں کی خیر سے بچائے اس لیے کہ دُشمن کی عداوت کبھی اتنی موذی نہیں ہو سکتی جس قدر دوستوں کی مُحبّت ہوتی ہے۔"
>
> جوشؔ ملیح آبادی

بہادروں کی جگہ معلوم ہوتی ہے" علاؤالدین بلند آواز میں الغ خاں سے مخاطب تھا "الغ خاں تم جا سکتے ہو، خیمے سے پہرے داروں کو بھی ہٹا دو۔"

"لیکن میرے آقا!" الغ خاں نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

"تم نے سُنا نہیں الغ خاں!" علاؤالدین نے اس بار نرم لہجے میں کہا۔ "اپنے مہمان کا احترام ہم پر واجب ہے، چاہو تو تم خیمے کے باہر ہمارا انتظار کر سکتے ہو" آخری جملہ علاؤالدین نے لنتے حکمیہ انداز میں کہا کہ الغ خاں چپ چاپ نکل گیا۔

علاؤالدین اب بستر پر اطمینان سے بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنا خنجر نکال کر اسے تولا اور پُر تپاک لہجے میں بولا "دیوگری کے معزز سپاہی! باہر آ جاؤ تم دیکھ سکتے ہو کہ ہم بالکل خالی ہاتھ بیٹھے ہیں اور تمہارے ہاتھ میں کھُلا خنجر ہے۔ بہتر ہے کہ ہمارے درمیان بزدلوں کی طرح کوئی فیصلہ نہ ہو۔ ہم تم سے لڑنا چاہتے ہیں ہمارے حکم کے بغیر یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ ہم تمہارے منتظر ہیں عورتوں کی طرح حملہ کرنا کسی بہادر سپاہی کو زیب نہیں دیتا۔ ہم تمہارا جسم اُسی وقت برچھیوں سے چھید سکتے تھے جب ہماری عقابی نظروں نے پردے کی سرسراہٹ دیکھی تھی اور ہماری تیز تر قوتِ شامہ نے یہاں کسی اجنبی کی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔"

علاؤالدین کو مزید کچھ کہنے کی زحمت نہیں ہوئی، کالے رنگ گٹھے ہوئے جسم کا ایک تنومند نوجوان اپنے ایک ہاتھ میں خنجر لیے تیزی سے باہر نکلا اور جست لگا کے علاؤالدین کے سینے پر خنجر ترازو کرنا ہی چاہتا تھا اسی لمحے علاؤالدین کی لات اس کے سینے پر پڑی اور وہ زمین سے اکھڑ کر دُور جا گرا۔ علاؤالدین بڑھ کے اس کا خنجر بردار ہاتھ گرفت میں لینے کی تاک میں تھا کہ سپاہی نے حیرت انگیز پھُرتی سے اُٹھ کے پینترا بدلا اور جواباً ایک لات علاؤالدین کے چہرے پر ماری علاؤالدین کو یہ سارا خیمہ چکراتا محسوس ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، سپاہی اسے فرش پر گرا چکا تھا اور خنجر والا ہاتھ بلند کر کے آخری وار اس پر کرنا ہی چاہتا تھا کہ علاؤالدین نے خنجر والے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی۔ چٹاخ سے ایک آواز آئی۔ سپاہی نے درد و کرب سے ایک فلک شگاف چیخ ماری اور دُہرا ہو گیا۔ اس کا خنجر اب علاؤالدین کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس کے برابر کھڑا ہوا سادگی سے کہہ رہا تھا "ہم تمہیں ایک حملے کی اجازت اور دیتے ہیں۔"

لیکن سپاہی کی دردناک چیخوں سے پورا خیمہ گونج رہا تھا علاؤالدین نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردی سے کہا "شاید تمہیں بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے؟ تمہارا تعلق راج دربار سے معلوم ہوتا ہے یقیناً تم دیوگری کے اہم آدمی ہو گے۔ تمہارے لباس، گلے کی مالاؤں اور جرأت و بہادری دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے۔ ہم تمہارا نام جاننے کے مشتاق ہیں" سپاہی فرش پر گوسفندِ قربانی کی طرح تڑپ رہا تھا اس نے علاؤالدین کے اصرار پر جھکتے اور اٹکتے ہوئے اپنا نام بتایا

"کمارنگی۔"

"کمارنگی"۔ علاؤالدین نے حیرت سے دُہرایا۔ "مہارانا کانہا کا بھائی؟"

کمارنگی نے چیختے ہوئے سر ہلایا۔

"ہم سمجھتے تھے کہ کوئی بہادر شخص ہی اس طرح ہمارے خیمے میں داخل ہو سکتا ہے، معمولی سپاہی یہ جرأت نہیں کر سکتا۔" علاؤالدین نے تمکنت سے کہا۔ "تمھاری چیخیں ہمیں گراں گزر رہی ہیں، اس درد کا احساس تمھیں پہلے ہی ہونا چاہیے تھا جب تم نے یہاں آنے کا عزم کیا تھا۔" پھر اس نے الغ خاں کو آواز دی۔ "الغ خاں!"

الغ خاں جیسے اس آواز کا منتظر تھا۔ حکم سنتے ہی خیمے میں در آیا۔ "الغ خاں! کمارنگی کو یہاں سے لے جاؤ اور ہمارے اُن پہرے داروں کے سپرد کر دو جن کی غفلت کے سبب یہ بے وقوف شخص ہمارے خیمے کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم خود پر کتنا اعتماد کرتے ہیں۔ ہمارے حواس کتنے تیز ہیں اور ہم چند ہزار فوج لے کے کیوں دیوگری پر یلغار کے ارادے سے آ گئے ہیں۔ الغ خاں! حکم دو کہ پہرے دار اس کی تمام ہڈیاں جسم سے علیحدہ کر دیں مگر اس کی چیخیں ہمارے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہئیں۔"

پہرے دار کمارنگی کا زخمی جسم کھینچ کے خیمے سے باہر لے گئے تو الغ خاں نے ادب سے پوچھا۔ "غلام بچپن سے آپ کے ساتھ ہے، آپ کو خیمے میں گھستے ہی یہ کیسے علم ہو گیا کہ ایک نوجوان یہاں چھپا ہوا ہے؟"

علاؤالدین اُس وقت گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، چونک کر بولا۔ "الغ خاں! ہم نے اپنے خیمے میں ایک اجنبی بُو سونگھ لی تھی۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے، ہمیں یہاں کی فضا کچھ بدلی بدلی سی محسوس ہوئی۔ ہمارے شبہے کی تصدیق اُس وقت ہوئی جب ہم نے ایک جگہ پردے ہلتے دیکھے، پھر ہم سب کچھ سمجھ گئے؟"

"محترم آقا! آپ کی رفاقت ہمارے لیے باعثِ فخر ہے۔" الغ خاں نے مسرت سے کہا۔ "بلاشبہ آپ کو ہندوستان کا بادشاہ ہونے کا حق پہنچتا ہے۔" جواب میں علاؤالدین زیرِ لب مسکرا دیا۔

⁂

دوسری صبح الغ خاں، سنجر الپ خاں، ظفر خاں اور الماس بیگ علاؤالدین کے خیمے میں پہنچے تو وہ سجدے میں گرا ہوا تھا۔ اس کے چاروں دوست انتظار کرتے رہے، جب وہ عبادت مکمل کر چکا تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ خیمے سے باہر آ گیا۔ کمان دار کو تیر کمان لانے کا حکم دیا گیا۔ علاؤالدین نے اپنی نگرانی میں ایک خصوصی کمان تیار کرائی تھی، یہ کمان اسی طرز کی تھی جس کا ذکر راماین میں ہے کہ رام چندر جی نے سیتا کو جیتنے کے لیے ایک مخصوص قسم کی کمان اُٹھائی تھی۔ اس کمان کا تیر عام تیروں سے ڈیڑھ گنا بڑا ہوتا تھا اور علاؤالدین کے سوا کوئی شخص اسے چلا نہیں سکتا تھا۔

پھر علاؤالدین نے لشکر کو بستی سے کچھ اور قریب ہونے کا حکم دیا اور الماس بیگ کو ہدایت کی کہ راجورہ کے چار آدمی گرفتار کر کے فوراً لائے جائیں جو کمارنگی کی لاش مہارانا کانہا کے محل تک پہنچا سکیں۔ "حملے کا آغاز ہماری طرف سے نہیں ہو گا۔ ہم کانہا کے اگلے قدم کا انتظار کریں گے۔" علاؤالدین اپنے نائبوں کو مختلف ہدایتیں دے رہا تھا۔

لشکر راجورہ کی بستی سے کچھ اور قریب ہو گیا اور علاؤالدین نے اپنا مخصوص تیر چلّے پر رکھا اور پوری طاقت سے بستی کی طرف پھینک دیا۔ ایک تیز رفتار تیر تھا کہ ہواؤں کو رد کرتا بستی کی طرف اُڑنے لگا تھا۔

اس طرف کوئی کسان اپنے کھیتوں میں پانی دے رہا تھا کہ دفعتہً اس کی نگاہ آسمان پر اُڑتے ہوئے ایک نیزے پر پڑی۔ وہ دہشت ناک چیخ مار کے وہیں گر پڑا۔ نیزا بہت دُور جا کے ایک کھیت میں گر گیا تھا۔ کسان نے اُٹھ کر بھاگنا شروع کر دیا، ہانپتا کانپتا اس کھیت میں جا پہنچا جہاں نیزا آدھے سے زیادہ زمین میں گڑا ہوا تھا۔ اس دوران میں دوسرے کسان بھی آسمان پر اُڑتا ہوا وہ عجیب و غریب نیزا دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے زمین کھود کے نیزا باہر نکالا اور یہ دیکھ کے حیرت میں پڑ گئے کہ یہ نیزا اٹھانا ایک آدمی کی طاقت سے باہر تھا۔ بستی میں دیکھتے دیکھتے یہ خبر عام ہو گئی۔ دو آدمی نیزا اُٹھائے مہارانا کانہا کی طرف چلے۔ سینکڑوں آدمی خوف سے لرزتے ہوئے ان کے ساتھ ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ دیوتا اس بستی سے ناراض ہو گئے ہیں، یہ عذاب کی علامت ہے، اب نہ جانے راجورہ پر کیا طوفان آنے والا ہے۔ بستی کے لوگ محل کے قریب پہنچے تو وہاں پہلے سے کہرام مچا ہوا تھا۔ اپنے بھائی کمارنگی کی لاش مہارانا کانہا کے سامنے پڑی تھی۔ تیر دیکھ کے وہ اور بدحواس ہو گیا۔ اس نے گھبراہٹ میں بستی کے لوگوں کو اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ صبر و استقامت سے آنے والے خطرے کا مقابلہ کریں اور دیوتاؤں سے پرارتھنا کریں کہ وہ ہمیں شما کر دیں۔ کانہا کے پیغام میں عزم مفقود تھا، بے یقینی جھلکتی تھی، اس لیے اس نے ہجوم کا ردِعمل جاننے کی بھی جرأت نہیں کی کہ وہ مطمئن ہوا ہے یا نہیں، یہ کہہ کے اس نے فوراً گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔ راجورہ دیوگری کی ایک باج گزار ریاست تھی اور مہاراجہ رام دیو سے راجورہ کا یہ سمجھوتا تھا کہ اگر کسی نے بستی پر حملہ کیا تو راجہ اپنی بے اندازہ فوجی طاقت سے اس کا بچاؤ کرے گا۔

✻

مہاراجہ رام دیو ابھی پوجا پاٹ کر کے اپنے خاص مندر سے باہر نکلا ہی تھا کہ اُسے کانہا کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ مہاراجہ نے اسے پورے احترام کے ساتھ قلعے کے بڑے دروازے سے اپنے محل میں بلوایا اور جب کانہا نے مہاراجہ کو تیر دکھا کر خلجی افواج کی آمد اور انتہائی بے دردی سے اپنے چھوٹے بھائی کمارنگی کے قتل کی داستان سنائی تو رام دیو خوف سے لرز گیا۔ وہ ایک ضعیف العقیدہ شخص تھا اور اس کے خوف زدہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کا ولی عہد کام دیو اپنی بیوی اور ماں کو لے کے کاشی کی یاترا کو گیا ہوا تھا اور اپنے ساتھ بہت بڑا لشکر بھی لے گیا تھا۔ قلعے میں چالیس پچاس ہزار سپاہی تھے اور مہاراجہ کے اپنے اندازے کے مطابق خلجی حکمراں دلّی سے اتنی دُور ایک لاکھ سے کم فوج کے ساتھ آنے کی ہمّت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کانہا کو مشورہ دیا کہ وہ چند دن سلطانی افواج کو راجورہ کی سرحد پر روکے رکھے، اس دوران میں کام دیو واپس آ جائے گا اور سلطان کا مقابلہ کرنا آسان ہو گا۔ مہاراجہ نے اپنے تیس ہزار سپاہی کانہا کی مدد کے لیے راجورہ بھیجنے کا اعلان کیا۔

کانہا راجورہ واپس آیا تو سورج بلندی پر تھا۔ دوپہر تک مہاراجہ رام دیو کی بیس ہزار فوج بھی میدان میں اُتر آئی اور کانہا نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ جنگ راجورہ کے کھیتوں میں لڑنے کے بجائے تاپتی کے کنارے لڑی جائے۔ جہاں بستی سے

کچھ فوراً خلجی لشکر ٹھیرا ہوا تھا۔ اس نے فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

علاؤالدین کسی خبر کا منتظر تھا۔ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ کانہا بیس ہزار فوج لے کے سلطانی لشکر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ علاؤالدین نے اپنی فوج سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہماری منزل راجورہ نہیں دیوگری ہے۔ راجورہ تو درمیان میں خواہ مخواہ آ گیا ہے۔ ہمیں رات سے پہلے دیوگری کی فصیلوں تک پہنچنا ہے' لہٰذا راجورہ کی بستی پر پوری طاقت سے حملہ کر دیا جائے۔ خلجی افواج رات سے اس حکم کی منتظر بیٹھی تھیں۔ ادھر کانہا اپنے محل میں کوچ کی تیاریاں ہی کر رہا تھا کہ اُسے مسلمان فوجوں کے بستی میں داخل ہونے کی اطلاع دی گئی۔ مہاراجہ رام دیو کی بھیجی ہوئی فوج کو یہ بتایا گیا تھا کہ لڑائی تاپتی کے کنارے پر ہو گی۔ لہٰذا وہ کوچ سے پہلے سستا رہی تھیں کہ خلجی فوجیں ان پر ٹوٹ پڑیں۔ علاؤالدین اور اس کے ساتھی بستی کی مختلف سمتوں میں گھس گئے تھے' دلّی سے وہ سات سو میل دُور تھے اور درمیان میں ان کی ہمدرد ریاست بھی کوئی نہیں تھی' وہ بے جگری سے لڑتے رہے' انھوں نے اپنی کم تعداد کی پروا نہیں کی۔ شام ڈھلتے ڈھلتے راجورہ کی بستی لاشوں کے شہر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ سب سے بڑے مندر کے کلس پر مہارانا کانہا کی لاش لٹکا دی گئی تھی۔ اس جنگ میں علاؤالدین کے ایک ہزار سپاہی کام آئے۔ علاؤالدین نے راجورہ میں اپنی فوجوں کو آج کی فتح کا جشن منانے کا موقع بھی نہیں دیا۔ رات ہوتے ہوتے وہ اپنے چھ ہزار سواروں کے ساتھ دیوگری کے قلعے کی فصیلوں کے نیچے کھڑا تھا۔ اُسے معلوم تھا راجہ قلعے میں بند ہو کے بیٹھ جائے گا کیونکہ اس کی فوج کا بڑا حصہ راجورہ کی جنگ میں کام آ چکا تھا۔ جنگ کا فیصلہ اتنی جلد ہو جائے گا' اسے یہ بھی توقع نہیں ہو گی' وہ سہما ہوا ہو گا' یہی موقع اس پر جھپٹنے کا ہے۔

اُدھر مہاراجہ کا خیال تھا کہ اس کے پاس چھ ہفتوں کا آٹا اور دوسری غذائی اجناس ہیں' اس دوران میں اس کا بیٹا کام دیو کاشی یاترا سے واپس آ جائے گا لیکن جب رام دیو کو یہ معلوم ہوا کہ کوکن کے تاجر آٹے کی بوریوں کے بجائے نمک کی بوریاں چھوڑ گئے ہیں' اس کے اہل کاروں نے رشوت لے کے یہ بوریاں قبول کر لی ہیں تو وہ غصّے سے نیم پاگل ہو گیا۔ پھر بھی اس نے قلعے میں اعلان کرا دیا کہ ہم مسلمانوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے قلعے میں بھوکے مر جانا پسند کریں گے۔ قلعے کے دروازے مسلمان فوجوں پر نہیں کھولے جائیں گے۔"

چودھویں رات کا چاند اُن کے سروں سے گزر گیا۔ علاؤالدین کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس کی افواج نے قلعے کا محاصرہ کر لیا تھا لیکن راجہ نے کمال استقامت کا ثبوت دیا' اندر بند ہو کے بیٹھا رہا۔ کئی اندھیری راتیں اور کئی چمکتے دن گزر گئے۔ علاؤالدین کے ساتھی اس طویل محاصرے سے تنگ آ گئے تھے' الماس بیگ کے ذریعے جب علاؤالدین کو یہ خبر پہنچی تو اس نے اپنے تمام ساتھیوں کو بلایا اور انھیں مخاطب کر کے کہا "کیا ہم یہاں سے واپس جا سکتے ہیں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم دلّی' کڑے یا لکھنوتی سے جس طرح آئے تھے' اُسی طرح واپس جا سکتے ہیں' دلّی اور دیوگری کے درمیان سات آٹھ سو میل کا فاصلہ ہے۔ واپسی کا مطلب موت ہے۔ رام دیو کے لڑکے کام دیو سے کسی جگہ ہماری مڈبھیڑ ہو سکتی ہے اور درمیان میں بے شمار ہندو ریاستیں ہیں جنھیں دیوگری پر ہمارے حملے کی خبر مل چکی ہو گی۔ کیا ہم ان ہندو راجاؤں کی نفرتوں سے بچ کے واپس اپنے گھروں میں پہنچ سکتے ہیں؟ جنگ موت کا دروازہ ہے' جب ہم اس دروازے میں داخل ہو گئے ہیں تو اندر جانے سے کیوں خوف زدہ ہیں کہ موت کے سوا کوئی اور عذاب ہم پر نازل نہیں ہو گا۔"

علاؤالدین کی اس تقریر کا نتیجہ یہ نکلا کہ ٹوٹی ہوئی ہمتیں جُڑ گئیں' خلجی فوجوں نے طے کر لیا کہ وہ آخر دم تک اپنا محاصرہ نہیں توڑیں گے۔ مشکل یہ تھی کہ علاؤالدین قلعے کے اندرونی حالات سے بالکل واقف نہیں تھا کہ مہاراجہ کے پاس کتنی رسد باقی ہے۔

اور پھر ایک بات اور تھی۔ جو علاؤالدین نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کے دوران میں نہیں کہی جو اس نے اب تک کسی سے بھی نہیں کہی تھی۔ وہ تھی چندراوتی کی بات۔ چندراوتی اور اس کے درمیان صرف ایک فصیل کا فاصلہ تھا۔ علاؤالدین سے زیادہ کون بے تاب ہو گا کہ کسی طرح یہ محاصرہ جلد سے جلد ٹوٹ جائے اور وہ قلعے کے اندر داخل ہو جائے۔ پھر چندراوتی کو دیکھے۔ سپارنتی کو دیکھے۔ وہ رات کو خیمے سے باہر نکل کے فصیلوں کی طرف دیکھتا رہتا۔ پھر اس نے ایک رات ایک بہت عجیب فیصلہ کر لیا۔ اگر وہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتا تو وہ اسے پاگل قرار دیتے' چنانچہ اس نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ اس نے اپنے تمام کپڑے اتار دیے اور ایک دھوتی سے ستر پوشی کی۔ راج کماری چندراوتی کی مالا گلے میں ڈال اور اپنے خاص پہرے داروں ہی کو مطلع کیا کہ وہ خیمے سے باہر جا رہا ہے' خیمے میں کسی کو اندر داخل نہ ہونے دیا جائے اور اس کی نقل و حرکت کے بارے میں بھی کوئی اطلاع نہ دی جائے' رات کا آخری پہر تھا' قلعے کے نگہبانوں کے سامنے شاہی افواج اپنے خیموں کے باہر آرام کر رہی تھیں۔ اس وقت دونوں طرف ایسا سکون چھایا ہوا تھا کہ شب خون مارنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ علاؤالدین اندھیرے میں اپنا خاکی جسم چھپائے رینگتا ہوا کسی نہ کسی طرح فصیل کے نیچے پہنچ گیا۔ وہ فصیل کے سائے سائے چلتا ہوا جائزہ لے رہا تھا کہ کون سا مقام کمند پھینکنے کے لیے مناسب ہے؟

علاؤالدین نے آہستہ آہستہ ایک سنسان مقام پر کمند پھینکی اور انتہائی تیزی سے فصیل پر چڑھنے لگا۔ فصیل پر چڑھ کے اس نے سر اُٹھا کے اندر کا جائزہ لیا۔ اندھیرے میں دُور کی چیزیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ وہ آہستہ سے فصیل سے نیچے قلعے میں اُتر گیا۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہاں ایک باغ تھا۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وہ آگے بڑھا تو باغ میں حوض' فوارے اور درمیان میں ایستادہ پتھر کا ایک بُت بھی نظر آیا۔ باغ کو دیکھ کے اندازہ ہو گیا کہ وہ زنان خانے سے کہیں قریب کھڑا ہے۔ قلعے کے اُس حصّے میں زندگی کے آثار نہیں تھے مگر یہ ضروری نہیں تھا کہ آگے جا کے بھی علاؤالدین کی اسی طرح پزیرائی ہو۔ یہاں اُس کی خداداد ذہانت نے پھر اُس کا ساتھ دیا۔ اُسے یقین تھا کہ باغ سے ملحق مالی کی کوٹھری بھی ہو گی' وہ درختوں درختوں گزرتا ہر سمت نظر رکھتا آخر ایک چھوٹی سی کوٹھری کے نزدیک پہنچ گیا۔ یہاں اس کی توقع کے مطابق ایک شخص سویا ہوا تھا۔ اس خوابیدہ شخص کے گلے پر خنجر رکھتے ہی اُسے زنان خانے کی سمت معلوم ہو گئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ قلعے کی غذائی حالت خراب ہے اور اب وہ صرف ایک وقت کا کھانا کھا کے گزارا کر رہے ہیں' چند ضروری معلومات علاؤالدین نے حاصل کر کے اسے ابدی نیند سلا دیا اور کوٹھری کا دروازہ باہر سے بند کر کے زنان خانے کی سمت بڑھنے لگا۔

جو اس کی اطلاع کے مطابق قلعے کے مندر کے مشرق میں تھا۔
مندر میں ہلکی روشنی تھی اور چہل پہل نظر آ رہی تھی کئی سادھو اور پنڈت مندر کے باہر بھی جاپ میں مصروف تھے۔ علاؤ الدین نے مندر کے سامنے کے مختصر راستے سے جانے کے بجائے طویل راستہ اختیار کیا۔ وہ بہت اطمینان سے چل رہا تھا جیسے وہ بھی اسی قلعے کا کوئی سادھو ہے، زنان خانے کی سفید عمارتوں سے ملحق سُرخ اور سفید عمارتوں کا ایک سلسلہ تھا یہاں دربان، محافظ پہرے دار جاگے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور کسی قدر سرگرمی معلوم ہوتی تھی۔ علاؤ الدین تمام اندیشوں سے بالاتر ہو کے زنان خانے کی عمارت کے قریب پہنچ گیا۔ درمیان میں اس نے کئی مسلح محافظوں کو چکما دیا۔ کسی نے اُسے دیکھا بھی تو روکا نہیں کیونکہ بے نیاز سادھو اپنے خیال میں گُم کوئی منتر پڑھتا ہوا آہستہ آہستہ جا رہا تھا لیکن جب وہ زنان خانے کے حصّے میں داخل ہوا تو ایک مسلح محافظ نے اُس کا راستہ روک لیا۔
اس کے استفسار سے پہلے ہی علاؤ الدین نے دھیمے لہجے میں کہا: "بیٹا! ہمارا راستہ کھوٹا نہ کر۔ ہمیں پاربتی سے ملنا ہے۔"
"پاربتی سے؟" محافظ نے پاربتی کا نام سُن کر سہم کے کہا۔
"ہاں پاربتی سے۔ چندراوتی سے جو پاربتی کا دوسرا روپ ہے۔" علاؤ الدین نے بے خوفی سے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ پاربتی کے استھان پر پیش آنے والے واقعے سے قلعے کا ہر شخص واقف ہوگا۔
دربان ایک قدم پیچھے ہٹ گیا: "مگر راج کماری تو سو رہی ہیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔
"ہم اسے جگا لیں گے۔" سادھو کی آواز میں حکم تھا۔
محافظ تذبذب میں پڑ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید دیر لگاتا یا کسی دوسرے محافظ کو آواز دیتا، علاؤ الدین نے پھرتی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اپنے خنجر کے دستے سے اُس کے سر پر ایک بھرپور ضرب لگائی۔ محافظ تیورا کر اس کے بازوؤں پہ جھول گیا۔ اُس کی آواز بھی نہیں نکل سکی۔ وہیں فرش پر اوندھے منہ اُسے ڈال کے وہ زنان خانے کی راہ داری میں گھُس گیا۔
اُس نے مال سے پہلے ہی زنان خانے اور راج کماری کے کمرے کا محلِ وقوع اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اس لیے وہاں پہنچنے میں اُسے کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ راہ داری میں ہلکے فانوس روشن تھے۔ وہ کسی جھجک کے بغیر راہ داری میں آ گیا۔ آگے جا کے اُس سے ایک باندی ٹکرا گئی اور ایک سادھو کو اتنی رات گئے زنان خانے میں دیکھ کے ہیبت زدہ رہ گئی، علاؤ الدین نے اُس کی ہیبت دُور کرنے کے لیے بزرگانہ انداز میں اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور اپنی گرج دار مگر پُر سحر آواز سے اُسے شیشے میں اتار لیا۔ علاؤ الدین کے ہاتھ میں راج کماری کی مالا لٹک رہی تھی جو یقیناً زنان خانے کی باندی پہچانتی ہوگی۔
جب وہ چندراوتی کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے سرہانے اُونگھتی ہوئی باندی نے اپنی مالکہ کو جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ چندراوتی کچی نیند میں تھی۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور اپنے سامنے ایک سادھو کو دیکھ کے سراسیمہ ہو گئی۔ علاؤ الدین کی آنکھیں اس کے خیرہ کُن جمال کا طواف کر رہی تھیں۔ راج کماری نے جب اس کے ہاتھ میں اپنی مالا دیکھی تو اُسے شاید سب کچھ یاد آ گیا۔ آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے اس نے غور سے سادھو کو دیکھا اور لرزنے لگی۔
"پاربتی!" سادھو نے آہستہ سے کہا: "ہمیں پہچانا؟ ہم تیرا ہار واپس کرنے آئے ہیں۔"
چندراوتی دوڑ کے سادھو کے قدموں سے لپٹ گئی: "شیو مہاراج! ہے شیو مہاراج! مجھے وشواس تھا، ایک دن آپ ضرور آئیں گے، میں آپ کی راہ تکا کرتی تھی۔" وہ سادھو کے قدموں پر سر رکھے اشک بار تھی: "لیکن مہاراج! ہم بڑی مصیبت میں گھر گئے ہیں مسلمانوں نے قلعے کے چاروں طرف فوجیں ڈال دی ہیں، وہ مجھے اپنی کنیز بنا کے یہاں سے لے جائیں گے۔"
"دیوی! تجھے کوئی کنیز نہیں بنا سکتا۔ آج رات کسی وقت تو قلعے کا دروازہ کھول دینا، ہم شہزادے کے روپ میں خود دیوی کے درشن کو آئیں گے۔" سادھو نے مالا چندراوتی کی طرف پھینک دی اور اسے متحیر چھوڑ کے کمرے سے باہر نکل گیا۔



صبح علاؤ الدین اپنے خیمے میں دراز تھا رات کا واقعہ اسے خود ایک خواب معلوم ہو رہا تھا لیکن مالا اس کے پاس نہیں تھی۔ اس نے حوصلوں سے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ صبح جب وہ خیمے سے باہر نکلا تو قلعے کی بُرجیوں پر سفید پرچم لہرا رہے تھے۔ رسد کی کمی اور راج کماری کے سمجھانے پر شاید راجہ نے ہتھیار ڈال دیے، اُس نے جلدی جلدی شہزادے کا لباس تبدیل کیا۔ اب وہ ایک سپاہی نہیں، واقعی سلطان معلوم ہو رہا تھا۔ سنجر الپ خاں اور الماس بیگ قلعے کے دروازے پر سن گن لینے گئے ہوئے تھے کہ اچانک قلعے کے دروازے کی چھوٹی کھڑکی کھلی اور معلوم ہوا کہ مہاراجہ رام دیو قلعے کے دروازے کے جھروکے سے شہزادہ علاؤ الدین خلجی سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ علاؤ الدین نے جواب میں کہلایا کہ "دروازے پر بات چیت کرنا شاہی آداب کے خلاف ہے۔ اگر مہاراجہ ہمارے خیمے میں تشریف لانا اپنی توہین سمجھتے ہیں تو ہم تنہا اُن سے ملاقات کرنے کے لیے قلعے میں آ سکتے ہیں۔"
الماس بیگ نے اس تجویز کی مخالفت کی کہ ہندو راجہ سے اتنی وضع داری اور مروّت کی توقع کرنا دانش مندی نہیں ہے لیکن علاؤ الدین نے الماس بیگ کا مشورہ رد کر دیا اور وہی ہوا علاؤ الدین کو جس کی توقع تھی۔ دربارِ خاص میں جس وقت راجہ کی پہلی نظر علاؤ الدین پر پڑی، وہ حیرت سے شیو مہاراج کہہ کے تخت سے نیچے آ گیا۔

علاؤ الدین نے شاہانہ مسکراہٹ سے کہا: "پچھلی باتیں بھول جائیے مہاراج! یہاں بہت سی باتیں آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ ہاں ہم یہ معلوم کرنا ضرور چاہیں گے کہ راج کماری کو اُس کی مالا واپس مل گئی؟"
علاؤ الدین کا یہ کہنا تھا کہ راج کماری تڑپتی ہوئی اس کے پیروں پر آ کے گر پڑی۔ "شیو مہاراج! آپ کسی روپ میں بھی آئیں، داسی آپ کو پہچان لے گی۔" ذرا سی دیر میں دشمنی کی فضا محبت کی خوشبو سے مہک اٹھی، رام دیو نے راج کماری کا ہاتھ علاؤ الدین کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: "آپ جو کوئی بھی ہیں، جس روپ میں بھی ہیں، رات مالا ہمیں واپس مل چکی ہے اور ہمیں اپنا وچن یاد ہے۔"
اسی وقت قلعے کے اندر الغ خاں، سنجر الپ خاں، ظفر خاں اور

الماس بیگ کو طلب کر لیا گیا۔ راجہ رام دیو نے راج کماری کے ساتھ بے شمار بیش قیمت ہیرے جواہرات اور نادرِ روزگار تحائف پیش کیے لیکن علاؤالدین کے لیے دیوگری کا سب سے قیمتی ہیرا چندراوتی تھی۔ جس کے لیے اس نے یہ دور دراز کا سفر اختیار کیا تھا۔



پورے دن قلعے میں جشن برپا رہا اور آخر وہ رات آ گئی جو علاؤالدین کی زندگی کی سب سے خوبصورت رات تھی۔ اُمیدوں اور آرزوؤں کی رات، چندراوتی دلھن بنی علاؤالدین کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کا چہرہ دہکتی رہ گئی۔ خود علاؤالدین کا بُرا حال تھا۔ فرطِ جوش سے اس نے چندراوتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور جذبات زدہ آواز میں کہنے لگا۔ "ہم نے تمھیں حاصل کر لیا۔"

"اور میں نے اپنے شیو مہاراج کو۔" چندراوتی نے شرما کے کہا۔

علاؤالدین نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ "ہم اپنے جذبات کے اظہار سے قاصر ہیں چندراوتی! ہمیں پتہ نہیں کہ اس موقع پر کیا کہنا چاہیے لیکن ہم اتنے خوش ہیں کہ زندگی میں کبھی نہ ہوئے تھے۔"

چندراوتی نے زیرِ لب کہا۔ "مہاراج! میں آپ کو شیو مہاراج کہوں یا شہزادۂ معظم کہہ کے پکاروں؟"

"تم جس نام سے چاہو، ہمیں پکارو۔" علاؤالدین نے بے قراری سے کہا۔ "ہم نے پہلے ہی تمھارا نام تجویز کر دیا ہے۔ آج سے تمھارا نام ماہ بانو ہے۔"

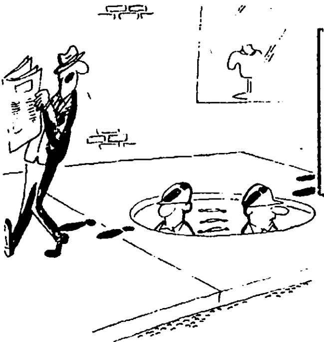
"میں ہر نام اور ہر روپ میں اب آپ کے لیے ہوں۔"

"ہم سے باتیں مت کرو چندراوتی اس کے لیے وقت پڑا ہے۔ آج تو ہمیں اپنا چہرہ دیکھنے دو۔" علاؤالدین اضطراب میں بولا۔ چندراوتی لجا گئی۔ علاؤالدین نے اُس کی ٹھوڑی پکڑ لی اور دیر تک اُس کے چہرے میں کھویا رہا اور اس کی زلفیں چومتے ہوئے بولا۔ "ابھی ہم تم سے دانستہ دُور رہیں گے اور کڑے چل کے باقاعدہ شادی کریں گے لیکن ہماری درخواست ہے کہ جب تک ہم تمھارے مہمان ہیں، اپنے درشن سے محروم نہ رکھنا۔"

"میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ ہمارے قلعے کے کماں دار کو یہ ذلت سخت ناگوار گزری ہے کہ آپ کے پاس صرف چند ہزار فوج ہے اور ہم نے شکست قبول کر لی ہے۔ صبح آپ مہاراجہ کو یہ بتا دیجیے کہ پچاس ہزار فوج کے لیے قلعے میں کھانے پینے کا سامان جمع کیا جائے کیونکہ چند دن میں ہماری باقی ماندہ فوج یہاں پہنچ جائے گی۔ اس دوران میں آپ اپنے تین چار ہزار سپاہی کسی پہاڑی میں آڑ کی سمت چھپا دیں اور جب میرا بھائی کام دیو اپنی پوری فوج کے ساتھ مقابلے کی دعوت دے تو صرف ان چار ہزار سپاہیوں کے گھوڑوں کی گرد کام دیو کو پچاس ہزار افواج کی گرد معلوم ہو گی۔"

علاؤالدین چندراوتی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی؟ اسے خبر نہیں تھی۔

اگلے چند دنوں میں وہی ہوا جس کے اندیشے کا اظہار چندراوتی نے کیا تھا۔ مہاراجہ رام دیو کی مرضی کے خلاف کام دیو نے قلعے پر حملہ کر دیا۔ رام دیو نے جوشیلے بیٹے کو بہت سمجھایا کہ شہزادے کی پچاس ہزار فوج کوئی دم میں دیوگری پہنچنے والی ہے لیکن جوانی کا خون آسانی سے شکست ماننے والا نہیں تھا۔



جب کام دیو کی توجہ خلجی سواروں کے گھوڑوں کی گرد کی طرف مبذول کرائی گئی تو اسے ہوش آیا۔ آسمان گرد سے دھندلا گیا تھا۔ کام دیو نے گھبرا کے اپنے لشکر میں سفید پرچم بلند کرا دیے۔ الماس بیگ نے صلح کی بات چیت کے لیے کام دیو کو اپنے خیمے میں بلوایا۔ دوسری ساعت میں اس کا سَر الماس بیگ کے خیمے کے باہر پڑا ہوا تھا۔ اس نے یہ سر نیزے پر بلند کر دیا اور نیزا کام دیو کے لشکر میں عبرت کے لیے بھیج دیا گیا۔ ساتھ ہی یہ مطالبہ کیا گیا کہ کل رات تک سلطانی افواج کے خیمہ انداز لشکر میں کام دیو کی افواج کا تمام اسلحہ جمع نہ کرا دیا گیا تو صبح کو دیوگری کے قلعے پر ہر باغی فوجی کا سر لٹکا ہوا ہو گا۔

اس واقعے سے کام دیو کی فوج میں ایسی دہشت پھیلی کہ رات ہی رات میں چار ہزار سپاہیوں کے خیموں کے ساتھ تیس ہزار سے زائد افواج کا اسلحہ ایک پہاڑی کی شکل میں جمع ہو چکا تھا۔

مہاراجہ رام دیو نے علاؤالدین سے بیٹے کی بغاوت پر معافی چاہی اور سونا چاندی، ہیرے جواہرات اس تعداد میں شہزادے کو پیش کیے گئے کہ دہلی کے خزانے میں اس کا ہزارواں حصہ بھی موجود نہیں تھا۔ اس کے علاوہ چندراوتی کے جہیز کے طور پر ساٹھ ہاتھی، چھ سو گھوڑے اور باربرداری کے لیے سو اونٹ بھی نذر کیے جن پر یہ خزانہ لادا گیا۔



دوسری صبح علاؤالدین کی فوج کو دیوگری سے کوچ کرنا تھا اور آج کی رات علاؤالدین پر بہت بھاری تھی۔ اس کی زندگی کا ایک مقصد پورا ہو چکا تھا مگر ابھی اُسے دوسری مہم سر کرنی تھی۔ کڑے جانے کے خیال ہی سے اسے ملکہ جہاں اور ماہ بانو کے مظالم یاد آ گئے۔

اور اپنے بوڑھے چچا جلال الدین خلجی کا چہرہ بھی، جسے دولت کی ہوس تھی۔ اُسے وہ تمام ذلتیں، وہ تمام سازشیں یاد آ رہی تھیں جو اُس کی بیخ کنی کے لیے سرِعام کی گئی تھیں۔ آج اُس کے پاس دولت تھی۔ اتنی دولت کہ وہ پایۂ تخت کے ہر آدمی کو اُس کی اپنی قیمت پر خرید سکتا تھا۔ قسمت نے اُسے ماضی کے تمام زخم بھرنے کے مواقع مہیا کر دیے تھے۔ اُس کا بس چلتا تو وہ اسی وقت دہلی پہنچ جاتا اور شاید ملکہ جہاں کا چہرہ ٹھوکروں سے لہولہان کر دیتا۔ شاید ماہ بانو

کا مغرور بدن کتّوں کے سامنے پھنکوا دیتا...... لیکن وہ دلّی سے ابھی دُور تھا اور یہ پہاڑ سی رات کٹنے میں نہیں آ رہی تھی۔

کڑے واپس پہنچنے میں اُسے چھ مہینے لگ گئے۔ وہ اپنے لشکر کے ساتھ ہندوستان کا سب سے قیمتی خزانہ لیے اُن مشکل راستوں سے واپس جا رہا تھا جہاں پچاس پچاس کوس تک کسی آبادی کا نشان نہیں تھا لیکن چندراوتی کی معیّت میں یہ چھ مہینے اُسے چھ ساعتیں محسوس ہوئی تھیں۔ وہ سچ مچ ایک دیوتا کی طرح اُس پر اپنی تمام محبّتیں نچھاور کر رہی تھی۔ پہلی بار علاؤالدّین کو ایک عورت کا ایسا بھرپور پیار ملا تھا کہ کڑے پہنچنے تک اُسے نہ ملکہ جہاں کا نفرت انگیز چہرہ یاد رہا تھا اور نہ ماہ بانو کی شہزادگی کا غرور اُسے پریشان کر رہا تھا لیکن کڑے پہنچ کر جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ آٹھ مہینے کی غیر حاضری میں ملکہ جہاں نے سلطان جلال الدین کو اُس کی بغاوت کا پورا یقین دلا دیا ہے تو ایک بار پھر وہ انتقام کی آگ میں جلنے لگا۔ اس بار یہ آگ بڑی شدید تھی۔

سب سے پہلے اُس نے چندراوتی کو مسلمان کر کے شادی کی اور ایک ہفتے تک کڑے میں وہ شاہانہ جشن منایا کہ ہندوستان کی تاریخ میں ایسی شادی کم ہی کسی نے دیکھی تھی۔ علاؤالدّین نے اس موقع پر دونوں ہاتھوں سے اتنی دولت لُٹائی کہ کڑے کا غریب سے غریب آدمی بھی برسوں کے لیے آسودہ ہو گیا۔ جلال الدین خلجی کو جب دولت کی اس فراوانی کی اطّلاع پہنچی تو وہ حرص و طمع سے پاگل ہو گیا۔ علاؤالدین کا مقصد بھی یہی تھا کہ کسی طرح سلطان جلال الدین خلجی کو بات چیت پر آمادہ کر لے۔ چنانچہ اُس نے ایک خط کے ذریعے اپنی غیر حاضری کی معافی مانگی اور مکمّل اطاعت کا یقین دلایا لیکن ملکہ جہاں نے حسبِ دستور سلطان کو شبہے میں مبتلا کیا کہ علاؤالدّین کے خط سے غرور اور نافرمانی کی بُو آ رہی ہے۔ اس خط پر اُس وقت تک یقین نہ کیا جائے جب تک علاؤالدین دلّی آ کر اور سلطان کے قدموں پر گر کے معافی نہ مانگے۔" ملکہ جہاں کے مشورے پر سلطان نے اُسے جواب میں لکھا "ہم نے تمھیں معاف کیا۔ اب جلد سے جلد پایۂ تخت پہنچ کر اپنی وفاداری کا یقین دلاؤ تاکہ تمھیں مزید اعزازات سے نوازا جائے۔"

جب یہ خط علاؤالدّین کو ملا تو وہ اپنی ماہ بانو کے ساتھ دنیا و ما فیہا سے بے خبر تھا۔ اُس نے حقارت سے شاہی فرمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آتش دان میں ڈال دیا اور اُسی وقت الماس بیگ کو بلا کر حکم دیا کہ "دلّی چلنے کی تیّاری کی جائے۔ ہمیں اپنی بادشاہی سے زیادہ ماہ بانو کو ملکہ بنانے کے اعلان کی خوشی ہو گی۔"

چندراوتی نے اِس موقع پر مداخلت کی "علائی!" اُس نے قدرے جھکتے ہوئے کہا۔ "کنیز شاید اپنی حد سے تجاوز کر رہی ہے لیکن آپ کا دلّی جانا مناسب نہیں ہے، لہٰذا دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ سلطان سے کہیے کہ وہ کڑے تشریف لائیں جہاں دیوگری کا سارا خزانہ اُن کے قدموں پر نچھاور کر دیا جائے گا۔"

"لیکن ماہ بانو!" علاؤالدّین نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ملکہ جہاں سلطان کو اتنی آسانی سے کڑے آنے کی اجازت نہیں دے گی۔"

"علائی! آپ انھیں لکھیے کہ اتنا بڑا خزانہ دہلی لے کر جانا خطرے سے خالی نہیں ہے، لہٰذا دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ سلطان خود کڑے آ کے یہ حقیر نذرانہ قبول فرمائیں اور آپ کو عزّت بخشیں۔ یقیناً اس خزانے کی حرص سلطان کو یہاں آنے پر مجبور کر دے گی۔"

علاؤالدین نے چندراوتی کے اس مشورے پر ہر پہلو سے غور کیا۔ اس بار الماس بیگ کو اِسی مضمون کی ایک عرض داشت لکھ کے دہلی بھیجا گیا۔ اِس عرض داشت میں خزانے کی تمام تفصیلات کئی صفحوں میں بیان کی گئی تھیں۔

لیکن الماس بیگ جب عرض داشت لے کے دلّی پہنچا تو یہ اطّلاعات سن کے حیران رہ گیا کہ محل میں اُس کے بھائی کو ہلاک کرنے کی تمام سازشیں مکمّل کی جا چکی ہیں۔ یہ انتظام کر لیا گیا تھا کہ جیسے ہی علاؤالدین محل میں داخل ہو گا، اُسے گرفتار کر لیا جائے گا اور کیونکہ منصف بادشاہ کو ایک دن اپنے اللہ کو منہ دکھانا تھا، وہ صرف دربار میں اتنا اعلان کرے گا کہ علاؤالدّین پر اگر کسی کا خون قرض ہے تو وہ اِس خون سے خود کو بری الذّمہ قرار دیتا ہے۔

الماس بیگ ایک ہی وار میں اپنے عیّار چچا کو سرِ دربار ختم کر دینا چاہتا تھا مگر اُس نے علاؤالدّین کے مشورے کا احترام کیا اور غیر معمولی قوّتِ برداشت کا ثبوت دیا۔ اُس نے دربار میں سب سے پہلے دیوگری کے چند ایسے نادرِ روزگار جواہر کی نذر گزاری کہ حریص جلال الدین کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔ الماس بیگ نے ادب سے عرض کیا "عالم پناہ کا اقبال بلند رہے اور غلام کو معاف کیا جائے کہ سفر میں خطروں کے پیشِ نظر وہ ہیرے اپنے ساتھ نہیں لا سکا جو روئے زمین پر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ غلام کو یہ کہنے کی اجازت بھی دی جائے کہ آقا کی جانب سے سلطانِ معظّم کو کچھ بد خواہ صرف اس لیے بدظن کرنا چاہتے ہیں کہ اگر سلطان کو یہ انمول خزانہ مِل گیا تو خلجی خاندان کی بنیادیں رہتی دنیا تک مستحکم ہو جائیں گی۔"

ملکہ جہاں بار بار مداخلت کرنا چاہتی تھی لیکن الماس بیگ دیوگری کے خزانوں کی تصویر اس خوب صورت اور دلکش پیرائے میں پیش کر رہا تھا کہ سلطان جلال الدّین کے ذہن میں اُس وقت اس خزانے کے حصُول کے سوا اور کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے کڑے کی جانب روانہ ہونے کا اعلان کر دیا۔



اُس صبح گنگا کے ساحل پر علاؤالدّین اپنے عزیز ساتھیوں اور سرداروں کے ساتھ سلطان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ شاہی بجرا جیسے ہی ساحل پر جا کر لنگر انداز ہوا، کڑے کا ایک مجذوب جس کا نام کڑک شاہ تھا، گھومتا پھرتا ساحل پر یہ تماشا دیکھنے آ کھڑا ہوا۔ بوڑھا سلطان اپنے عصا کا سہارا لیے جب بجرے سے ساحل کی طرف آ رہا تھا تو کڑک شاہ نے اُسے دیکھ کر بے اختیار نعرہ لگایا۔ "ہر کہ آرد بہ تو جنگ۔ تن در کشتی سر در گنگ۔"

جدید رجحان کے شانہ بشانہ
جامہ زیبی کی بلندیوں پر

کوثر پولیسٹر کریمپلین

KAUSAR'S

K POLYESTER CRIMPLENE

پرکشش لوگوں کے لئے
بیمثال ڈبل نٹ فیبرک

کوثر انڈسٹریز
ایس ۵۹-ایس-آئی-ٹی-ای-کراچی





اسٹاکسٹ:
اے-ون
کلاتھ اسٹور
عقب بمبئی بازار
نیونہام روڈ
کراچی
فون: ۲۲۱۵۱۴

علاؤالدّین نے آگے بڑھ کے بوڑھے سلطان کے قدم چُوم لیے۔

جلال الدّین نے بہت محبّت سے اُسے گلے لگایا اور ابھی دونوں بغل گیر ہی ہوئے تھے کہ الماس بیگ نے بڑھ کر سلطان کی گردن پر تلوار کی ایک کاری ضرب لگائی۔ سلطان جلال الدّین خلجی کا سر کٹ کے گنگا کے پانیوں میں ڈوب گیا اور اُس کا دھڑ لڑھک کر کشتی میں جا پڑا۔ اگلے چند ثانیوں میں کشتی سے اُس کا دھڑ بھی اُٹھا کے گنگا میں ڈال دیا گیا اور قلعے میں واپس آ کے علاؤالدّین نے سلطان علاؤالدّین خلجی کی حیثیت سے اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔

ملکہ جہاں کو جب یہ خبر پہنچی تو اُس نے اپنے سوتیلے بیٹے اور جلال الدّین خلجی کے ولی عہد ارکلی خان کو بادشاہ بنانے کے بجائے اپنے چھوٹے بیٹے قدر خاں کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ ارکلی خاں ملتان سے انتہائی تیز رفتاری سے دِلّی کی طرف کُوچ کرتا آ رہا تھا۔ وہ قدر خاں کی تخت نشینی کی خبر سُن کے اتنا برافروختہ ہوا کہ آدھے راستے سے یہ کہہ کے لوٹ گیا کہ "شاید علاؤالدّین کا خیال ان ہوس کار عورتوں کے بارے میں صحیح تھا اور جس کی یہ مجرم ہیں، وہی انھیں سزا دینے کا زیادہ مستحق ہے۔"

علاؤالدّین ماہ بانو کے ساتھ اب اِس شان سے دہلی کی جانب بڑھا کہ تمام راستے سونے چاندی کے پھول نچھاور کرتا جاتا تھا۔ ہاتھی پر ایک چھوٹی سی منجنیق رکھوا لی گئی تھی اور سونے چاندی کے پھول اُس منجنیق کے ذریعے اس طرح پھینکے جاتے تھے کہ راستے کی آبادیوں کی چھتیں ان پھولوں سے ڈھک گئی تھیں۔ اِس داد و دہش کا یہ نتیجہ نکلا کہ علاؤالدّین خلجی جو کڑے سے صرف تین ہزار سپاہی لے کے نکلا تھا، جب بدایوں پہنچا تو اُس وقت تک ساٹھ ہزار فوج اُس کے اطراف جمع ہو چکی تھی۔ بدایوں کا صوبے دار علاؤالدّین کے وارد ہونے سے پہلے فرار ہو چکا تھا۔ ملکہ جہاں کو ایک ایک لمحے کی خبریں مل رہی تھیں۔ آخر جب اُس نے بساط اُلٹتی دیکھی تو نوعمر بادشاہ اور ماہ بانو کو لے کے راتوں رات دِلّی سے ملتان بھاگ گئی۔ علاؤالدّین بڑے کرّوفر سے دِلّی میں داخل ہوا۔

تاج پوشی کی رسم دُھوم دھام سے منائی گئی۔ اتنے انعام بانٹے گئے کہ چند دن میں لوگ جلال الدّین کا نام تک بھُول گئے لیکن ابھی علاؤالدّین کو ملکہ جہاں کا قرض ادا کرنا تھا۔ ارکلی خاں کو اس شرط پر ملتان کی صوبے داری پر برقرار رکھا گیا تھا کہ مفرور باغیوں کو دو دن کے اندر دربار میں پیش کر دیا جائے۔



وہ دن سلطان علاؤالدّین خلجی کے لیے دوسرا اہم دن تھا۔ اُس دن دربارِ خاص میں الماس بیگ کے سوا اور کسی کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ سلطان بلبن کا پُرانا تخت دوبارہ دربارِ خاص میں لا کر بچھایا گیا تھا۔ اِس تخت کے بالکل برابر سلطان جلال الدّین کا تخت رکھا ہوا تھا۔ بلبن کے تخت پر انتہائی سادہ لباس میں خود سلطان علاؤالدّین خلجی بیٹھا تھا اور جلال الدّین کے تخت پر چندراوتی زر و جواہر میں ڈوبی، ملکہ کا تاج پہنے بیٹھی تھی۔ اُن کے پیچھے الماس بیگ ننگی تلوار لیے کھڑا تھا۔ محل کی کنیزیں درباری ملبوسات پہنے دو رویہ کھڑی تھیں کہ سامنے سے سیاہ نقابیں ڈالے ملکہ جہاں اور ماہ بانو پژمُردہ انداز میں تخت کے چبوترے تک پہنچیں، ملکہ جہاں آتے ہی علاؤالدّین کے قدموں پر گر گئی اور رو رو کے کہنے لگی "سلطانِ عالم! آج تیری داد و دہش کے قصّے دِلّی کے بچّے بچّے کی زبان پر ہیں۔ مجھے کوئی انعام مطلوب نہیں، میں صرف اپنی اور اپنی بیٹی کی جان کی امان چاہتی ہوں۔"

سُلطان علاؤالدّین خلجی متانت سے چند لمحے بُت بنا دونوں عورتوں کو اپنے قدموں میں گریہ وزاری کرتے دیکھتا رہا، پھر یکایک انتہائی نفرت سے اُس نے دونوں عورتوں کے بال ہاتھوں سے پکڑ کے انھیں اُوپر اُٹھایا اور کہا "علیا حضرت ملکہ جہاں! شہزادی ماہ بانو! کیا ہم نے اپنی زندگی کا یہ دشوار گزار سفر اس لیے کیا تھا کہ تمھیں معاف کر دیں؟ خلجی تاریخ ہماری سخاوت اور داد و دہش کے ساتھ اُس سزا کو بھی ہمیشہ یاد رکھے گی جو ہم تمھارے غرور اور تمھاری عیّاری کے بدلے میں ابھی سُنانے والے ہیں۔"

یہ کہہ کے اُس نے اتنی نفرت سے اُن دونوں کے بدن اپنے ہاتھ سے فرش پر پٹکے کہ دونوں لڑھکتی ہوئی تخت کے چبوترے سے اُن کے قدموں پر جا کے گریں جو کل تک خود اُن کی کنیزیں تھیں۔ سلطان علاؤالدّین کی آتشِ غضب میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ جلال کے عالم میں چبوترے سے اُترا اور ماہ بانو کو بالوں سے کھینچتا ہوا پھر چبوترے پر لے آیا اور چندراوتی کے قدموں میں پھینکتے ہوئے کہا "بدبخت! دِلّی کے فقیروں میں نہ سہی آج دِلّی کے سلاطین میں ایک نئے سلطان کا اضافہ ہو گیا ہے اور تجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ نئے سلطان کی ملکہ علیا حضرت ملکہ جہاں ماہ بانو کے قدم اپنی پلکوں سے صاف کر اور دیکھ کہ خدا کا انصاف بڑا ہے یا شہزادگی کا طنطنہ؟"

شہزادی ماہ بانو نے چندراوتی کے قدموں پر پڑا ہوا اپنا زخمی چہرہ اُوپر اُٹھا کر اس طرح چندراوتی کو دیکھا کہ چندراوتی کا دل دہل گیا۔ اُس نے تخت سے کھڑے ہو کے سلطان علاؤالدّین کے سامنے دو زانو ہو کر عرض کیا "میرے آقا! آج تک میں نے آپ سے اپنے حقِ مہر کا مطالبہ نہیں کیا ہے۔ میں اپنے حقِ مہر کے طور پر اِن دونوں معزّز خواتین کی جاں بخشی اور اِن کے شایانِ شان ایک اچھی زندگی کی درخواست گزار ہوں۔"

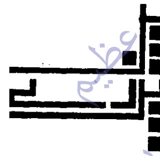
سلطان علاؤالدّین سکتے میں رہ گیا۔ اُس نے چندراوتی کو غور سے دیکھا پھر آہستہ سے الماس بیگ کو مخاطب کیا "علیا حضرت ملکہ جہاں، ماہ بانو کی خواہش کا احترام کیا جائے۔" یہ کہہ کے وہ تخت سے کھڑا ہوا اور چندراوتی کی پیشانی کو بوسہ دے کے دربار سے باہر نکل گیا۔





سب رنگ





چند لمحے کرشن چندر کے ساتھ گزاریے، اور خوب روئیے اور خوب ہنسیے

کرشن چندر کے وحشی قلم سے

چونکہ بہار میں کوئی قحط نہیں ہے اور کہیں بھکمری نہیں ہے اسی لیے تو شیامو بہاری ساکن موضع تپیا، ضلع مظفر پور، اپنے گاؤں سے بھاگ کر زندہ اور صحیح سلامت بمبئی پہنچ گیا تھا۔ اگر بھکمری ہوتی تو وہ کیوں نہ اپنے ہی گاؤں میں بھوک سے مرجاتا، بمبئی کیسے پہنچتا؟ اور صرف روٹی کپڑے پر نوکری کیسے تلاش کرتا؟

میں تو چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی بڑی باتوں کے متعلق بھانپ جایا کرتا ہوں۔ شیامو کی آمد سے میں نے یہ بھی معلوم کرلیا ہے کہ بہار میں کہیں بھکمری نہیں ہے۔ گورنمنٹ بالکل سچ کہتی ہے اور یہ اخبار والے بالکل جھوٹ بولتے ہیں۔

جب شیامو بہاری کو میں گھر لے کے آیا تو لکشمی بے حد خفا ہوئی، ساڑی کے پلّو میں لٹکا ہوا چابیوں کا چھلّا گھماتے ہوئے بولی: "آخر تم چاہتے کیا ہو؟ میں کوئی کام نہ کروں، بیٹھ بیٹھ کر موٹی ہوتی جاؤں ۔۔۔ اور تم بڑے آرام کے ساتھ چند سالوں کے بعد کوئی دوسری نازک بانکی لے آؤ؟ نہیں جی، میں کچھ نہ سنوں گی، میں اس نوکر کو نکال دوں گی۔"

میں نے کہا: "سنو لکشمی! تمھیں ..... ذرا سوچو تو پیاری لکشمی! تمھیں اس گھر میں کتنا کام کرنا پڑتا ہے؟"

"کیا کام کرنا پڑتا ہے؟" لکشمی بھڑک کر بولی: "اس گھر میں آدمی ہی کتنے ہیں؟ ایک تم ہو حالانکہ مجھے اس میں شبہ ہے۔ ایک میں ہوں۔ ایک میرا چھوٹا بھائی، دو تمھارے بڑے بھائی، ایک تمھارا باپ ہے، ایک میری بے چاری بڈھی ماں ہے، پانچ ہمارے بچّے ہیں جن میں سب سے

کرشن چندر، واجدہ تبسم اور بلونت سنگھ کے زہر

اردو کی تین بہترین کہانیاں * اس ماہ کے لیے شعور انوار کا انتخاب

سب رنگ کی منتخب کہانیاں اردو ادب کا عطر ہیں

چھوٹا ہمارا کشو چار سال کا ہے۔ گھر کے آدمی ہی کتنے ہیں؟ کیا تم نے مجھے اپاہج سمجھ رکھا ہے؟"

"سنو ڈارلنگ! آج کل کے نوکر تو بس گھر کی شوبھا ہوتے ہیں، سارا کام تو تمھیں خود ہی کرنا پڑے گا گزشتہ بارہ سالوں کی طرح۔"

"تب ٹھیک ہے مگر اسے تنخواہ کیا دینی پڑے گی؟"

"کچھ نہیں، بس روٹی کپڑا۔"

"بس روٹی اور کپڑا؟" لکشمی زور سے چلّائی۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں پھر وہ کچھ لمحے بیسویں صدی کے اِس نئے معجزے یعنی شیامو بہاری کو حیرت سے تکتی رہی جو صرف روٹی کپڑے پر کام کرنے کے لیے آمادہ تھا۔ پھر میری طرف مڑ کر شکایت آمیز لہجے میں بولی "تم تو کہتے تھے بہار میں قحط.....؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے کہا "بلکہ اِس محض روٹی کپڑے پر قناعت کرنے والے نوکر کو دیکھ کر تو بمبئی میں بھی قحط نہ آنے کا اندیشہ پیدا ہو چلا ہے۔"

"تب تو ٹھیک ہے۔" لکشمی نے سر ہلا کر کہا۔

"چل بے شیامو! اِس کمرے میں جھاڑو دے۔"

جھاڑو دینے کا حکم بجا لاتے ہوئے جب شیامو نے جواب میں غسل خانے کا لوٹا پیش کیا تو لکشمی چند لمحوں کے لیے کچھ حیران سی رہ گئی۔ بعد میں جب کدّوکش مانگنے پر لکشمی کو چمٹا ملا اور مجھے تولیا مانگنے پر جوتا پیش کیا گیا تو میں سمجھ گیا کہ بہار میں نہ صرف یہ کہ قحط نہیں ہے بلکہ وہاں ایک زبان ایسی بھی بولی جاتی ہے جس کا نام میتھلی ہے اور جو ہماری زبان سے بہت مختلف ہے۔ اِس سے پہلے میں میتھلی کو بھاشا کا درجہ دینے کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہ تھا کیونکہ ہندوستانی ودھان یعنی دستور میں میتھلی بھاشا کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔

بہرحال آدمی اپنے تجربے سے سیکھتا ہے۔ میں نے لکشمی سے اس کا ذکر کیا۔ کہا "چلو اچھا ہی ہوا اب تمھیں میتھلی بھاشا بھی سیکھنا پڑے گی۔ بہت عرصے سے تم نے لکھنا پڑھنا چھوڑ رکھا تھا۔"



چھ ماہ کے عرصے ہی میں شیامو گھر کے کاموں میں طاق ہو گیا کچھ ہم نے اُس کی بھاشا سیکھ لی کچھ اُس نے ہماری غفلت سے فائدہ اُٹھانا سیکھ لیا۔

ایک سال کے عرصے ہی میں اُس نے ہر اتوار کو چھٹی لے کر سنیما جانا شروع کر دیا اور دو روپے نقد تنخواہ کا مطالبہ کرنے لگا جو دوسرے سال پانچ روپے پر پہنچ گئی۔

اب وہ اپنی ملازمت کے تیسرے سال میں تھا۔ اب اُس نے اپنی چُٹیا منڈوا ڈالی تھی۔ انگریزی بال رکھ لیے تھے اور دوسرے فیشن ایبل نوکروں کی طرح نیکر اور بُش شرٹ میں گھومتا تھا اور میتھلی کے بجائے بمبئی کی بازاری زبان میں گفتگو کرنے لگا تھا۔

جب لوگ اپنے ملک کی زبان اور تہذیب بھول جاتے ہیں تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ روٹی کپڑا مانگتے مانگتے جب لوگ اپنی ملازمت کے تیسرے سال ہی میں دس روپے تنخواہ کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ فوراً اُٹھ کر رِل اونرز ایسوسی ایشن کا ممبر بن جاؤں۔

ہم، ہندوستانیوں میں اگر کوئی کمی ہے تو صرف کردار کی اور جب تک فرد کا کردار اُونچا نہیں ہو گا یہ قوم کیسے اُونچی ہو سکتی ہے؟ مگر میں نے شیامو کو دس روپے دینا بھی منظور کر لیا۔ ایک تو اس لیے بھی کہ محلّے میں دوسرے نوکروں کی تنخواہیں اس سے کہیں زیادہ تھیں پھر یہ بات بھی ہے کہ نہ جانے کیوں میرے دل میں غریبوں کے لیے بڑا درد ہے۔ اس کے علاوہ شیامو گھر کے لوگوں کا مزاج خوب سمجھ چکا ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ گھر کے سب لوگ نوکر کا مزاج خوب سمجھ چکے ہیں، نیا نوکر آئے گا تو اُس کا مزاج سمجھنے میں بڑی دِقّت ہو گی پھر یہ بات بھی ہے کہ شیامو میں ہزار نقائص پیدا ہو گئے ہوں مگر وہ گھر کا کام بڑی دلچسپی سے کرتا ہے اور ہر وقت کام میں جُٹا رہتا ہے۔ کبھی بیمار نہیں پڑتا ورنہ بمبئی کا پانی تو ایسا خراب ہے کہ یہاں آ کر ہٹّے کٹّے نوکر بھی ہفتے میں دو بار بیمار پڑ جاتے ہیں اور مجھے صحت مند، چاق و چوبند لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔ فرد کی صحت پر قوم کی صحت کا دارومدار ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس!

شیامو کی ملازمت کے تیسرے سال ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اُن دنوں لکشمی کو چوتھا ماہ لگ رہا تھا اور وہ بے چاری آنے والے بچّے کے لیے کپڑے اور دیگر سامان تیار کر رہی تھی۔ اُس نے بڑی محنت سے خوب صورت سے ننھّے چھ فراک سیے کہ اُس میں سے دو فراک غائب ہو گئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اُن دو ننھّے فراکوں کو چُرانے والا کون ہو سکتا ہے؟ گھر بھر میں ڈھونڈ لیا لیکن فراک نہ ملے پل بھر کے لیے شیامو پہ شبہ کیا گیا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے ہنس کر یہ خیال دل سے دُور کر دیا گیا۔ اب اگر گھر کی کسی بڑے آدمی کا کپڑا کھوتا تو فوراً سب سے پہلے دھیان اُسی کی طرف جاتا۔

اس کے بعد منّے کے لیے ایک پیاری سی دُلائی جسے لکشمی نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے نگندا تھا اچانک گھر سے غائب ہو گئی۔ محلّے کی بوڑھیوں نے مشورہ دیا کہ کسی جھاڑ پھونک والے کو بُلانا چاہیے۔ ہو نہ ہو گھر پر کسی آسیب کا سایہ پڑ رہا ہے جو آنے والے بچّے کے لیے خطرناک ہے۔ لکشمی نے ڈر کر مجھ سے التجا کی۔ میں دراصل اس قسم کے ڈھکوسلوں پر یقین نہیں رکھتا مگر میں کسی دوسرے کے مذہبی عقائد میں دخل اندازی بھی نہیں کرتا پھر ہندوستان میں تو ایک لادینی ریاست قائم ہو چکی ہے۔ اس لیے میرے لیے یعنی ایک پُرامن شہری کے لیے یہ اور بھی لازم تھا کہ میں لکشمی کے عقائد کا احترام کرتے ہوئے پنڈت گردھر پرشاد کو گھر پہ دعوت دوں اور پنڈت گردھر پرشاد سات دن ہمارے گھر آ کر جاپ کرتے رہے جس سے گھر کی ساری فضا ایک دم بدل گئی۔ ماحول روشن روشن سا معلوم ہونے لگا۔ لکشمی کی دلی بشاشت عود کر آئی اور اس کے بعد سے

اس قسم کی چوریوں کا سلسلہ بھی یک لخت منقطع ہو گیا جس سے اس خیال کو مزید تقویت پہنچی کہ ہو نہ ہو گھر میں کوئی سایہ تھا جو پنڈت جی کے جاپ سے ڈر کر کہیں چلا گیا ہے۔

اُس دن سے میں نے گھر والوں کے مذہبی عقائد میں دخل دینا اور بھی کم کر دیا ہے بلکہ لکشمی کے پیہم اصرار پر دفتر میں اپنی ترقی کے لیے بھی پنڈت جی سے جاپ کرانا شروع کر دیا ہے حالانکہ اپنے خیال پر اسی سختی سے کاربند ہوں لیکن اگر میرے ایک ذرا سے جاپ کرانے سے گھر کی لکشمی خوش رہتی ہے تو میرا کیا حرج ہوتا ہے؟



تین ماہ بعد لکشمی نے یکایک شکایت کی "دودھ میں پانی ملا ہوتا ہے۔ دو دن سے دیکھ رہی ہوں، دودھ کا ذائقہ ہی بدل گیا ہے"

میں نے کہا "دودھ کا نہیں، تمھاری زبان کا ذائقہ بدل گیا ہے، اس حالت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

لکشمی بولی "یہ دودھ پی کر مجھے اُبکائیاں آنے لگتی ہیں۔"

"اُبکائیاں بھی آتی ہیں" میں نے تسلّی دے کر کہا "کیا اتنی جلد بھول گئیں؟"

"میں اندھی نہیں ہوں" لکشمی نے جل کے کہا "جو اچھے اور بُرے دودھ میں تمیز نہ کر سکوں۔ ضرور کوئی نہ کوئی اس دودھ میں ملاوٹ کر رہا ہے۔"

"سرکاری ڈیری سے سربمہر بوتل میں بند دودھ آتا ہے۔ یہ دودھ نخالص کیسے ہو سکتا ہے؟"

"دودھ ایک دم بُرا ہے" لکشمی نے جھلا کے کہا "تم خود چکھ کے دیکھو۔"

"شادی کے بعد میں تو دودھ کا ذائقہ ہی بھول گیا۔ بچوں ہی کے لیے پورا نہیں ہوتا، مجھے کیا معلوم ہو گا۔"

لیکن جب لکشمی کی بے چاری بڈھی ماں نے جو ہر دم گاؤ تکیے سے لگی لگی حکم چلایا کرتی تھیں اور نوّے سال کی عمر پر بھی مرنے کا نام نہ لیتی تھیں، دودھ کے متعلق شکایت کی تو مجھے غور کرنا پڑا۔ اگر غور کروں تو کیا کروں؟

گزشتہ تین سالوں میں شیامو نے ایک بار بھی دودھ کی چوری نہ کی تھی۔ ایک پائی کی چیز اِدھر سے اُدھر نہ کی تھی پھر اسٹیشن کے پاس جو سرکاری ڈیری کی شاخ ہے وہاں سے سربمہر بوتل آتی تھی۔ ہر روز صبح سات بجے شیامو ڈیری کی شاخ پہ جا کے کیو لگاتا تھا اور اپنی باری پہ بوتل لے کے گھر آتا تھا، گھر آ کر سب کے سامنے کھانے کی میز پر دودھ کی بوتل رکھ دیتا تھا۔ ہر شخص دیکھ سکتا تھا کہ مُہر سلامت ہے۔ اب ڈیری والے دودھ میں پانی ڈالتے ہوں تو دوسری بات ہے۔ اگر ایسا ہو تو محلّے والے دوسرے گھروں کے لوگ جہاں بھی اس سرکاری ڈیری سے دودھ آتا ہے، کیوں شکایت نہیں کرتے ہیں؟ اکیلی لکشمی ہی کو یہ شکایت کیوں ہے؟ ہو نہ ہو لکشمی کی زبان کا ذائقہ بدل چکا ہے اور وہ بڈھی ماں تو سٹھیا گئی ہیں یا اپنی بچی کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہیں اس لیے میں نے اچھی طرح سے سوچ ساچ



کے لکشمی کو ڈانٹ دیا لیکن جب میرے ڈانٹنے پر بھی لکشمی کی شکایت رفع نہ ہوئی تو میں نے شیامو سے کہہ دیا "آج سے دودھ کی بوتل میں خود لایا کروں گا، تم گھر کا دوسرا کام کرو۔"

شیامو کو بُرا تو بہت معلوم ہوا مگر فرماں بردار نوکر تھا۔ "اچھا جناب!" کہہ کے، سر جھکا کے کچن میں چلا گیا۔



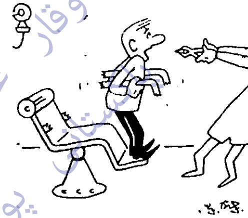
دوسرے دن صبح جب سات بجاتے بجاتے گھڑی نے آٹھ بجا دیے تو میں بہ ہزار دقّت پلنگ سے اُٹھ کے شادی کرنے کی حماقت پر لعنتیں بھیجتا ہوا کچن میں چلا گیا۔

کچن میں شیامو منہ بسورے کھڑا تھا۔ میں نے اُس سے ایک خالی جھولا طلب کیا۔ اُس میں دودھ کی خالی بوتل ڈالی، دودھ کا راشن کارڈ جیب میں رکھا اور اسٹیشن پر دودھ لینے کے لیے روانہ ہوا۔ دیر ہو چکی تھی اس لیے جب ڈیری کی شاخ پر پہنچا جہاں سے دودھ ملتا ہے تو وہاں نوکروں کا پہلے سے ایک لمبا کیو موجود تھا۔

میرے آگے ایک سانولی سُتھری، دبلی پتلی، نوکرانی تھی جس کے چہرے پر چھائیاں تھیں اور جو بڑی مشکل سے سانس لیتی تھی اور جس کے پیٹ میں غالباً نو ماہ کا بچّہ ہو گا۔ قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی بچّہ جن دے گی۔ اُس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور جب اُس نے مجھے اپنے پیچھے آ کر کھڑے دیکھا تو اُس کی آنکھیں ایک دم سے بجھ سی گئیں اور وہ بے حد پژمردہ اور اُداس سی نظر آنے لگی لیکن میں نے اس کا کوئی خیال نہ کیا کیوں کہ میں نے دیکھا ہے کہ صنفِ نازک پر مجھے دیکھ کر اسی طرح کا ردِّعمل ہوتا ہے۔ میں نے







اپنی پتلی سی گردن ذرا اونچی کی اور نگاہیں اُٹھا کے دیکھنے لگا کہ ابھی کیو کتنا باقی ہے۔ یکایک اُس لڑکی نے کہا "آج شیامو نہیں آیا؟"

میں نے بڑی نخوت سے جواب دیا "نہیں۔"

"نہیں" میں کچھ اس طرح کے جملے بھی شامل تھے، تم کون ہوتی ہو مجھ سے یہ سوال کرنے والی؟ میں نوکر پیشہ لوگوں میں سے نہیں ہوں، میں یہاں ہر روز دُودھ لینے نہیں آتا، میں اس قسم کے ذلیل کام خود نہیں کرتا، تمھاری یہ مجال کہ آج تم ایک نوکرانی ہو کر مجھ سے یوں بے تکلّفی سے سوال کر رہی ہو۔ صرف اس لیے کہ میں تمھارے پیچھے کیو میں کھڑا ہوں۔ کوئی بات نہیں ہے؟ میں اس کا علاج ڈھونڈ نکالوں گا۔ میں آج سرکاری ڈیری کے مینجر کو خط لکھتا ہوں کہ وہ ڈیری کی ہر شاخ پر دو کیو لگوائے، ایک نوکروں کے لیے، دوسرا مالکوں کے لیے، ورنہ لا اینڈ آرڈر کے لیے سخت خطرہ ہے! ہُونہہ!

اُس لڑکی نے بڑے ملتجیانہ انداز میں مجھ سے پوچھا "کیا وہ بیمار ہے؟"

"نہیں، بالکل ٹھیک ہے مگر آج سے وہ یہاں دُودھ لینے نہیں آئے گا۔" میں نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

وہ چُپ ہو گئی۔ وہ بار بار کبھی اپنا ایک پاؤں اُٹھاتی کبھی دوسرا۔ آرام لینے کی کوشش کرتی مگر کیو آخر کیو ہے۔ یہاں ہر شخص کی اپنی باری پر باری آتی ہے۔ آخر اُس کی بھی باری آ گئی اور اُس نے اپنے مالک کے گھر کے لیے ایک چھوٹی بوتل میں دُودھ لے لیا پھر میری باری آ گئی اور مجھے بڑی بوتل مل گئی۔ بوتل لے کے جب میں پلٹا تو وہ لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی اور ایسی گرسنہ نگاہوں سے دودھ کی بوتل کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے ایک ہی گھونٹ میں اسے پی جائے گی۔ اُس نے منہ سے تو کچھ نہ کہا لیکن اُس کا آگے بڑھا ہوا دستِ طلب کی طرح پیٹ گویا مجھ سے کہہ رہا تھا "میں خود تو کچھ نہیں چاہتی اور مجھے کچھ چاہیے بھی نہیں لیکن میرے اندر جو معصوم جان ہے یہ جو ظالم لوتھڑا ہے جو میرا دن رات خون چُوستا ہے، اس کی طلب کو میں کیا کروں؟ میں ایک غریب نوکرانی ہوں جسے خود پیٹ بھر کے روٹی نصیب نہیں ہوتی، پھر میں اس آنے والی جان کے تقاضے کیسے پورے کروں؟ یہ دُودھ مجھے دے دو ..... یہ دُودھ مجھے دے دو..... بھگوان کے لیے، اب صرف چند دنوں کی بات ہے، پھر بھگوان میرے سینے میں دُودھ اُتار دے گا..... پھر میں کبھی تم سے اس دُودھ کی بھیک نہ مانگوں گی۔"

میں نے دُودھ کی خالی بوتل جھولے میں ڈالتے ہوئے پوچھا "تم شیامو کو جانتی ہو؟"

"وہ میرا گھر والا ہے۔" لڑکی نے آہستہ سے کہا اور اُس کی بڑی بڑی پلکیں حیا سے رخساروں پر جُھک گئیں۔

میں یک بارگی چونکا، پھر کچھ دیر خاموش رہ کر وہاں سے پلٹ کر اپنے گھر جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ گھر پہنچتے ہی لکشمی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا، پوچھنے لگی "کیا معلوم ہوا؟"

"یہی معلوم ہوا کہ بہار میں قحط ہے، میتھلی ایک خوب صورت زبان ہے اور ہر نوکر ایک دل رکھتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے؟"

"مطلب یہ کہ کوئی امیر گھر سے ایک ننّھی سی دُلائی اس لیے چُراتا ہے کہ کسی کی بے آسرا جان کو تھوڑی سی حرارت مِل جائے۔ کوئی بھینس کے دُودھ میں پانی ملا کے اس لیے پلاتا ہے کہ کسی کی زندگی کو تھوڑا سا آبِ حیات مل جائے۔ لکشمی اس دنیا میں بچّوں کی دُلائیاں اور دُودھ کی بوتلیں اس قدر کم کیوں ہیں؟"

لکشمی کچھ نہ سمجھی، حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ میں کمرے سے باہر چلا آیا، باہر شیامو اپنا بستر باندھ رہا تھا اور نوکری چھوڑ کر جانے کے لیے بے تاب تھا۔ میں نے کہا "شیامو! کل سے دُودھ تمھی لایا کرو گے، میں نے تحقیقات کر لی ہے، تمھارا لایا ہوا دودھ بے حد میٹھا اور عمدہ ہے، صرف دنیا کا ذائقہ بدل چُکا ہے۔"





نذرِ وفا

اس کہانی کی سب سے بڑی خوبی اردو کی مشہور افسانہ نگار واجدہ تبسم کی چہکتی ہوئی تحریر ہے

موسم ہے جوانی کا سنبھالا ہی نہیں جاتے۔
موسم ہے جوانی......

ایسا سراپا جو کبھی بیان کی حدود میں نہ آسکے۔ زیورات سے بوجھل بدن، لچکتی شاخِ گل کی سی جوانی، انگ انگ سے چھلکتا نشہ، گلابی گلابی گال جو اب یوں سرخ ہو رہے تھے جیسے خون ٹپکنے ہی کو ہو۔ متوالی بل کھاتی زلفوں کے لچھے ماتھے پر جھولتے ہوئے، اور آواز! بس شعلے لپک رہے تھے اور اس پر مستزاد گیت کے بول 'موسم ہے جوانی کا...'

ناچ ختم ہونے پر نیلم نے جب جھک کر سلام کیا تو گریبان کچھ اور نیچا ہو گیا۔ چاندی کی لکیر بجلی کی طرح لہرائی جس نے نواب اختر کو لوٹ کر رکھ دیا۔

اردو ادب کی دوسری منتخب کہانی

جو محبت کے مدعی ہیں ان کے لیے ایک نواب کا فسانۂ عشق

یہ نہیں کہ نواب اختر ایسے شریف تھے کہ کبھی کسی بالاخانے کا رُخ ہی نہ کیا ہو۔ یہ بھی نہیں تھا کہ کبھی کسی طوائف سے مڈبھیڑ ہی نہ ہوتی ہو۔ وہ تو پشتوں کے نواب رئیس تھے، جن کے ہاں کے اُصول ہی یہ ہوتے ہیں کہ بچے تہذیب، گفتار، آدابِ محفل اور اُٹھنے بیٹھنے کے رکھ رکھاؤ سیکھنے سکھانے خاص طور سے طوائفوں کے ہاں بھجواتے جاتے ہیں۔ ان کی زندگی اب تک خانہ داری کے بکھیڑوں سے پاک تھی۔ عمر تیس سے بڑھ چلی تھی لیکن شادی کا بوجھ انھوں نے اب تک نہیں ڈھویا تھا۔ ہزاروں ہی لڑکیاں نظروں سے گزری تھیں۔ کوئی کوئی پسند بھی آئی تھی لیکن یوں بے طرح نہیں کہ اُسے اپنی زندگی کا ساتھی چن بیٹھتے۔ طوائفیں اتنی نظروں سے گزری تھیں کہ اگر شمار کرنے بیٹھتے تو صورتیں بھی یاد نہ آتیں مگر دل کسی کو نہ دیا۔ ویسے یہ تھی بھی واہیات بات کہ کسی طوائف کو بیوی بنا لیتے۔ ابا میاں کا کہنا تھا "پاؤں کی جوتی پاؤں ہی میں بھلی لگتی ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے شوق سے رات ساتھ گزار لو مگر آم کا رس چوس لینے کے بعد گٹھلی چھلکے کو کون منہ سے لگائے پھرتا ہے۔"

اور حقیقت بھی یہی تھی کہ نواب اختر نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے مگر یوں بھی ہو گیا۔ اُس دن جب وہ نیلم کے کوٹھے سے اترے تو اس طرح مرے مرے سے تھے جیسے برسوں کی بیماری جھیل کر اُٹھے ہوں۔ گیت کے بول ان کے کانوں میں اب تک گونج رہے تھے، نیلم کا جوانی سے بھرپور چہرہ، جس پر گمان ہوتا تھا کہ خوب چڑھا رکھی ہے، انھیں رہ رہ کر کوئی ہنگامہ کر گزرنے پر اُکسا رہا تھا۔ پھر اس کی کافر ادائیں، بھولا بھولا چہرہ جس پر طوائف ہونے کے باوجود بازاریت بالکل نہیں تھی۔ ایسا معصوم جیسے ابھی ابھی فرشتے جنّت کی کسی پاکیزہ نہر کے پانی سے منہ دُھلا گئے ہوں۔ ننھی سی ناک میں چمکتی ہوئی نتھنی اور پھر اس کا جھک کر سلام کرنا اور نیچے سے گریبان کا اونچے ہو جانا۔ ایک دم ان کا خون سنسنا اٹھا۔ "نہیں نہیں، یہ حق میرے سوا کسی اور کو نہیں پہنچنا چاہیے۔ یہ نظارہ عام نہیں ہونا چاہیے۔ نیلم کی نتھنی میں ہی اتاروں گا اور ایسے ویسے نہیں، بیوی بنا کر۔"

یہ آخری خیال اتنی تیزی اور پختگی سے اُن کے ذہن میں آیا کہ وہ اپنی ہمّت پر خود حیرت زدہ ہو گئے۔ اونچے اونچے گھوڑوں کی بگھّی کے جھکولوں میں ان کا سر اِدھر اُدھر یوں ڈولنے لگا جیسے کہہ رہے ہوں "نہیں نہیں۔" لیکن پھر انھوں نے زور سے سر جھٹک کر اپنے آپ میں گویا اعلان کیا۔ "نہیں کیوں؟ یہ ہوگا اور ہو کر رہے گا۔ بھلا کبھی ایسا ہوا ہے کہ نواب اختر نے کوئی بات سوچی ہو اور پوری نہ کی ہو؟"

رات کے کھانے کے بعد وہ چپ چپاتے، شرماتے شرماتے امّاں حضور کے خاص کمرے میں داخل ہوئے۔ بڑے بیٹے تھے اور امّاں حضور کے ایسے چہیتے اور لاڈلے کہ اگر وہ کہتے تو کلیجا بھی کاٹ کر کھلا دیتیں جس کی زندگی کی آس ہی لے دے کے دو بیٹوں پر ہو وہ ماں اور سوچ بھی کیا سکتی ہے؟ بڑے نواب کی تو ساری زندگی باہر گھنگرو والیوں ہی میں گزری تھی۔ اُن کی خوشیوں کا سارا مدار بس دو بیٹوں پر تھا۔ شیرنی کی طرح بارہ بارہ برس میں امّاں حضور نے دو ہی بیٹے پیدا کیے تھے۔ خود بھی کس بل میں شیرنی سے کیا کم تھیں اور بیٹے تو دونوں شیر تھے۔ اختر بڑے، اصغر چھوٹے۔

بیٹے کو آتے دیکھا تو ماں کے چہرے پر ممتا کا رنگ چھا گیا۔ خوش ہو کر پان دان ایک طرف سرکاتی ہوئی بولیں "میرے لال! کیسے آئے؟"

اوّل تو وہ خود مجرا دیکھ دکھا کر چڑھتی رات کو پلٹے تھے، پھر کھانا کھاتے کھاتے تک تو خوب رات بھیگ چلی تھی، ایسے میں اتنی رات کو ان کا ماں کے پاس آنا یقیناً کسی خاص بات کا پیش خیمہ تھا۔ وہ بات بنا کے بولے: "امّی جان! اب تک جاگ رہی ہیں آپ؟"

"ہاں بیٹا، وظیفہ ختم کر کے پان کھایا اور اب سونے ہی والی تھی بس۔ اچھا ہوا تم آ گئے، ورنہ یوں ہی لوٹ جانا پڑتا۔ تم بھلا مجھے نیند سے کیسے جگاتے؟"

امّاں حضور کے لہجے میں جو بے پناہ ممتا اور اعتماد تھا، اُس نے انھیں ایک لمحے کو ہلا دیا تھا مگر ہمّت کر کے بول ہی اُٹھے "امّی جان! میں آپ کو ایک دُکھ دینے آیا ہوں۔"

"دُور دُور۔" وہ خوشی خوشی سے بولیں۔ "ایک دُکھ کی کون بات ہے بیٹا! مجھے سو دُکھ دے دے مگر بول تو سہی۔ اتنی رات کو تیری نیندیں کس نے بے چین کر دیں؟" شاید ممتا خود ہر بات بھانپ جایا کرتی ہے۔

عشق کی بے کلی نے اُن سے خوف اور تکلّف چھین لیا۔ دھیمے مگر مضبوط لہجے میں بولے۔ "امّی جان! اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں نیلم طوائف سے شادی کر لوں؟"

ایک لمحے کو امّاں حضور چکرا سی گئیں۔ بیٹے نے اجازت لینے نہ لینے کی کوئی کسر ہی باقی نہ رکھی تھی۔ صاف سیدھے لفظوں میں بس یہی تو کہا تھا کہ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو..... مطلب یہ کہ اگر میں بُرا مانوں بھی تو وہ کرے گا وہی جو اس کے دل میں ہوگا۔ پھر خواہ مخواہ کی دھونس جمانے سے فائدہ؟ لیکن خاندان بھر میں یہ اندھیر کس نے کیا تھا کہ رنڈی کو بیوی بنا لیا ہو، یوں گھڑی دو گھڑی کو جی بہلا لینا اور بات ہے لیکن گندی نالی کے کیڑے کو عمر بھر کے لیے اپنی سیج کی زینت بنا لینا قطعی اور بات۔

یہ خاموشی دو چار لمحوں کی رہی ہوگی مگر نواب اختر کو یہ محسوس ہوا جیسے وہ برسوں سے امّی جان کے سامنے یوں ہی سر جھکائے بیٹھے ہیں اور وہ گردن نہوڑائے سروتے سے کھیل رہی ہیں۔ "امی جان!" انھوں نے بس اتنا ہی کہا۔

"بیٹا! تمھیں پتہ ہے، میری ساری عمر سوکنوں کا دُکھ جھیلتے گزری ہے۔ یوں بھی ہوا ہے کہ رات رات بھر باز و کے کمرے میں پائلیں چھنکی ہیں اور میں واہ واہ کے شور میں آنسو پیتی زندہ رہی ہوں لیکن یہ تم نے بھی دیکھا ہوگا کہ تمھارے ابا میاں نے میرے سوا شادی کسی اور سے نہیں کی۔ یہ

سوتیا ڈاہ بس رات کی رات ہی مجھے جلاتا رہا۔ ویسے میری ہستی کا شریک تو آج تک کوئی نہ ہوا تھا ایسے دادا حضور اور چچاؤں کے کارنامے تم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ تمھاری شادی بھی ماشاء اللہ سے اصغر میاں کی طرح ہو گئی ہوتی تو آج تم بھی تین چار بچّوں کے باپ ہوتے۔ ویسے عمر تمھاری بھی ماشاء اللہ اتنی ہے کہ تم بُرا بھلا سوچ سکو۔ سوچ لو۔ میرا کیا ہے، آج مری کل بسری۔ کل سب بھول بھال جائیں گے کہ ان جھلملاتی چلمنوں کے پیچھے کوئی دبدبے والی نواب بیگم بھی ہوا کرتی تھیں جن کی آواز ہی سے حویلی گونج کر رہ جاتی تھی میرا کچھ نہیں، تم اپنا سوچو۔ عمر بھر کو ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگا بیٹھو گے اور یہ بھی میں غلط کہتی ہوں۔ کلنک کے ٹیکے مردوں کے نہیں عورتوں کے لگا کرتے ہیں۔ سوال صرف نسل کا ہے۔ اگر رنڈی سے تمھاری کوئی اولاد ہوئی تو کیا تمھارے خاندان والے اسے برابری کا درجہ دیں گے؟ ارے بیٹا بازو بٹھاتے یوں نہ کسمسائیں گے جیسے پھوڑے سے بدبو آ رہی ہو؟"

اتنی دیر میں نواب اختر بھی جیسے جواب کے لیے خود کو تیار کر چکے تھے۔ تڑپ کر بولے۔ "امّی جان! میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ہر بات میں ایک ایک کا منہ تکا کرتے ہیں۔ بخدا میں آپ کی اولاد ہوں آپ کی۔ مجھے نہ خاندان کی پروا ہے نہ ناک کی۔ میں اس خاندان باندان کے چکر ہی سے نکل جاؤں گا۔ نیلم کو لے کر دُور کسی شہر چلا جاؤں گا جہاں کوئی نواب اختر کو پہچانتا ہو، نہ نیلم کو۔ پھر ہم نئے سرے سے ایک زندگی کا آغاز کریں گے امّی جان!"

لیکن امّاں حضور نے بیٹے کی بات کاٹ دی اور دھیمے لہجے میں بولیں۔ "یہ سب ٹھیک ہے بیٹے! مگر دُنیا میں نے بھی دیکھی ہے کیا تم خود ایک رنڈی سے نباہ کر لو گے؟"

نواب اختر نے بڑے اچنبھے سے ماں کو دیکھا۔ "امّی جان! یہ آپ کہہ رہی ہیں آپ! آپ اپنے بیٹے کو نہیں جانتیں؟ آپ جنھوں نے اسے اپنا خونِ دل پلا کر پالا پوس کر بڑا کیا۔ وہی ماں اپنے بیٹے کے مزاج سے واقف نہیں؟ کیا آپ نے نہیں آزمایا کہ میں نے جس چیز کے لیے ہٹ کی اُسے حاصل کر کے رہا۔ جس چیز کو اپنا لیا، اُسے کبھی الگ نہ کیا۔ جس راہ پر چلا، بس منزل پر پہنچ کر ہی دم لیا۔"

چوکیدار نے باہر پیتل کے گھنٹے پر ٹن ٹن دو کا عمل بجایا اور ماں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "بیٹا! مجھے خوشی یہ ہے کہ میں نے سدا اپنے رسولِ مقبولؐ کا فرمان نبھایا۔ کبھی کسی بچّے کا دل نہ توڑا۔ انھیں پھول ہی سمجھا اور اتنی ہی نرمی سے پیار کیا۔ میں اس معاملے میں بھی تمھارا دل نہ توڑوں گی لیکن۔" وہ رک کر بولیں۔ "نیلم، جسے تم بیوی بنانے پر تلے ہوئے ہو، کیا اس آسانی سے تمھارے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہو جائے گی؟ کیونکہ رنڈی کبھی بھی گھر گرہستن نہیں بننا چاہتی۔ اُسے تو صرف پیسہ عزیز ہوتا ہے اور عیش!"

"یہ مجھے خود پتہ نہیں امّی جان! لیکن اسی لیے تو آپ سے پہلے پوچھ لیا کہ اگر وہ راضی ہو جائے تو یہ نہ ہو کہ آپ ناراض رہیں۔ ویسے میں یہ سمجھتا ہوں امّی جان کہ وہ راضی ہو جائے گی۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو میاں؟"

"پتہ نہیں۔ ہو سکتا ہے، یہ میری خوش فہمی ہو یا خام خیالی کہ مجھے اس کے چہرے کے بھولپن، معصومیت اور آنکھوں کی بے بسی سے ایسا اندازہ ہوا کہ وہ خود یہ پیشہ پسند نہیں کرتی۔"

"خدا تمھیں خوش رکھے بیٹا!" انھوں نے ٹوٹی ٹوٹی آواز سے کہا۔ "جاؤ، اب سو رہو، بہت رات ہو چکی ہے۔"

اُٹھتے اُٹھتے انھوں نے اپنا آخری خدشہ بھی ظاہر کر دیا۔ "اور ابّا میاں کو پتہ چل گیا؟"

امّاں حضور ہنسیں۔ "انھیں اُن کے مشغلوں سے فرصت ملے تب نا۔ اور پھر جب تم شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو یہ بہانا بھی گھڑا جا سکتا ہے کہ تم نوابی سے تنگ آ کر بزنس وغیرہ کے سلسلے میں دُور جا کر بس گئے ہو۔"

ایک دم نواب اختر کی آنکھوں سے جلتا جلتا پانی اُبل پڑا۔ یہ ماں، یہ محبت کرنے والی عظیم ماں، جس نے مجھ سے بڑا بیٹا ہونے کے ناتے کیسی کیسی امیدیں اور ارمان نہ جوڑ رکھے ہوں گے، مامتا کے ہاتھوں کس قدر بے بس ہے کہ وہ ہر بات کر گزرنے کے لیے آمادہ ہے جس سے میرے دل کو ہلکا سا بھی سکھ پہنچ سکے۔ انھوں نے چاہا کہ اپنا سر جھکا کر ان کے قدموں میں رکھ دیں۔ پھر انھیں خود ہی ایسا لگا کہ یہ امّاں حضور کی ممتا کی بڑی سخت توہین ہوگی اور وہ دل کا درد دل میں دبائے کمرے سے نکل گئے۔

نواب اختر کی رات بڑی بے کلی سے کٹی تھی۔ مامتا کا روپ، وہ روپ جو اولاد کی خاطر ہر قربانی دینے کو تیار ہو جاتا ہے، انھوں نے رات دیکھا تھا، وہ انھیں رُلا چھوڑنے کو بہت کافی تھا مگر صبح ہوتے ہوتے ان کے جذبات اور دل دونوں معمول پر آ چکے تھے اور عشق کا گہرا رنگ پھر ان پر غالب تھا۔ شام پڑتے ہی کسی دوست مصاحب کے بغیر ہی وہ اکیلے بگھی میں چڑھ کے نیلم کے ہاں جا پہنچے۔

ملکہ جان بڑے کلّے ٹھلّے سے پان دان سنبھالے سامنے والے کمرے میں براجمان تھیں۔ نواب اختر کو دیکھ کر ادب اور چاپلوسی کے مارے دُہری ہو گئیں۔ جانتی تھیں کہ شہر کے سب سے بڑے نواب ہیں اور ایسی آسامی مشکل ہی سے نصیب ہوتی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھیں۔ یہ بھی جانتی تھیں کہ نیلم کی نگاہ کا وار سیدھا دل تک اترتا چلا گیا ہے۔ اسی لیے وہ اور خوش تھیں کہ چلو اب تو ٹھاٹ ہی ٹھاٹ ہیں۔ نواب اختر نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "نیلم کہاں ہیں؟"

وہ خواہ مخواہ کی خوشامدی ہنسی ہنس کر بولیں۔ "اے حضور! اتنا بھی نہیں جانتے کہ گانے ناچنے والیوں کا یہ وقت بناؤ سنگھار کا ہوتا ہے۔ کہیں کوٹھے پر ابھی تو بال سکھاتی ہوں گی۔ سنگھار کر لے، ابھی حاضر ہوتی ہے۔"

"اتنی شام کو بال سکھا رہی ہیں؟" نواب اختر ذرا ناگواری سے

بولے۔

"جی ہاں حضور، آج اُس کا جی ذرا ماندہ تھا، دیر سے نہائی ہے۔"

"لیکن میں تو ان سے اسی وقت ملنا پسند کروں گا۔" نواب اختر کسی اڑیل اور ڈھیٹ سے بچّے کی طرح بولے۔

بائی جی ان کی انگلی میں جگمگاتا ہیرا للچائی نظر سے دیکھتی اور اٹھتی ہوئی بولیں "جو مرضی سرکار کی۔"

نیلم جس انداز سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے کل سے زیادہ آج انھیں تباہ کر کے رکھ دیا۔ سادگی کی تصویر۔ سادگی بھی کیسی؟ لمبے لمبے کھلے کھلے، سیاہ گیسو جن سے اِکّا دُکّا پانی کا قطرہ جھل مل موتی کی طرح ٹپک ٹپک جاتا تھا۔ نہ آنکھوں میں کاجل، نہ رُخ پہ غازہ۔ ہاتھ چوڑیوں اور انگشتریوں سے بے نیاز۔ سڈول پنڈلیوں پر غلاف کے مانند چڑھا ہوا سفید تنگ الماس کا پاجامہ، گھیر دار سفید کُرتا اور سفید اوڑھنی۔ نواب اختر اس بے پناہ سادگی اور حُسن سے مبہوت ہو کر رہ گئے۔ کتنی ہی دیر تو انھیں بات کرنے کا یارا نہ رہا۔ نیلم نے جب میٹھی اور پیاری سی آواز سے انھیں مخاطب کر کے "جی فرمایئے" کہا تو ان کی محویت ٹوٹی۔ وہ ہڑبڑا سے گئے "بیٹھو بیٹھو!" وہ ذرا سسکتے ہوئے بے حد بڑے پن اور اپنائیت سے بولے۔

"کھڑی رہ کر یوں بجلیاں نہ گراؤ۔"

ایک دم نیلم کی آنکھوں میں آب دار موتی سے دو آنسو اُمڈ آئے۔

بے حد دُکھ اور اپنائیت سے وہ اتنا ہی بول سکی۔ "میں تو آپ کو ایک نظر دیکھ کر یہ سمجھی تھی کہ آپ اوروں سے الگ ہوں گے لیکن آپ نے بھی بالکل عام مردوں کی سی بات کہی اور یہی سمجھ کر کہی نا کہ میں طوائف ہوں؟"

نواب اختر حد درجے سراسیمہ اور پریشان ہو گئے، ہکلا کر بولے۔

"م... م... میں نے کیا کہا؟"

وہ اسی انداز سے بولی "اگر آپ مجھے ایک گھریلو عورت سمجھتے تو کبھی بجلیاں گرانے کی بات نہ کرتے۔ آپ یوں بھی مجھے بیٹھنے کو کہہ سکتے تھے نا؟"

نواب اختر کے ذہن میں ایک چاند سا چمکا۔ یوں۔ جیسے بچّے کو پچکارتے ہیں۔ پیار اور نرمی سے بولے "کیوں، تمھیں اپنی یہ زندگی پسند نہیں؟"

نیلم نے اِدھر اُدھر ڈری ہوئی نگاہوں سے دیکھا پھر دھیرے سے کہا "کیا چہرہ دل کا آئینہ نہیں ہوتا؟"

"آئینے کبھی کبھی دھوکا بھی دے جاتے ہیں۔" وہ سانس بھر کر بولے۔

ایک دم نیلم جھکی، اتنا جھکی کہ اس کی جوانی اور بے پناہ خوبصورتی اپنی تمام تر گرمیوں کے ساتھ نواب اختر کو جھلسا گئی۔ چہرہ ان کے قریب سے قریب لا کر بولی "بتایئے اس آئینے میں کس جگہ دھبّا ہے؟ صاف روشن، کتاب کی طرح کُھلا ہوا ایسا آئینہ دھوکا دے سکتا ہے نواب صاحب؟

پھر وہ سمٹ کر وہیں بیٹھ گئی اور بُری طرح رونے لگی۔ "یقین کیجیے ان برسوں میں کتنے ہی مرد اس کوٹھے پر چڑھے ہوں گے لیکن جو اپنائیت اور پیار میں نے کل صرف آپ کے چہرے پر دیکھا، وہ کبھی نہیں دیکھا، کہیں نہیں دیکھا۔"

نواب اختر ایک لمحے کو پریشان سے ہو گئے لیکن ایک گہری حسرت نے ان کا پریشان چہرہ شاداب کر دیا۔ تو تو کیا میری طرح نیلم بھی محبت کا شکار ہو گئی؟ یہ تو بڑی عجیب واردات ہو گئی۔

نیلم بے حد سچّائی بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی "کل آپ کو دیکھا تو یُوں لگا جیسے دل میں بہت سارے پھُول یک بارگی چٹک اُٹھے ہیں۔ رات بھر سوچتی رہی کہ کہیں میں پاگل تو نہیں ہو گئی ہوں لیکن جب دل میں جھانکا، یہی لگا کہ ایک چور دروازہ، جو اب تک بند تھا، کھُل گیا ہے اور اس میں کوئی اس طرح داخل ہو گیا ہے کہ اب جانے کی راہ ملتی ہی نہیں۔" اور اس نے خود ہی شرما کر سر جھکا لیا۔

نواب اختر کچھ آگے جھکے اور رازداری سے بولے "ہماری دُلھن بنو گی؟"

نیلم نے گھبرائی ہوئی ہرنی کی طرح خوب صورت آنکھوں سے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کوئی آتا نہ ہو، کچھ سُنتا نہ ہو، پھر تڑپا دینے کے انداز میں بولی "لیکن ایک رات کی نہیں، زندگی بھر کی۔"

نواب اختر کا دل پھول کی طرح کِھل اُٹھا لیکن شبہے کی ایک پرچھائیں اُن کے چہرے پر ڈولی۔ "بائی جی اجازت دے دیں گی؟"

نیلم نے دوسرا ہی جواب دیا۔ "میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟"

نواب اختر نے مبہوت ہو کر نیلم کو دیکھا۔ وہ کیا کہہ سکتے تھے کہ تم مجھے کیسی لگتی ہو۔ شاید دُنیا میں آج تک وہ الفاظ ہی تخلیق نہیں ہوئے تھے جو نیلم کی صحیح تعریف کر پاتے۔ یا الفاظ مل گئے ہوتے تو زبان میں اتنی اہلیت نہیں تھی کہ وہ بول ادا کر بھی دیتی جو دل میں دبے ہوئے تھے۔ وہ بے حد بچکانے پن سے بولے۔ "اتنی اچھّی لگتی ہو کہ زندگی میں آج تک کوئی اچھّا نہ لگا تھا۔ اسی لیے تو دُلھن بنانا چاہتا ہوں۔"

"یہی میں بھی آپ کو بتانا چاہتی تھی کہ جب ایک طوائف ایسی ہو کہ عمر بیس کے لگ بھگ ہو، حسن میں اس کا ثانی نہ ہو، پڑھی لکھی ہو، محفل کے آداب سے واقف ہو، ناچ گانے میں ماہر ہو اور پھر مُفت کا مال ہو تو ہر ایک گاہک اسے دُلھن بنانا چاہتا ہے مگر ایک رات کی دُلھن، اور اُس رات کا مول جب دس دس ہزار میں آ جاتا ہو تو کون سی دل والی بائی جی ایسی سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو اپنے سے الگ کرنے کی سوچ بھی سکتی ہے؟ آپ کتنے بھولے ہیں!" وہ بڑے پیار سے ہنس پڑی۔

نواب اختر نے بہت غور سے اس کی بات سُنی اور بڑے تعجب سے پُوچھا: "مفت کا مال؟ میں سمجھا نہیں۔"

"مفت کا مال یوں نواب صاحب کہ پتہ نہیں میں کن بدنصیب ماں باپ کی اولاد ہوں کہ بچپن ہی سے مجھے ان سے جُدا کر دیا گیا۔ سوچتی ہوں تو کچھ بھی یاد نہیں آتا، ایک دھندلی سی تصویر کے سوا۔ میں ایک بڑے سے میلے میں اپنے ابا کی انگلی پکڑے گھوم رہی ہوں کہ بھیڑ بھڑکے میں وہ محبّت بھرا ہاتھ اور ساتھ مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔ پھر جو آنکھ کھلی تو اسی طبلے اور گھنگرو والے ماحول میں خود کو دیکھا۔ انھی بائی جی نے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا۔ کبھی پیار سے، کبھی سختی سے۔ اور اس راستے پر لاکھڑا کیا۔ ظاہر ہے، مفت کا مال ہوں کہ جتنی بھی آمدنی مجھ سے ہوتی ہے، ساری ان کی تجوری میں جاتی ہے۔ میں تو دو وقت کی روٹی کے سوا اور کسی قسم کا مطالبہ کرتی ہی نہیں۔ کروں بھی کیا؟ مجھے نہ پہننے کا شوق ہے اور نہ اوڑھنے کا۔ بس یوں سمجھیے کہ انگلی پکڑ کر جہاں وہ چاہیں، لے جائیں مگر یقین کیجیے اندر والا دل ان تمام باتوں پر نہیں مانتا۔ پتہ نہیں کیوں جب سے ہوش سنبھالا ہے، ایک ہی خواہش دل مسوستی رہتی ہے کہ ایک چھوٹا سا گھر ہو، اپنا شوہر ہو جو کبھی محبت کرے کبھی ڈانٹ بھی دے، چھوٹے چھوٹے دو تین بچے ہوں جو صاف ستھرا گھر ننھے ننھے گندے پیروں سے بار بار گندا کریں اور میں صاف کرتی پھروں۔ خود ہی کام کروں، پکاؤں، پیسوں۔ خود ہی تھک جاؤں اور میاں سے شکایت گزار ہوں کہ تمھارا تو مجھے کوئی آسرا ہی نہیں۔ گھر بھی دیکھوں، چولھا چکی بھی سنبھالوں، بچّوں سے بھی نبٹوں! آخر دُنیا کے اور مرد بھی تو ہوتے ہیں جو بیویوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔" اور اس نے یہ سب کہتے کہتے سر اٹھا کر یوں نواب اختر کو دیکھا جیسے وہی اس کے شوہر ہوں اور ان سے وہ سچ مچ گلہ کر رہی ہو۔

نواب اختر کے دل میں چھپے ہوئے حاسد مرد نے سر اٹھایا "ویسے تو تم کہتی ہو یہ زندگی پسند نہیں مگر کل ایک بازاری سا گیت تو بہت لہک لہک کر گا رہی تھیں؟"

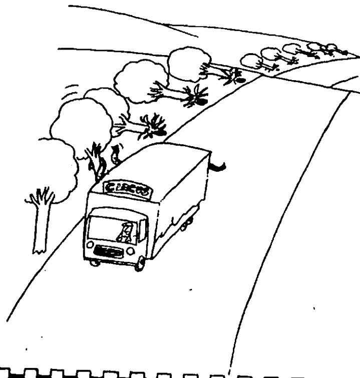
نیلم کے چہرے پر آنسوؤں بھرا کرب چھا گیا، سسک کر بولی "وہ مجھ سے مار برداشت نہیں ہوتی۔"

"مار؟" نواب صاحب تڑپ کر بولے۔ "بائی جی تمھیں مارتی ہیں؟"

"ہاں!" وہ روتی ہوئی بولی۔ "رونی صورت سے گیت گا کر ناچوں تو دام نہیں ملتے اور جس دن دام نہیں ملتے، میری چمڑی اُدھیڑ دی جاتی ہے۔" روتے روتے وہ ہنس دی، جیسے بھری برسات میں دھوپ چمک جائے "بتایئے یہ بھی کوئی زندگی ہے؟"

انھوں نے اس کا ننھا سا گلابی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا "میں تمھیں ایک حسین زندگی دینے کا وعدہ کرتا ہوں نیلم۔"

لیکن نیلم نے خوش ہونے کے بجائے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "مشکل ہے نواب صاحب! بہت مشکل! ہم لوگ گندی موری کے کیڑے



ہوتے ہیں۔ کسی مرد نے آج تک یہ ہمّت نہیں کی کہ اس کیڑے کو اپنی زندگی کا ساتھی بنالے۔ وقتی ولولہ اور چیز ہے۔ ہمیشہ ساتھ نبھانے کا حوصلہ اور چیز ہے۔ میں ماضی میں جو کچھ بھی تھی مگر اب تو رنڈی ہی کہلاؤں گی۔ کیا میں نے آپ کے خاندانی شجرے اور دبدبے کے بارے میں سُنا نہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک خاندانی نواب ایک طوائف کو بیوی بنالے یا بنائے تو نباہ بھی کرلے؟ بہت کچھ کھونا پڑتا ہے نواب صاحب! جائیداد، روپیہ، عزت، شہرت، ماں باپ کی محبتیں، ایک دُنیا تیاگ دینی پڑتی ہے۔ ایسا تو مجھے دُنیا میں کوئی نظر نہیں آتا۔"

"ڈیوک آف ونڈسر کے بارے میں کیا خیال ہے تمھارا؟ اُن کا نام تو سُنا ہو گا کبھی۔"

نیلم نے نواب اختر کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ اس کا چہرہ جذبات کی شدّت سے سُرخ ہو اُٹھا تھا۔ آواز منہ سے نکلتی نہیں تھی مگر وہ زبردستی بولے جا رہی تھی "مجھے آپ کی محبت پر پُورا پورا یقین ہے نواب صاحب اس لیے کہ آپ نے خواب اور خیال کی باتوں کی مثال نہیں دی۔ آپ حقیقت پرست ہیں۔ اسی لیے تو آپ نے ڈیوک کی مثال دی۔ اتنی سی بات آپ پر ایمان لانے کے لیے بہت کافی ہے۔ میں آپ کی پاکیزہ اور سچّی محبت کے آگے سر جھکاتی ہوں۔" اور سر جھکاتے جھکاتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اتنے میں کئی بار بائی جی پھیرے مار چکی تھیں اور دونوں کو مصروفِ راز و نیاز دیکھ کر بے حد خوش ہو رہی تھیں کہ چلو موٹی اسامی پھنس گئی۔ جب فانوسوں میں رکھے ہوئے مومی چراغ جل اُٹھے تو بائی جی کھنکارتی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئیں اور خوشامد سے بھری چکنی چکنی ہنسی ہنس کر بولیں "اے لڑکی! کچھ دھیان بھی ہے کہ وقت کدھر سے کدھر ڈھل گیا؟ کپڑے گہنے بدلنے ہیں یا نہیں؟ بیٹھکے میں کتنے ہی لوگ جمع

ہو گئے ہیں۔"

اور اس جملے کے ساتھ خاص طور سے انھوں نے کنکھیوں سے نواب اختر کی طرف دیکھا کہ چہرہ کیا کہتا ہے۔ نواب اختر کے چہرے پر ناگواری کی ایک دبیز تہ سی چھا گئی۔ جز بز ہو کر بولے "آپ ہمارے کہنے سے آج کی رات سب کو لوٹا دیجیے۔"

وہ مکارانہ ہنسی ہنسیں۔ "اے حضور کا کہنا سر آنکھوں پر، مگر۔" وہ رکیں، پھر بولیں "آج کا ناچ اور گیت سننے کے وہ لوگ پہلے ہی ہزاروں روپے دے چکے تھے جو خرچ بھی ہو چکے۔ اب کس منہ سے انھیں واپس پھیر دوں؟"

"کتنے روپے تھے؟" وہ بے پروائی سے بولے۔

انگلیوں پر بناوٹی حساب جوڑ کر باجی جی بولیں۔ "سب کے ملا کر یہی کوئی سات ہزار بنتے ہیں۔"

نواب اختر نے کرتے کی جیب سے جھل جھلاتا بٹوا نکالا اور باجی جی کی طرف اچھال کر ناگواری سے بولے۔ "زیادہ ہی ہوں گے، گن سکتی ہیں آپ۔"

مطلع صاف ہو گیا تو وہی نکھری نکھری پیاری پیاری صورت آنکھوں کے سامنے تھی۔ نواب اختر نے بے چینی سے پوچھا "مگر اس دوزخ سے نکلنے کی کیا صورت ہو گی؟"

کچھ دیر سوچنے کے بعد نیلم بولی۔ "بس ایک ہی راہ ہے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے باجی جی کبھی مجھے درگاہ جانے سے منع نہیں کرتیں اور اکثر میں اکیلی بھی چلی جاتی ہوں۔ بس وہیں سے کوئی راہ سوچی جا سکتی ہے۔"

نواب اختر خوش ہو کر بولے۔ "یہ تو بڑی آسان سی بات ہے تم ایک دن مقرر کر لو کہ کس دن درگاہ جاؤ گی۔ اندر سے باہر آؤ گی تو میری بگھی تمھاری منتظر رہے گی۔ پروگرام کے مطابق تم حویلی پہنچا دی جاؤ گی۔"

اور پھر دبی دبی خوشی ان کے چہرے سے پھوٹ پڑی۔ "پھر.... پھر تم ہمیشہ کے لیے میری ہو جاؤ گی۔"

نیلم نے خواب ناک انداز میں کہنا شروع کیا۔ "یہ صرف کل ہی کی بات تو ہے نا کہ آپ سورج بن کر آ گئے اور میری تاریک دنیا جگمگا گئی۔ کل اور آج کا فاصلہ کتنا کم ہے مگر کوئی میرے دل سے پوچھے کہ اجنبیت اور بیگانگی کے سارے پردے کس طرح ایک ایک کر کے اٹھ گئے ہیں۔ مجھے بخدا اب بھی یقین نہیں آتا کہ یہ جو کچھ ہونے والا ہے، حقیقت ہے۔"

اس نے اپنے چمکیلے دانتوں تلے زور سے انگلی دبائی۔

نواب اختر نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "کیا حماقت کرتی ہو۔ کبھی خون نکل آیا تو؟"

"اس محبت کے انداز پر میری سو جانیں ہوں تو وہ بھی نثار۔ زندگی میں اس بات کی کب توقع تھی کہ ایسی چاہت بھی مجھے نصیب ہو گی!"

اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

"اچھا تو اگلی جمعرات کو تم درگاہ پہنچ رہی ہو نا؟" نواب اختر نے زندگی بھر کی خوشیاں لہجے میں سمیٹ کر کہا۔

"انشاء اللہ پورا بھروسا رکھیے۔"

"تو پھر میں چلوں؟"

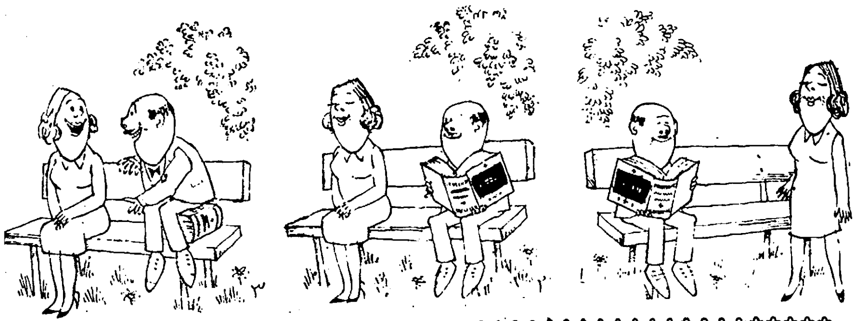
"آج تو جی چاہتا ہے کہ وقت یہیں تھم جائے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو لمحہ بہ لمحہ سرکتا چاند پکڑ کر اپنے ماتھے پر جھومر بنا کر سجا لیتی کہ وہ وہیں اٹک کر رہ جائے۔ دم بدم چمکتے ستارے توڑ کر اپنی اوڑھنی میں کام دانی بنا کر ٹانک لیتی کہ رات یہیں رک جائے لیکن مجھے خوشی تو یوں بھی ہے کہ ان گزرتی گھڑیوں کے ساتھ ساتھ میری زندگی کی ابتدا اور خوشیاں قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی ہیں۔ خدا حافظ! اللہ نگہبان!" نیلم کے لہجے میں محبت کرنے والی بیوی کا سارا پیار سمٹ آیا تھا۔



سیاہ برقع میں لپٹی لپٹائی نیلم درگاہ سے نکلی اور حویلی سے آئی ہوئی بگھی میں جھکتے لرزتے قدموں سے مگر دل میں گہرا اعتماد لیے یوں دھیرے دھیرے چڑھی جیسے نئی نئی دلھن پالکی میں سوار ہوتی ہے۔ ایک لمحے کو اس کا دل زور سے ڈگمگا گیا کہیں ایسا نہ ہو کر چولھے سے نکل کر بھٹی میں جا پڑوں؟ پھر کیا ہو گا؟ وہی در در کی ٹھوکریں، وہی نصیبوں کی مار لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے یہ فاسد خیالات ذہن سے جھٹک دیے اور گھر گرہستی کے سہانے خواب بننے لگی۔ نواب اختر سب کچھ ہو سکتے تھے لیکن دغا باز نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے چہرے کی شرافت نے یاد آ کر اپنے آپ ہی اسے شرمندہ کر دیا۔



نواب اختر کو پیچھے چھوٹ آنے والا زمانہ بالکل یاد نہ رہا۔ یہ بھی یاد نہ رہا کہ امی جان کیسی عظیم محبت کرنے والی خاتون ہیں کہ اتنا بڑا حادثہ وہ یوں برداشت کر گئیں کہ نہ صرف بہو کا منہ دیکھا بلکہ وہ بھاری اور ٹکول کام دار جوڑے اور وزنی زیورات تک سونپ دیے جو اس لیے سینت کر رکھے تھے کہ کسی خاندانی، بڑے نواب گھرانے کی بہو لاؤں گی تو چڑھاوے میں لے جاؤں گی۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ جب انھوں نے ابا حضور نے نیلم کو ساتھ لے جا کر یہ کہا تھا "ابا حضور! یہ آپ کی بہو ہے" تو وہ کس طرح منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے تھے اور ان کا بھاری بھرکم وجود کس طرح خزاں کے مارے ہوئے پتے کی طرح لرز لرز اٹھا تھا۔ انھیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ خاندان بھر میں اور جان پہچان والوں میں کس طرح تھڑی تھڑی مچ گئی تھی کہ رنڈی کو بیوی بنا لیا ہے۔ انھیں صرف یہ یاد تھا کہ انھوں نے جو سوچا تھا، کر لیا تھا۔ محبت جیت لی تھی۔ ان کی بیوی کو دنیا والوں کے



طعنے تشنے کا سامنا نہ کرنا پڑے' اس خیال سے وہ اپنا آبائی وطن چھوڑ کر اتنی دور بمبئی آبسے۔ اس لیے کہ اسی طرح وہ اپنے دل کی ملکہ کو خوش رکھ سکتے تھے۔ انھوں نے جو سوچا تھا، کر دکھایا۔ ان کی تمام زندگی کا مصرف بس یہ رہ گیا تھا کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ خوشی دیں اور یہ حقیقت ہے کہ اب، جب کہ زندگی کے کتنے ہی ماہ و سال گزر چکے تھے' وہ آج بھی اسی والہانہ انداز سے چاہے جا رہے تھے۔ انھوں نے اپنے جان پہچان کے لوگوں سے بالکل ناتا توڑ لیا تھا کہ کہیں وہ آئیں اور کوئی چھوٹی سی ایسی بات بھی کر جائیں جس سے ان کی بیوی کا دل دکھ جائے اور اسے یہ یاد آجائے کہ وہ اُسے بیوی کا درجہ نہیں دیتے۔ انھوں نے اس کا نام بھی بدل دیا۔ نیلم سے بازاریت کی بُو آتی تھی۔ اب وہ اُسے تتلی کہتے تھے۔

ایک دن تتلی نے اُن سے پوچھ لیا۔ "پتہ نہیں کیا بات ہے۔ حقیقت ہے یا میرا وہم، بہرحال مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ نے کوئی خوشی کھو دی ہے؟"

"کیا کہہ رہی ہو جان! میں نے کوئی خوشی کھوئی ہے؟ ارے میں نے تو تمھیں پاکر ایک دُنیا پالی ہے۔ کیا کھویا کیا پایا، اس کا حساب تو مجھی کو معلوم ہے۔"

تتلی اداس ہوگئی، بولی۔ "میں نے تو سبھی کچھ پالیا ہے لیکن خدا اگر اولاد بھی دے دیتا تو میری ساری زندگی سنور جاتی۔ پھر میں شاید دنیا کی سب سے خوش نصیب عورت ہوتی۔"

"ممکن ہے، اولاد نہ دے کر خدا نے اچھا ہی کیا ہو۔" نواب اختر ذرا آزردگی سے بولے۔

زندگی میں پہلی بار تتلی کے دل میں کسی نامعلوم شبہے نے سر اٹھایا چونک کر بولی۔ "کیوں؟ یہ بات آپ نے کیسے کہی؟"

"نہیں، ایسے ہی کہہ دی۔" نواب اختر ٹال گئے۔ "کوئی خاص بات نہیں۔"

"اتنی بڑی بات ایسے ہی نہیں کہہ دی جاتی۔ آپ کے دل میں جو ہے، آپ صاف کہتے کیوں نہیں؟ یہی نا، ہمارا بیٹا بڑا ہوتا اور لوگ انگلی اٹھا کر کہتے کہ یہ رنڈی کے بطن سے ہے تو شاید وہ برداشت نہ کر پاتا۔ کیوں، میں نے جھوٹ تو نہیں کہا نا؟"

نواب اختر گھبرا گئے۔ میرے دل میں گھس کر اس نے کیسے بات کی تہہ پائی؟ کیا اتنے دنوں میں بھی ایک بچّے کے بارے میں نہیں سوچتا رہا اور کیا ہر بار یہی خیال میرے ذہن کو کچوکے نہیں دیتا رہا؟ وہ بلند آواز سے بظاہر ہنس کر بولے۔ "کمال کرتی ہو تم بھی۔ جو دل میں آئے، سوچ لیتی ہو اور پھر اس پر رونے بھی لگتی ہو۔" انھوں نے سسکتی ہوئی تتلی کو سینے سے لگا لیا۔

اس دن کی آزردگی نواب اختر کو ایسی لپٹی کہ اب ان کا زیادہ وقت اداس اداس ہی گزرتا۔ کام دھام تو انھیں پہلے بھی نہیں تھا۔ اب بھی وطن سے ایک بندھی ہوئی آمدن پہنچ جاتی تھی لیکن زندگی میں سُونے پن کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جاتا تھا۔ ویسے دیکھا جائے تو مرد آدمی کے لیے یہ بات ہے بھی بے ڈھب کہ خالی بیٹھا رہے۔ زندگی میں کچھ نہ کچھ مصروفیت تو ہونی ہی چاہیے لیکن نواب اختر کا یہ تھا کہ چونکہ نواب تھے تو کام تو کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ کنوار پن میں البتہ شکار، کبھی شطرنج، کبھی کھیل تماشے اور کبھی اِدھر اُدھر تانک جھانک کر لیتے تھے لیکن اب تو سب کچھ تج دیا تھا۔ حد یہ کہ کبھی کبھار کیرم پر آکر ٹک گئی تھی، تو وہ بھی بیوی سے ایک آدھ بازی کھیل کر اکتا جاتے تھے۔ لے دے کے اتنا مشغلہ رہ گیا تھا کہ کبھی دل نہ لگے تو کار میں بیوی کو بٹھا کر بمبئی کی چکنی چکنی، لمبی لمبی سیاہ سڑکوں پر لمبی ڈرائیو کے لیے نکل گئے لیکن چند روز سے وہ اس طرف سے بھی بددل ہو گئے تھے ان کی صحت بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔ ویسے تو عمر کا بھی تقاضا تھا لیکن بال کچھ زیادہ تیزی سے سفید ہوتے جا رہے تھے۔ دھیرے دھیرے ان کے سینے میں بھی درد رہنے لگا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے دل پکڑ لیتے۔ تتلی ان کی یہ حالت دیکھتی مگر کچھ سمجھ نہ

باتی کیونکہ ان کے تعلق سے وہ محبت کے سوا اور کچھ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ایک دن انھیں زیادہ ہی تکلیف تھی۔ پتلی انھیں بے حد مجبور کرکے خود بمبئی کے بڑے اسپتال لے گئی۔ وہاں ان کے معائنے ہوئے اور اگلے ہفتے پھر بلایا گیا۔ اسی طرح کئی بار آنے جانے اور کئی معائنوں کے بعد ایک دن انھیں یہ سنایا گیا کہ انھیں کینسر ہو چکا ہے۔ کچھ تو مرض ہے ہی تکلیف دہ، پھر اس کے علاوہ یہ احساس کہ میں کینسر کا مریض ہوں، نواب اختر بالکل ہی بستر سے لگ کر رہ گئے۔ مارے تکلیف کے ان کا چہرہ ذرا سا نکل آیا۔ پتلی نے خدمت گزاری میں دن رات ایک کر دیے۔ جب دیکھو بستر سے لگی کھڑی ہے۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ جب بھی نواب اختر کی آنکھ کھلتی، دیکھتے کہ پتلی پاس ہی بیٹھی ہے۔ وہ اسے بار بار سونے کو کہتے مگر وہ ٹال جاتی۔ حد یہ تھی کہ دن میں بھی نہ سوتی۔ مسلسل جاگنے سے یہ ہوا کہ اس کی نیند ہی اُڑ گئی۔ اب تو اگر وہ سونا چاہتی بھی تو شاید ہی آنکھیں جھپک پاتیں۔

بس ایک دُھن اور ایک ہی دُعا تھی کہ "اے خدا تو میرا سُہاگ لازوال کر دے۔ ان کے سارے دکھ مجھے دے دے۔ ان کی بیماری مجھے دے دے" لیکن جس کے دکھ ہوں اُسی کو بھگتنے پڑتے ہیں۔ نواب اختر گھُلتے گئے۔

ایک دن پتلی نے اپنی ایک سہیلی کے رائے دینے پر ایک سن رسیدہ اور تجربہ کار حکیم صاحب کو بلوالیا۔ بڑی دیر تک وہ معائنہ کرتے رہے پھر وثوق سے بولے "میں شرطیہ کہتا ہوں کہ آپ کو کینسر ویسنر کچھ نہیں ہے۔"

بیماری کی زردی کے باوجود ایسی اُمید افزا بات سُن کر نواب اختر کے چہرے پر سرخی جھلملا گئی۔ حکیم صاحب کہتے رہے "ایکسرے میں غلط عکس نہیں اُتر سکتا لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ جسے سب اور آپ کینسر سمجھ بیٹھے ہیں، وہ کینسر نہیں، غم کا زخم ہے۔"

"جی!" نواب اختر نے حیرت سے پوچھا "کیا فرمایا آپ نے؟"

"جی ہاں، میرے علاج میں کئی ایسے مریض رہے ہیں جنھیں کسی نہ کسی غم یا صدمے نے بے حد مار رکھا تھا، ایسا کہ وہ کسی سے اظہار تک نہ کر پائے اور سہتے سہتے کی ایک حد وہ بھی آئی کہ سینے میں ایک آبلہ سا اُبھر آیا اور آپ کو حیرت ہوگی کہ جب نفسیاتی طور پر ان کا علاج کیا گیا اور ان سے کھل کر دل کی بات کہہ دینے کو کہا گیا اور انھوں نے وہ بات کہہ بھی دی تو چند روز میں زخم مندمل ہو گئے۔" حکیم صاحب اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔ نواب اختر بھی بہت دیر تک یوں ہی لیٹے رہے۔

"ممکن ہے، آپ کے دل میں کوئی زخم ایسا پل رہا ہو جسے آپ اپنی شریک حیات تک سے نہ کہہ سکے ہوں۔ میں اس غم کی نوعیت نہیں جانتا لیکن وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی زندگی کو کسی نہ کسی غم نے دبوچ ضرور رکھا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں اپنی طبابت کو لات مار دوں گا۔"

سلطان ملک شاہ

نے چاند کی انتیسویں کو عید کی منادی کرادی۔ اس دور کے مجتہد امام الحرمین نے اس منادی سے بے وجوہ اختلاف کیا اور اعلان کروادیا کہ "سلطان کی منادی غلط ہے کیونکہ وہ اس امر کا مجاز نہیں ہے۔"

ملک شاہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے امام الحرمین کو دربار میں طلب کیا۔ امام جن کپڑوں میں تھے، اُنھی میں ملک شاہ کے پاس جا پہنچے۔ اس نے پوچھا کہ "آپ نے لباس تبدیل کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا؟"

امام الحرمین نے جواب دیا "میں نماز بھی اسی لباس میں پڑھتا ہوں اور شرعاً وہ جائز ہوتی ہے۔ تو میں جس لباس میں خدا کے سامنے جاتا ہوں۔ اگر اُسی میں تمھارے سامنے آ گیا تو کیا قباحت ہے؟" پھر انھوں نے عید کی منادی کے متعلق کہا کہ "جو امور سلطانی اختیارات کے دائرے میں ہیں، اُن کی اطاعت سب پر لازم ہے لیکن جو اُمور فتوے سے متعلق ہیں اُن کے لیے سلطان کو مجھ سے رجوع کرنا چاہیے، وہ خود فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہے۔"

بڑی دیر تک عجیب سی خاموشی پورے ماحول پر چھائی رہی، پھر حکیم صاحب خود ہی بول اُٹھے "لیکن میں آپ کا علاج دواؤں سے بھی کروں گا۔ اس لیے کہ یہ سوچ سوچ کر آپ کینسر کے مریض ہیں، آپ ضرورت سے زیادہ کمزور ہو گئے ہیں۔ خدا نے چاہا تو آپ چند ہی دن میں جوانوں سے بڑھ کر جوان ہو جائیں گے۔"

برابر کے کمرے میں پتلی فرطِ مسرت سے کانپ رہی تھی۔ اگر اللہ نے ایسا کر دیا، انھیں کینسر نہ ہوا تو وہ کس قدر خوش ہو گی!

حکیم صاحب کے چلے جانے کے بعد وہ کمرے میں آئی تو اس طرح جیسے شراب پی رکھی ہو۔ ہاں، اس نے خوشی کی شراب ہی تو پی رکھی تھی۔ قدم رکھتی کہیں تھی، پڑتا کہیں تھا۔ اس کا دل آج نئی خوشیوں سے معمور تھا۔

"آپ نے سُنا، حکیم صاحب کیا کہتے تھے!" وہ چہچہائی۔

"مریضوں کو خوش کرنے کے لیے معالج سدا ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔" وہ اوپری بناوٹ سے بولے حالانکہ ان کا اپنا دل خوشی سے اُچھل رہا تھا۔

"مگر مجھے تو پورا یقین ہے کہ حکیم صاحب کی تشخیص صحیح ہے۔ لیکن۔" وہ رُکتے رُکتے لہجے میں بولی "مجھے بڑی عجیب سی بات لگی کہ پتہ نہیں، آپ کے دل کو کون سا غم دبوچے ہوئے ہے جس نے پھوڑے کی شکل اختیار کر لی ہے؟"

نواب اختر کا ہنستا ہوا چہرہ سنجیدہ ہو گیا، بولے "کیا سچ مچ تمھیں

حکیم صاحب کی تشخیص صحیح لگی ؟"

"میں تو ایمان لے آئی" وہ گہرے یقین سے بولی۔

"تو اسی خوشی میں آج رات تم نیند بھر کر سو جاؤ، اس لیے کہ میری اس نامُراد بیماری میں تم نے اپنی ان پیاری پیاری نرگسی آنکھوں پر نیند حرام کرلی ہے۔"

پتلی حیرت سے بولی "۔آپ کو ایک بات پر تعجب ہوگا کہ مسلسل جاگنے سے اب یہ ہوگیا ہے کہ مجھے فرصت ملے اور سونا چاہوں تو بھی نیند آتی ہی نہیں۔ کل جب آپ سو رہے تھے تو میں نے سوچا، میں بھی گھڑی دو گھڑی آنکھ جھپکا لوں۔ ساری رات یوں ہی بیت گئی۔ چاند اِدھر سے اُدھر ہوگیا سورج نکل آیا مگر میں پڑی جاگتی رہی۔"

"یہ تو بڑی خراب بات ہے۔ ایک طرح کی بیماری ہی سمجھو۔ کل حکیم صاحب آئیں تو دکھا لینا۔"

حکیم صاحب کا علاج اور طریقِ کار ایسا تھا کہ واقعی آہستہ آہستہ نواب اختر صحت مندی کی طرف آتے گئے پہلے وہ حکیم صاحب کی آمد کے وقت بہت جھلّاتے جھلّاتے سے رہتے لیکن دھیرے دھیرے یہ ہوا کہ وہ بے چینی سے گھڑی دیکھ کر وقت گزارنے لگے کہ کب حکیم صاحب کے آنے کا وقت قریب آتا ہے؟

ایک دن اچانک حکیم صاحب نے نواب اختر سے پوچھ لیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو "تو نواب صاحب آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کو کس غم نے ان حالوں تک پہنچایا تھا؟"

بہت دیر تک تو نواب اختر چپ رہے، پھر اچانک انھیں یہ خیال آیا کہ ممکن ہے، زندگی میں پھر کبھی کوئی دوست اور ہمدرد نہ ملے اور دل کی گھٹن اتنی بڑھے کہ پھر سے صاحبِ فراش ہوجائیں، بہت سنبھل سنبھل کر وہ کہنے لگے "حکیم صاحب! جوانی میں ایک بھول ہوگئی تھی۔"

حکیم صاحب ہمہ تن گوش بن گئے "کیسی بھول؟"

اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کہیں پتلی نہ سن رہی ہو، وہ ٹھیرے ہوئے لہجے میں کہنے لگے "۔پتہ نہیں حکیم صاحب! آپ نے محبّت کی ہے یا نہیں ؟ میں نے کی تھی اور محبت جیتی تھی لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میری محبت کا مرکز اور کوئی نہیں، ایک طوائف تھی جسے میں نے ہر ممکن کوشش سے بیوی بنا کر ہی چھوڑا۔ مجھے گویا سب کچھ مل گیا، سب کچھ پالیا۔ لیکن" وہ کچھ رکے "لیکن حکیم صاحب! جب سر میں سفید بال اور چہرے پر سفید جھرّیاں نمودار ہوئیں تو مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے پایا تو کچھ نہیں۔ محبت کو میں آج بھی افضل مانتا ہوں لیکن ہے تو وہ ایک غیر مادّی شے ہی ۔میں ایک دُنیا سے اس محبّت کے لیے ٹوٹ گیا۔ دنیا میں ہوتے ہوئے بھی دنیا سے دور ہوگیا ـــــ اور جب سوچتا ہوں کہ یہ سب کیوں ہوا تو اس لیے کہ وہ طوائف تھی۔ اگر شریف خاندانی ہوتی تو کیوں یوں منہ چھپا کر زندگی گزارنی پڑتی لیکن بھول کا انجام کیا ہوتا ہے؟ عورت کے لیے آنسو اور مرد کے لیے پچھتاوا اور غم۔ سو آپ میری حالت دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ یقین کیجیے، مجھے یہ اعتراف ہے کہ زندگی میں اس سے بہتر بیوی شاید ہی مل سکتی ہوتی" نواب اختر چپ ہوگئے۔

حکیم صاحب سر ہلاتے رہے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مریض کا دل ہلکا ہوچکا ہے اور جذبات ٹھنڈے پڑ چکے ہیں تو اُٹھتے ہوئے بولے۔

"خیر، آپ اس کا خیال نہ کریں۔ یہ ایسی کوئی بھول نہیں تھی جس پر آپ اتنا پریشان ہوتے کہ زندگی لٹا بیٹھتے، جب کہ آپ کو یہ اعتراف بھی ہے کہ آپ کی بیوی دُنیا میں واحد بیوی ہے جو اتنی صفات کی حامل ہے۔"

"جی ہاں، یہ تو میں مرتے دم تک کہوں گا۔" نواب اختر بولے پھر حکیم صاحب کو اٹھتا دیکھ کر وہ اچانک جیسے کچھ یاد کرکے بولے۔

"ارے سنیے حکیم صاحب! دماغ پر پتھر پڑ گئے ہیں، کچھ یاد ہی نہیں آتا۔ روز آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ ذرا بیگم صاحبہ کو بھی دیکھ لیجیے۔ پتہ نہیں، کیا بیماری ہوگئی ہے کہ سونا چاہیں تو بھی نیند نہیں آتی بیچاری میری تیمارداری اور خدمت میں اتنا جاگی ہیں کہ اب نیند ہی اڑ گئی۔"

"فکر نہ کیجیے، زیادہ پریشانی میں عموماً ایسا ہوجاتا ہے پھر بیگم صاحبہ تو آپ کو بے حد ہی چاہتی ہیں کیونکہ جب میں نے دیکھا، یہی دیکھا کہ آپ کے لیے کچھ نہ کچھ پکا رہی ہیں، آپ کا کام کر رہی ہیں۔"

حکیم صاحب کھنکارتے ہوئے برابر کے کمرے میں داخل ہوئے اور پلنگ پر لیٹی ہوئی پتلی کی نبض دیکھنے کے لیے اس کی کلائی تھامی تو انھیں پتہ چلا کہ کسی دوا کے بغیر وہ ایسی نیند سو چکی ہے جس سے آج تک کوئی نہیں جاگ سکا۔



اُردو کے مایۂ ناز افسانہ نگار بلونت سنگھ کی ایک ظالم تحریر

ماجھا کے علاقے میں بھیکن ایک چھوٹا سا غیر معروف گاؤں تھا۔ مشکل سے سو گھر ہوں گے۔ زیادہ تر سکھوں کی آبادی تھی۔ یہاں کی ایک بات تھی وہ یہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طور پر حسین لڑکی وجود میں آتی جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر پُر رومان ہوتی کہ سسّی پنوں، سوہنی مہینوال اور ہیر رانجھے کے قصّے بھی مات ہو جاتے تھے۔ اور اب کے قرعہ گورنام کور کے نام پڑا تھا۔

گورنام کے حسن نے آس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ وہ ایک گڑیا کے مانند تھی، چینی کی مورت، چلتی تو اس سبک رفتاری کے ساتھ کہ نقشِ قدم معدوم، سرمگیں اور بدمست آنکھیں ایسے گناہ کی دعوت دیتی تھیں جس سے بہتر ثواب کا تصوّر ذہن میں نہ آتا تھا لیکن ابھی وہ معصوم تھی۔ شباب کی آمد آمد تھی اور وہ ایک بے فکر اور پُر شباب دوشیزہ کی پُر زور حِس ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے خاموش اور پُر سکون سمے میں کہیں دُور سے شہنائی کی اڑتی ہوئی آواز سنائی دے جائے۔ ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ ہر کسی کو پیش کر دیتی۔ وہ سب سے ہنس کر بات کر لیتی، ابھی اُس میں پندارِ حُسن پیدا نہیں ہوا تھا، اس لیے جو بھی شخص اُس سے بات کر لیتا یہی سمجھتا کہ گرنام اس سے محبّت کرتی ہے۔ ایک مرتبہ شنگارا سنگھ نے علانیہ نوجوانوں کے جُھرمٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ وہ گرنام کو بھگا لے جائے گا۔ اسی وقت دلیپ سنگھ وہاں سے گزرا تو دوسروں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی گرنام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے، اُس نے سُن پایا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر لیں گے۔ اس پر شنگارا سنگھ نے زبردست قہقہہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے کھڑے ہو کر بکرا بُلا دیا (کسی کی تضحیک کرنے کے لیے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر بھق بھق کی آواز نکالنا) اس پر دلیپ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے خشمگیں نظروں سے شنگارے کی طرف دیکھا اور کڑک کر بولا۔ "تُو نے بکرا کیوں بلایا ہے؟"

شنگارے نے تہبند کس لیا اور خم ٹھونک کر مقابلے پر آ کھڑا ہوا۔ دلیپ کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں، قریب تھا کہ دونوں جوان باہم گتھ جائیں مگر سب نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ آخر کہاں تک؟ ایک دن خونی پُل پر دونوں

اُردو ادب کی تیسری منتخب کہانی



کا مقابلہ ہو گیا۔ دلیپ کا ٹخنہ اُتر گیا اور دلیپ کی لاٹھی کی ایک ہی ضرب سے شنگارے کا جبڑا ٹوٹ گیا، جان تو بچ گئی مگر صورت بگڑ گئی۔ اُس دن سے سب کو کان ہو گئے اور اب دلیپ کے جیتے جی گرنام کا دعوے دار پیدا ہونا ناممکن تھا۔

رات بھیگ چکی تھی، چاند جوبن پر تھا۔ گاؤں پر ایک پُراسرار خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی کتّوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی یا اُس وقت رہٹ کی چرخی کے پاس ایک جنگلی بلّا بیٹھا دُم ہلا رہا تھا اور نہایت انہماک کے ساتھ میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔ یہ رہٹ اروڑیوں (کوڑے کے ڈھیر) کے پاس گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ ساتھ ہی پیپل کا ایک بہت بڑا اور گھنا درخت جس پر ایک جھولا پڑا تھا۔ چونکہ بیلوں کو ہانکنے والا کوئی تھا نہیں، جی چاہتا چل دیتے، جی چاہتا ٹھہر جاتے۔ اُس وقت خاموشی سے کھڑے سینگ ہلا رہے تھے، اتنے میں سانڈنی سوار ایک سکھ مرد پیپل کے نیچے آکر رکا۔ اس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا۔ سانڈنی بلبلا کر مچلی پھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پنجاب کے دیہات میں چھ فٹ اونچا نوجوان کوئی خلافِ معمول بات نہیں مگر اُس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ ہاتھوں اور چہرے کی رگیں ابھری ہوئی، آنکھیں سُرخ انگارا، ناک جیسے عقاب کی چونچ، رنگ سیاہ، چوڑے اور مضبوط جبڑے، سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو۔ جوڑے پر زنگ بر رنگ کی جالی جس میں سے تین بڑے بڑے پھندنے نکل کر اس کی سیاہ داڑھی کے پاس لٹک رہے تھے۔ کانوں میں بڑے بڑے مندرے، کالے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر، بدن پر لانبا کُرتا اور مونگیا رنگ کا دھاری دار تہبند اس کی ایڑیوں تک لٹکتا ہوا، گریبان کا تسمہ کُھلا ہوا اور اُس کے سینے پر کے گھنے بال نمایاں اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور چمکدار چھوی (ایک تیز خم دار ہتھیار جو لاٹھی کے سرے پر چڑھا لیا جاتا ہے)

آتے ہی اس نے بیلوں کو دھتکارا اور وہ چلنے لگے۔ اس نے جوتے اتارے، تہبند اوپر اٹھایا اور اپنے موٹے کڑے (آہنی کڑا جو سکھ کلائی میں پہنے رہتے ہیں) پیچھے ہٹا، پانی کی چھال کی طرف بڑھا۔ پہلے اُس نے منہ ہاتھ دھویا، زور سے کھانسا پھر پانی پینے لگا۔

جب وہ پگڑی کے شملے سے منہ پونچھنے لگا تو ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ لڑکی نے پانی بھرنے کے لیے گھڑا چھال کے نیچے کیا۔ اُس کی گوری کلائی پر کچ کی کالی کالی چوڑیاں ایک چھن کی آواز کے ساتھ یک جا ہو گئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار، چھینٹ کا گھٹنوں تک کا کُرتا۔ سر پر دھانی رنگ کی ہلکی پھلکی اوڑھنی، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں، جب اس نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں تلے دبایا، گھڑا ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا کو لھے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک دل نشیں خم سا پیدا ہو کر رہ گیا۔ مرد نے پہلے ایک پاؤں اُولُو (جہاں پانی گرتا ہے) سے باہر نکالا اور اسے جھٹک کر جوتا پہن لیا۔ پھر اس نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا اور دوسرا جوتا بھی پہن لیا تو وہ اپنی چھوی ہاتھ میں لیتے ہوئے اروڑی پر کھڑا ہو گیا جہاں ایک سفید مرغی کے بہت سے پر پڑے تھے۔ پاس ہی کسی کے گھر کی کچّی دیوار تھی جس پر اُپلے رکھے تھے۔ جب لڑکی دیوار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوی سے ایک اپلا نیچے گرا دیا جو لڑکی کے پاؤں کے پاس جا کر گرا۔ اسی وقت اجنبی مرد نے اُس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید سپید کبوتر، تلووں کی ہلکی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کلیاں روند کر چلے آرہے ہوں، لڑکی نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، شاید اس نے اسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا مگر اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر اس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں خوف کا سایہ دکھائی دینے لگا۔ مرد نے بھاری بھرکم اور کرخت آواز میں پوچھا۔ "تو کون ہے؟"

لڑکی کی نظریں مرد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے اسے اس قدر بے مروّتی کے ساتھ مخاطب کیا۔ اس کے سُرخ سُرخ نازک ہونٹ پھڑکنے لگے جیسے کسی نے لال مرچیں ان پر چھڑک دی ہوں مگر مرد غیر معمولی طور پر بھیانک تھا۔ مرد نے اسی لہجے میں اپنا سوال دُہرایا۔ "تو کون ہے؟"

لڑکی سمجھ نہ سکی کہ اس بات کا کیا جواب دے؟ اس نے اپنی حنائی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں وہاں اُس گھر میں رہتی ہوں"

مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

دوشیزہ کی آنکھیں پُرآب ہو گئیں۔ بولی۔ "گرنام"۔

"تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

"میری ماں ہے، بے بے، ویر، چاچا، باپو سبھی رہتے ہیں"۔

"مجھے اپنے گھر لے چل"۔ مرد نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے"۔

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں پڑ گئیں، اس نے اپنی دُلھن کی طرح آراستہ سانڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانست میں ذرا نرم لہجے میں پوچھا "کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو گیا؟"

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔ "لیکن مجھے تم سے خوف معلوم ہوتا ہے"

"کیوں؟" مرد نے اُجڈپن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے ایک لمحے کے لیے اس کی چمک دار آنکھوں کی طرف دیکھا۔ "تم ہنستے کیوں نہیں؟"

"ارے یہ بات؟" یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوف ناک قہقہہ لگایا جیسے کوئی پانی سے لبریز مٹکا زمین پر انڈیل دے۔ اُس کے قہقہے کی آواز سن کر چمگادڑیں اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پرواز کر گئیں۔

سہب سہنگ

گرنام کا گھر گاؤں سے باہر دھریک کے درختوں کے جھنڈ کے پاس تھا۔ اس کی ممٹی تو بہت دور سے نظر آتی تھی۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر اجنبی رُک گیا اور گرنام نے اندر سے اپنے باپو اور بھائی کو باہر بھیجا۔ انھیں دیکھتے ہی اجنبی نے بلند آواز میں کہا۔ "واہ گورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح۔"

"واہ گورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح۔"

اجنبی کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بولا۔ "میں دُور سے آ رہا ہوں، رات زیادہ گزر چکی ہے۔ میں آج یہیں ٹھیروں گا۔"

باپو درانتی اپنے پوتے کے ہاتھ میں دے کر اجنبی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوش خلق اور ملنسار شخص تھا مگر اجنبی کی بھیانک شکل اسے شش و پنج میں ڈالے ہوئے تھی۔ خیر اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ہر طرح سے خدمت کے۔۔۔" پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پورا کر سکے، اجنبی سانڈنی لڑکے کے سپرد کر کے دروازے کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اگرچہ گھر کا کُل سامان غریبانہ تھا مگر گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواریں اس کا ثبوت دے رہی تھیں کہ گھر کی عورتیں کاہل یا آرام طلب ہرگز نہیں ہیں۔ گھر کے سب افراد بیاہ والے گھر گئے ہوئے تھے، چار کے سوا۔

ڈیوڑھی سے نکل کر اجنبی صحن میں داخل ہو گیا۔ ایک بچہ سینے سے گلّی ڈنڈا لگائے سو رہا تھا۔ صحن مویشیوں کے موت اور گوبر سے اٹا پڑا تھا۔ ایک طرف کھرلی کے پاس ایک بھینس جُگالی کر رہی تھی۔ بھُس اور کھلی کی سانی کی بُو چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ رسّی پر میلے کچیلے کپڑے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف خراس، دوسری طرف تنور اور اس کے پاس ہی دیوار سے لگا ہوا چھکڑے کا پہیّا، یہ بڑے بڑے اُپلے، کونے میں کپاس کی چھڑیاں، چولھے کے پاس چھوٹے برتنوں کا انبار، ایک کمرے سے سفید سفید چمکتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی تاگے میں پروئے ہوئے شلغم کے قتلے سوکھنے کے لیے لٹک رہے تھے۔

صحن سے گزر کر بوڑھا باپو اجنبی کو دروازے سے باہر چھپر کے نیچے لے گیا۔ تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف ایک کچی دیوار اٹھا دی گئی تھی۔ سوکھے ہوئے اُپلے جو جلانے کے کام آ سکتے تھے، اسی جگہ رکھے جاتے تھے۔ یہاں ایک چارپائی ڈال دی گئی۔ چارخانوں والا ایک کھیس اور اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک عدد تکیہ اُس پر رکھ دیا گیا۔

گرنام نے کپاس کی چھڑیوں کا ایک گٹھّا تنور میں پھینکا اور خود آٹا گوندھنے لگی۔ جس وقت وہ تنور میں روٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سر سے کھسک گئی۔ اس کی لانبی چوٹی کے رنگ برنگ کے پھُندنے اس کی پنڈلیوں تک لٹک رہے تھے۔ دہکتے ہوئے تنور کی روشنی اس کے حسین چہرے پر پڑ رہی تھی اور اجنبی چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

شلغم کی ترکاری، ایک کٹورے میں شکر گھی، ڈیلوں کا اچار، دو بڑی بڑی پیاز کی گٹھیاں اور آٹھ چوڑی چوڑی روٹیاں تھال میں رکھ کر گرنام اسے دینے آئی۔

جب اجنبی نے اونچے سُر میں تین چار ڈکاریں لیں اور بڑے زور و شور کے ساتھ منہ میں انگلی پھیر کر کلّی کی تو گرنام کو معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے۔

وہ برتن اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کپڑے اتار رہا ہے۔ جب اس نے تہبند اتارا اور اسے جھاڑ کر تکیے کے قریب رکھنے لگا تو سونے کا ایک کنٹھا نیچے گر پڑا۔ گرنام ٹھٹک کر واپس جانے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا "گرنام! بس جا رہی ہو کیا؟"

گرنام حسبِ معمول اپنے دل فریب طفلانہ انداز سے مسکرائی اور اوڑھنی سنبھالتی ہوئی آگے جھک کر آہستہ سے بولی۔ "سب لوگ سو جائیں تو میں آؤں گی۔"

اجنبی دُور کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شریہہ اور ببول کے پیڑ سیاہ دیووں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ لنڈ منڈ بیریوں پر بئیوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے۔ ایسے سنسان وقت میں تاروں بھرے آسمان تلے کسی دور افتادہ رہٹ سے کسی نوجوان کے مسرّت انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔

باگے وچ کیلا ای
نکل کے مل بالو!۔۔
ساڈا وچھنے دا ویلا ای
نکل کے مل بالو!

اتنے میں گرنام دبے پاؤں، شلوار کے پائنچے اٹھائے، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے، چپکے چپکے قدم ناپتی ہوئی آئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں میں گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔ اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار نکالے۔ قریب تھا کہ گرنام کے منہ سے حیرت اور مسرّت کے مارے ایک چیخ نکل جاتی مگر اجنبی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گرنام بہت دیر تک مینا کی طرح چہکتی رہی، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا۔ آخر اس نے اپنی باتوں سے آپ ہی اکتا کر ایک گہری سانس لی اور کان کی آواز میں بولی۔ "کیوں تم یہ زیورات کہاں سے لائے ہو؟ میرے خیال میں تم جیب کترے تو نہیں ہو، مجھے جیب کتروں، چوروں اور ڈاکوؤں سے سخت نفرت ہے، وہ جھٹ سے گلا دبا کر آدمی کو مار ڈالتے ہیں۔" یہ کہہ کر گرنام اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگی۔ جیسے سچ مچ کا کوئی قاتل اس کا گلا دابنے آ رہا ہو۔

"مت گھبراؤ۔ تم بھی کیسی بچّوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے تمھیں کس بات کا خطرہ؟ اٹھو یہاں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔"

گرنام اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اجنبی کے چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا تہِ دل سے مطمئن ہو کر کہنے لگی۔ "تم کتنے اچھے ہو۔ یہ زیورات تو تم اپنی بیوی کے لیے لائے ہو گے نا؟"

"ہاں !"

گرنام نے اپنی ہتھیلی پر رخسار رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "تمھاری بیوی کیسی ہے ؟"

"مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی"۔

اچھا تو ہونے والی بیوی کے لیے لائے ہو؟"

اجنبی نے اپنی داڑھی کے کھردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون بنے گی ؟ بنے گی بھی یا نہیں"۔

گرنام نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر اپنی آنکھیں جلد جلد جھپکاتے ہوئے ناک ذرا سکیڑ کر بھولے پن سے کہا" ہاں تم کالے ہو ذرا"۔

اجنبی کے سینے میں جیسے کسی نے گھونسا مار دیا ہو۔ مگر گرنام نہایت سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔ شاید وہ اجنبی کے لیے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔ "یہ زیور تم لے لو"۔

گرنام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا۔ "پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟"

اجنبی کو کچھ جواب نہ سوجھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا" پھر میں تم سے لے لوں گا"۔

گرنام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ تالی بجا کر بولی "میں انھیں اُپلوں میں چھپا دوں گی۔ کبھی کبھی رات کو اچھے اچھے زیورات پہن کر کھیتوں میں جایا کروں گی"۔

کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا "گرنام تم بھی تو مجھے کچھ دو"۔

گرنام نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا "میرے پاس کیا ہے؟"

"کچھ بھی ہو"۔

گرنام چہرے سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کوڑیوں اور خربوزے کے رنگ برنگ کے بیجوں کا ہار اُتار کر اجنبی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنا یہ حقیر تحفہ دیکھ کر جھینپ سی گئی اور اُس کے رخسار دہکنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گرنام نے ایک انگشتری اُٹھا کر کہا" یہ میری انگلی میں پہنا دو۔ دیکھوں، کیسی لگتی ہے"۔

اجنبی نے اپنے کالے کالے میلے کچیلے لمبے چوڑے ہاتھوں میں گرنام کا کنول سا ہاتھ لیا۔ گرنام نظریں جھکاتے بچوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کی زلفوں نے اس کے رخسار کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اجنبی وارفتگی کے عالم میں اُس کے خوب صورت سیپیوں جیسے پپوٹوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ جب وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا تو اس کی اپنی انگلیاں لرزنے لگیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی چار چار انگل چوڑی کلائیوں کی کل طاقت کشید کی جا رہی ہو۔ گرنام چونکی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی "اماں کھانس رہی ہے۔ اب میں جاتی ہوں"۔ اجنبی اپنے خواب سے چونکا۔ گرنام نے آگے جھک کر نقرئی آواز میں پوچھا "جاؤں کیا؟"

اجنبی کی اجازت لے کر وہ زیورات کی پوٹلی بغل میں دبائے جھٹ اندر چلی گئی۔

علی الصباح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوہڑ میں گھس پڑے۔

اجنبی جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ گرنام نے اسے ایک باسی روٹی پر مکھن اور چھنا لسّی کا دیا اور جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گرنام رونے لگی۔ اجنبی نے آہستہ سے کہا" روتی کیوں ہو؟"

"تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم مت جاؤ"۔

اجنبی ہنس پڑا" میں پھر آؤں گا"۔

باپو کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ باپو اجنبی کو رخصت کرنے کے لیے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا۔ اس نے اجنبی سے پوچھا "کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

"ہاں!" اجنبی نے اپنی تیز نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ کر جواب دیا۔ پھر اس نے اپنی دھوپ میں چمکنے والی چھوی کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتے ہوئے مزید کہا "اور تمھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میرے نام کا ذکر اپنے یا بیگانے کسی سے بھی کیا تو تمھارے اور تمھارے خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ رنگنے پڑیں گے"۔ بوڑھے کا چہرہ فق ہو گیا۔

اجنبی سانڈنی پر سوار ہو گیا اور مہار کو جھٹکا دے کر اپنی بھاری آواز میں بولا" آج رات جگّا ڈاکو تمھارا مہمان تھا"۔

جگّا ڈاکو، اصل نام سردار جگت سنگھ ورک وہ خوف ناک شخص تھا جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے قتل، غارت گری، ظلم، لوٹ مار اس کے سر روز کے مشاغل تھے۔ لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے ہی میں گزر گیا۔ بہت سی زمین کا مالک تھا۔ بڑوں بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا، غریب خوش تھے۔ اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص حوصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب تیس برس سے اوپر سن تھا۔ موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سو جاتا اور موت کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا۔ محبت، حسن، شفقت نیکی وغیرہ کا اس کے نزدیک کچھ بھی مفہوم متعین نہیں تھا۔ دور دور تک اس کی دھوم تھی۔ علاقہ بھر اس سے تھرّاتا تھا، اس کا دل پتھر، بازو آہن، غصہ قیامت، دہن شعلہ۔ وہ قہر تھا۔

لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنا لیے تھے۔ نوجوان جھوم جھوم کر انھیں گایا کرتے تھے۔ ایک واقعے کا ذکر یوں ہوتا تھا ؎

پکّے پُل تے لڑائیاں ہوئیاں پکّے پُل تے
پکّے پُل تے لڑائیاں ہوئیاں تے چھویاں دے کِل ٹُٹ گئے..... جگیا

یا پھر لائل پور میں اس نے ایک زبردست ڈاکا ڈالا تھا اور بچ کر واپس بھی آگیا تھا۔ اس کا ذکر یوں ہوتا تھا ؎

جگّے ماریا لائل پور ڈاکا، جگّے ماریا

جگے ماریا لائل پور ڈاکا تے تاراں کھڑک گیاں آپے

اس کی طویل، تاریک اور ہیبت ناک شبِ حیات میں ایک تارا طلوع ہُوا جس نے اُس کی نظریں خیرہ کردیں اور وہ تارا تھی، گرنام!

گرنام بیچاری نادان چھوکری، اسے عشق و محبّت کا پتہ ہی نہ تھا۔ لوگ کنکھیوں سے دیکھتے، وہ ہنس دیتی۔ اُس کا جذبۂ پندارِ حسن و شباب کسی نے بھی صحیح طور پر متحرک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ابھی اُسے اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ دیدہ دانستہ شکار کھیلے، بسملوں کا تڑپنا دیکھے اور اُس لذّت سے محظوظ ہو جو صیّادوں کے لیے مخصوص ہے۔ وہ بھولی بھالی سادہ رُو چھوکری یہ جانتی ہی نہیں تھی کہ وہ شاہین جسے زخمی کرنے کے لیے پنجاب کے شہزوُر نوجوانوں کی کمانیں ٹوٹ چکی تھیں اور جس پر جو بھی تیر پھینکا جاتا تھا، وہ اسے چھُو کر اور کند ہو کے زمین پر گر پڑتا تھا۔ وہی شاہین اس کے غلط انداز تیر کا شکار ہو کر نیم بسمل اس کے پیروں کے پاس پڑا تھا اور وہ تیر قدرت نے اس کی پلکوں میں پنہاں کر کے رکھ چھوڑا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگّا ان کے ہاں آتا اور سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا۔ اُس نے اپنے آپ کو ایک متموّل زمیں دار ظاہر کیا۔ باپو کے علاوہ گھر کے سبھی افراد اسے دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ گرنام کی کشش اسے کھینچ لاتی تھی۔ اس کے دل میں ایک خلش سی رہتی تھی کہ وہ اُس فرشتے کو اپنانے سے پہلے خود کو کیونکر اُس کے قابل بنائے؟ اس نے کبھی بھی اُس سے محبت جتانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کیونکر اس کا آغاز کرے، وہ سوچتا تھا کہ نہ معلوم اس کے اظہارِ محبّت کرنے پر گرنام کیا رویّہ اختیار کرلے؟ وہ اُس کے پاس بیٹھی چہکتی رہتی تھی اور وہ مبہوت سا بیٹھا سُنا کرتا۔ کبھی کبھی اسے خود سے نفرت ہونے لگتی تھی۔ صورت تو پہلے ہی اس کی مکروہ تھی مگر اُس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا۔ گرنام تھی کہ اس نے کبھی اُس سے اظہارِ نفرت نہیں کیا۔ وہ نہایت مہر و محبت کے ساتھ اُس سے پیش آتی۔ اگر وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لیے کہتا تو اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی۔ اگرچہ اس نے آج تک اسے چھُونے کی جرأت نہیں کی تھی۔ گرنام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں دھڑکا پیدا کر دیتی تھی۔ اس کا ملکوتی جمال اس کا سر نگوں کر دیتا تھا۔ صرف اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی۔

یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت حیرت سے سُنا کہ جگے نے ڈاکا زنی ترک کر دی ہے۔

ڈیڑھ برس کا عرصہ آنکھ جھپکتے میں گزر گیا۔ جگّا صبح و شام پاٹھ کرتا غریبوں کو کھلاتا پلاتا، دان کرتا۔ گُردوارے میں جا کر سیوا کرتا، ہر کسی کے ساتھ نرمی اور حلیمی سے گفتگو کرتا۔

اس نے باپو کی منّت کی کہ گرنام کور کی شادی اُس کے ساتھ کر دی جائے۔ اس نے ڈاکا زنی ترک کر دی ہے اور جو کچھ اُس نے لُوٹا، وہ سب بڑی توندوالوں کا تھا۔ غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اُس کے پاس نہیں تھا وہ اپنی بہت سی زمین اور روپیہ انھیں دینے کو تیار تھا اور باپو کو وہ ہمیشہ بزرگ سمجھ کر اس کی خدمت کرے گا لیکن گرنام کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ وہ جگّا ڈاکو تھا اور نہ ہی اُسے فی الحال اس بات کا علم ہونے پائے کہ اس کی شادی کس سے ہونے والی ہے کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ اسے چاہتی تھی اور جب وہ اپنے پریتم کو یک بیک اپنا خاوند دیکھے گی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی۔ نیک باپو نے سب کچھ منظور کرلیا۔

جگّا بھیکن سے چودہ کوس پرے رہتا تھا۔ اُس کی آمد و رفت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اُس اجنبی کو کبھی کبھار اُن کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا مگر کسی نے کوئی خاص توجّہ نہ دی کیونکہ اوّل تو آتا ہی کبھی کبھار تھا اور دوسرے وہ راتوں رات واپس بھی چلا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کا بہانا کر دیتا تھا۔ جگّے کو دنیا جانتی تھی مگر اسے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ جگّے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی۔ اب وہ چاہتا تھا کہ گرنام کی زبان سے بھی اس عشق کا اقرار کروالے۔ خواہ اسے یہ نہ بتائے کہ اس کا ہونے والا خاوند وہی تھا۔

ایک دن غروبِ آفتاب کے بعد وہ بھیکن میں داخل ہُوا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ گرنام ساتھ والے گاؤں میں جُلاہوں کو سوت دینے کے لیے گئی ہوئی تھی۔ جگّے نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ اُس نے پگڑی ذرا کج کی، شملہ ذرا اور بلند کیا پھر اس نے سب کی نظریں بچا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر الٹ لیا اور اسے اپنی گھنی اور کھُردرے بالوں والی گرد آلود داڑھی پر خوب اچھی طرح مل لیا۔ پھر وہ مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پانچ چھ فرلانگ تک چلا گیا۔ ہر طرف دُھند سی چھائی ہوئی تھی۔ چاند کی ملگجی روشنی میں وہ ایک بھوت کے مانند دکھائی پڑتا تھا۔ دور سے ایک صورت دکھائی دی۔ اسے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ کوئی عورت تھی اور یقیناً تھی بھی گرنام۔ جگّا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔ گرنام قریب آتے ہی مسکرا دی لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گٹھری تھی "میری تو گردن ٹوٹ گئی"۔

"اس گٹھری میں کیا بھر لائی ہو؟" یہ کہتے ہوئے جگّے نے ایک ہاتھ سے یہ من بھر کا بوجھ اُس کے سر سے یوں اٹھا لیا جیسے کوئی دو سال کے بچّے کو ٹانگ پکڑ کر اٹھا دے۔

"اُپلے اور کیا ہوتا ہے؟" گرنام نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑ کر کہا۔ "آ رہی تھی، رستے میں اُپلے چننے لگی، یہاں تک کہ شام ہو گئی۔" دونوں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

آج جگّے نے گرنام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیوں اور ساگ کا تصوّر اُسے

بے چین کیے دیتا تھا۔ کبھی تو اس کے دل میں آتی کہ سارا بھید کھول دے اور کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتائے۔ آخر اس سے نہ رہا گیا کیونکہ گرنام کچھ افسردہ سی ہو رہی تھی۔ "گرنام!" یہ کہتے کہتے رال اس کی داڑھی پر ٹپک پڑی، اس نے اُسے آستین سے پونچھا، پھر بولا "گرنام تمھیں ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔"

گرنام نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے میں مصروف تھی اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلے سی شوخ اور الھڑ نہیں رہی تھی مگر جگّے سے کافی مانوس تھی۔ اس لیے اس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں تھی۔ جگّے کو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا "کیوں گرنام! کس سوچ میں ہو؟"

گرنام پہلے تو چونکی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا "میں بہت پریشان ہوں۔ میں بہت دنوں سے چاہتی تھی کہ تمھیں سب حال سناؤں لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"شرم آتی تھی۔" گرنام نے جھینپ کر جواب دیا۔

جگّا کچھ کچھ تاڑ گیا۔ مونچھ کے نیچے مسکرایا "ارے مجھ سے شرم کیسی؟"

گرنام چپ رہی۔ جگّا کھسک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اس کے بار بار اصرار کرنے پر گرنام نے بتایا "وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ شادی تو سبھی کی ہوتی ہے۔"

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "وہ کسی روپے پیسے والے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں جسے میں نے دیکھا بھی نہیں مگر میں کسی اور سے......" یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔

جگّے نے اپنا اوپر کی طرف اٹھا ہوا شملہ چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے تو نہیں جھک گیا؟ پھر اس نے سینہ پھلا کر کہا "نہیں گرنام! نہیں، جسے تم چاہو گی اسی سے تمھاری شادی ہو گی۔ میں باپو کو خود سمجھاؤں گا...... ہاں تو...... مگر وہ ہے کون؟" جگّے کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک رہی تھیں۔ گرنام نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے اس کے چوڑے شانے اور صندوق جیسا سینہ چھو کر یک گونہ تسکین حاصل ہو رہی تھی۔ جگّا گھبرا گیا۔ اُس نے اسے چمکارا اور دلاسا دیا اور پھر اُس شخص کا نام پوچھا۔

گرنام نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر رک گئی اور زور زور سے رونے لگی۔ جگّے نے تسکین دی تو وہ بولی "تم ضرور میری مدد کرو گے۔ میں ان سب کے ہاتھوں سخت بیزار ہوں، تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام......"

جگّے کا دل بلّیوں اچھلنے لگا۔ "اس کا نام ہے دلیپ...... دلیپ سنگھ"

جگّے کو سانپ نے ڈس لیا۔ اس کا چہرہ یکایک بھیانک ہو گیا "دلیپ سنگھ اس کا نام ہے؟" گرنام نے دُہرایا۔

جگّے کی مونچھیں لٹکنے لگیں۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جسم کے رونگٹے ــــ کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ گردن کی رگیں پھول گئیں۔ گرنام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "گھر جاؤ" اس نے بھاری آواز میں کہا۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا "تم فوراً واپس چلی جاؤ۔" اس نے کرخت لہجے میں گرج کر کہا۔

گرنام چپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور گٹھڑی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔ جگّا اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ عقاب کی چونچ نما ناک سُرخ ہو گئی۔ آنکھیں خون آلود ہو کر رہ گئیں اور چہرے سے بربریت ٹپکنے لگی۔ معاً اُس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دانت پیستے ہوتے آہستہ سے بولا "دلیپ سنگھ؟" موت کا فرشتہ دلیپ سنگھ کے سر پر منڈلانے لگا۔

خونی پُل علاقے بھر میں مشہور تھا۔ یہ پُل ایک چھوٹی سی نہر پر واقع تھا نہر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے۔ وہاں نہ تو سورج کی دھوپ پہنچ سکتی تھی نہ چاند کی چاندنی۔ پُل بڑے بڑے اور بھدّے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے صرف ایک کوٹھی تھی اور پانی دو حصّوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا۔ رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے منہ ایسے دکھائی پڑتے تھے جیسے دو منہ والا کوئی دیو انسانوں کو ہڑپ کر لینے کے لیے منہ کھولے بیٹھا ہو، یا جیسے کسی مُردے کی دو بڑی بڑی آنکھیں، جن کی پتلیاں کوّے نوچ کر کھا گئے ہوں۔ پاس ہی ایک قبرستان تھا اور کچھ فاصلے پر مرگھٹ۔ رات کے وقت کوئی شخص اُدھر سے گزرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس پُل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی خونی پُل رکھ دیا گیا تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچّے تو دن کے وقت بھی اکیلے اِدھر نہ آتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں ایک سرکٹا سیّد رہتا تھا۔ کبھی کبھی اُس کا سر تو پُل کے نیچے دل دوز چیخیں مارا کرتا اور دھڑ خود سر کے بغیر نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔

نصف رات گزر چکی تھی۔ دلیپ سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ چھوٹے سے گدھے پر دو بوریوں میں سامان تھا۔ وہ سُنار کا کام بھی کرتا تھا اور پنساری کی دکان بھی۔ اُس کی اپنی تیار کردہ گل قند خوب بکتی تھی۔ وہ نوجوان تھا، خوش رُو و خوش وضع، مَسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں، گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے بال جیسے زعفران، آنکھیں شربت سے لبریز کٹورے، سر پر اُس وقت لُنگی باندھے ہوئے تھا۔ اس کا ایک چھوٹا سا شملہ نیچے کی جانب لٹکتا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا۔ الغوزے خوب بجاتا تھا۔ جب رانجھا ہیر کی شادی کے بعد اس کے ہاں بھیک مانگنے کے لیے جاتا ہے، یہ واقعہ وارث شاہ کی ہیر سے بڑی دردناک لَے میں گایا کرتا تھا بلکہ اس میں تو دور دور تک اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔

دلیپ طاقت ور اور دلیر نوجوان تھا مگر خونی پُل کا نظارہ اور پھر

اُس کے ساتھ وابستہ خونی روایات وہ جگہ اور بھی بھیانک بنا دیتی تھیں۔ رات کی تاریکی میں شیشم کے گھنے درختوں کے تلے نہر کے سسک سسک کر بہنے والے پانی کی آواز سُن کر اس کے دل کو کوفت سی ہونے لگی۔ اس نے ذرا بلند آواز میں چھیئی گانا شروع کر دیا۔ تاریکی اور خاموشی میں اپنی آواز سُن کر اُسے تسکین ہوئی۔ اُس کا گدھا پُل سے پار ہو چکا تھا۔ وہ عین پُل کے درمیان میں تھا۔ دل میں شاداں تھا شے کی چبھن محسوس ہوئی۔ جیسے کوئی اس کا کرتا پکڑے پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ ایک دیو ہیکل مرد پُل کی دیوار سے اُچکا ہوا تھا۔ اس نے اپنی چھوی پیچھے سے اس کی قمیص میں اڑا دی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

”تم کون ہو؟“ دلیپ نے ہمّت کر کے بلند آواز میں پوچھا۔

”ادھر آ!“ بھاری اور تحکمانہ آواز آئی۔

دلیپ اس کی طرف بڑھا۔ یکایک اس نے اجنبی کو پہچان لیا۔ بولا ”مجھے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ میں نے تمھیں کہیں دیکھا ضرور ہے۔ کیا تم وہی شخص نہیں ہو جس نے تین سال پہلے چند اشخاص سے لڑتے وقت میرا ساتھ دیا تھا؟ ہاں شاید وہ ننکانا صاحب کا میلا تھا۔ تبھی کا واقعہ ہے اور تم نے دو آدمی جان سے بھی مار ڈالے تھے؟“

”بے شک میں وہی ہوں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دلیپ سنگھ ہے۔ میں تجھے ایک اجنبی اور نو عمر چھوکرا سمجھ کر تیرا مددگار بنا تھا اور قتل تو میں نے بہت کیے ہیں، اسی پُل پر گیارہ آدمی قتل کر چکا ہوں اور آج مجھے بارھواں قتل کرنا ہے۔“

دلیپ کو اس کے اُجڈپن پر تعجب ہوا۔ بولا ”میں نہیں جانتا تمھاری مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ تم تو میرے محسن ہو۔“

”تو گرنام سے محبّت کرتا ہے جو صرف میری ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو نے شنگارا سنگھ کو اسی پُل پر سخت زخمی کیا تھا۔ آج تیرا میرا فیصلہ ہو گا۔“

یہ کہہ کر اجنبی نے چھوی ہاتھ سے رکھ دی اور اُس کی طرف بڑھا۔

”اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آ جائے۔“

دلیپ پس و پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا ”میں اپنے محسن سے لڑنا پسند نہیں کرتا۔“

اجنبی نے گرج کر جواب دیا ”تو بزدل ہے۔ یہ عورتوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال لپیٹ کر گھومنا اور بات ہے، اور کسی مرد کے ساتھ دست پنجہ لڑانا کچھ اور بات ہے۔ اگر تو واقعی اپنے باپ ہی کے تخم سے ہے تو میرے سامنے آ“ یہ کہہ کر اس نے اُس کے منہ پر تھوکا۔

دلیپ کو غیرت آ گئی۔ وہ شیر کی طرح بپھر گیا۔ اس نے وہ ڈنڈا اُس کے منہ پر دے مارا جو گدھا ہانکنے کے لیے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا لیکن اجنبی نے وار روکنے کی کوشش نہیں کی۔ دلیپ نے دوسری ضرب اس کے کان پر رسید کی، ڈنڈا ٹوٹ گیا۔ اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا۔ دلیپ جوش میں تھا، اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک مُکّا اس کے منہ پر رسید کیا جس سے اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور منہ بگڑ گیا مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔ اُس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر اس کی داڑھی تر کر رہا تھا۔ ایک کان کا اوپر والا حصّہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور اس میں سے خون کی دھارا چھوٹ رہی تھی۔ منہ ٹیڑھا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن تھا۔ پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا ”اس طرح نہیں دلیپ! تم ابھی محض بچّے ہو لیکن جگّا کوئی طفلانہ حرکت کرنا نہیں چاہتا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اُس کا جبڑا عین اصل جگہ آ گیا۔ دلیپ جگّے کا نام سُن کر خوف زدہ ہو گیا۔ اجنبی اپنی چھوی پکڑ کر بولا ”تیرے پاس چھوی ہے؟“

”نہیں!“

”تلوار ہے؟“

”نہیں!“

”صفا جنگ؟“

”نہیں!“

”مگر لاٹھی تو ہے، وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر بوری میں پھنسی ہوئی۔“

دلیپ تعجّب کے مارے چپ چاپ کھڑا تھا ”وہ جا!“ اجنبی نے پکار کر کہا۔ ”لاٹھی لے آ۔ میں نے سُنا ہے کہ تو علاقے بھر میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا جوان ہے لیکن میں امّید کرتا ہوں کہ تیری غیرت تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہیں مرنے دے گی۔“

دلیپ بہادر تھا مگر اس قسم کے شخص سے آج تک اُس کا پالا نہیں پڑا تھا۔ جگّے نے چھوی اتار کر علیحدہ رکھ دی اور صرف لاٹھی اٹھالی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو للکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔ ان کی للکار کی آواز سُن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑپھڑانے لگے۔ گیدڑوں نے ہُوا ہُوا ہُوا ہُو کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نظر آنے لگی۔

لاٹھی سے لاٹھی بج رہی تھی۔ دلیپ ہلکا پھلکا چست چالاک نوآموز اور نوجوان چھوکرا، بجلی کی طرح بے چین، جوڑ جوڑ میں پارہ۔ جگّا بھاری بھرکم، قوی ہیکل، کہنہ مشق دیو۔ موٹا ہونے کے باوجود اب بھی جس وقت سرک لگاتا تھا تو ایسا معلوم پڑتا جیسے سطحِ آب پر ٹھیکری پھسلتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگّا اسے خالی دے کر چلّایا ”ایک۔“

دلیپ نے پھر وار کیا۔ جگّا اسے بچا کر گرجا ”دو!“

دلیپ نے تیسرا وار کیا۔ جگّے نے اسے بھی روکا اور کڑکا ”تین!“

یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف لپکا "سنبھل بیچھو کرے! اب جگا وار کرتا ہے"۔ پسینے کی وجہ سے دلیپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً چھرا لے کر جھپٹا۔ جگے نے ایک لات اس کے پیٹ میں رسید کی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پُل کی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔ اب جگے کے لبوں پر خونیں مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ایک وحشی بھیڑیے کے مانند حلق سے ایک خوفناک آواز نکالی پھر دونوں ایڑیاں اٹھا کر آگے کی طرف اُچک کر اس نے بھرپور وار کیا۔ دلیپ نے چھرا سنبھالا اور چیتے کے مانند تڑپ کر ہوا میں جست کر گیا مگر کہنہ مشق استاد کا وار اپنا کام کر گیا۔ شاید پہلی صورت میں یہ وار اُس کا سر توڑ دیتا اور لاٹھی اس کے سینے تک پہنچ جاتی مگر اب بھی لاٹھی کافی زور کے ساتھ سر پر پڑی۔ سر پھٹ گیا اور وہ تڑپ کر بارہ سنگھے کے مانند نہر کے کنارے پر جا گرا۔ کچھ دیر تک تڑپتا رہا پھر سرد پڑ گیا۔

گرم گرم خون بہہ بہہ کر نہر میں ملنے لگا۔ نہر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسی معلوم پڑتی تھی جیسے خونی پُل قہقہے لگا رہا ہو۔ قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے روزنوں سے ہوا سسکیاں لیتی ہوئی چل رہی تھی۔ زرد چاند بدلی سے نکل آیا مگر اس کی شعاعیں شیشم کے گھنے پتوں میں اُلجھ کر رہ گئیں۔

جگے نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آلود پیشانی صاف کی۔ منہ ہاتھ دھویا، کان پر پگڑی پھاڑ کر پٹی باندھی۔ دلیپ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت سننے کی کوشش کی۔ پھر اُس نے چھوی اٹھائی اور دلیپ کو پیٹھ پر لاد کھیتوں کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اس واقعے کے پچیس دن بعد ـــــ دیہات میں شام ہوتے خاموشی طاری ہو جاتی ہے خصوصاً سردیوں میں تو لوگ فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں۔ گرنام کے ہاں سبھی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پا کر بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عورتیں چرخا کات رہی تھیں، بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے اور بچے شرارتوں میں مصروف۔ اتنے میں جگا اندر داخل ہوا۔ شاید ڈیڑھ برس بعد آج پھر اُس کے مضبوط ہاتھ میں چھوی چمک رہی تھی۔ سب نے اسے دیکھ کر اظہارِ مسرت کیا۔ گرنام حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ بے بے نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا مگر اس نے بتایا کہ اس کی ڈاچی (سانڈنی) باہر کھڑی ہے اور اسے جلدی واپس جانا ہے۔ چند لمحوں کے لیے اس نے سکوت کیا۔ پھر نہایت مختصر اور فیصلہ کن انداز میں کہنا شروع کیا "میں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لیے آیا ہوں کہ آپ گرنام کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں، وہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی شادی اُس شخص سے ہوگی جس سے میں چاہوں گا"۔

سب لوگ حیران تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گرنام کا ہونے والا خاوند وہ خود تھا مگر چونکہ انھیں یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی گئی تھی اس لیے وہ خاموش رہے "...... اور وہ شخص یہ ہے" یہ کہہ کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور دلیپ اندر داخل ہوا۔

ہر شخص پر حیرت زا خاموشی طاری ہو گئی۔

گرنام نہ معلوم کس دنیا میں پہنچ گئی۔ اسے شرما جانا چاہیے تھا مگر وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

جگے نے دلیپ کے کان میں کہا "اگر گرنام کو مجھ سے محبت ہوتی تو تم آج زندہ نظر نہ آتے دلیپ! تم مرد ہو۔ میں نے اچھی طرح تمھیں آزما کر دیکھ لیا ہے۔ میں چاہتا تو تمھیں قتل کر ڈالتا مگر مردوں سے مجھے محبت ہے۔ اب جب کہ تمھاری گرنام تمھارے سپرد کر رہا ہوں، امید کرتا ہوں کہ تم میرا راز ظاہر نہیں کرو گے"۔

دلیپ نے تشکر آمیز نظروں سے اپنے محسن کی طرف دیکھا۔ جگا بلند آواز میں بولا "باپو! اماں! اے بے بے! میں ان کی شادی کے لیے ضرورت سے کہیں زیادہ روپیہ دوں گا اور انھیں بہت سی زمین دوں گا"۔

باپو اصل قصہ بھانپ گیا لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ دلیپ زندہ کیونکر ہو گیا؟ مشہور ہو چکا تھا کہ دلیپ کو ڈاکوؤں نے خونی پُل پر قتل کر دیا تھا۔ دلیپ نے قصہ گھڑ کر سُنا دیا کہ خونی پُل پر ڈاکوؤں نے اُسے گھیر لیا تھا اس لڑائی میں وہ سخت زخمی ہوا اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا کہ سردار دھرم سنگھ وہاں پہنچ گئے اور وہ اس قدر تندہی سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ گئے اور انھیں بھاگتے ہی بنی پھر وہ اسے اپنے گھر لے گئے اور تیمارداری کرتے رہے۔

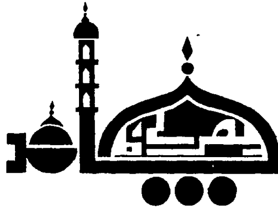
جگے کی مونچھوں کے نیچے اُس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی اگر گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ مسحور ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے جگے کا بھدا ہاتھ اپنے کنول ایسے ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلے اُس نے جگے کے بلند سینے اور اس کے غیر معمولی طور پر چوڑے شانوں کا جائزہ لیا پھر گویا مطمئن ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "تم کتنے اچھے ہو...... تم ہمیں ہمارے باپو پر رہا کرو"۔

قریب تھا کہ جگا چیخیں مار مار کر رو پڑے مگر جلدی سے پگڑی کے شملے میں منہ چھپا کر بگولے کی طرح دروازے سے باہر نکل گیا۔

شادی ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد رات کے وقت گرنام باپو کے ساتھ گھر سے باہر کریلے کی بیل کے پاس کھڑی تھی۔ معاً دور سے غبار اٹھا، کچھ سانڈنی سوار نمودار ہوئے، ان کی سجی سجائی سانڈنیاں، مردانہ اور دیو پیکر صورتیں، چمکتی ہوئی چھویاں عجیب منظر پیش کرتی تھیں۔ ان کا سالار تو غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا شخص تھا۔ گرنام اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی "باپو! وہ کون لوگ ہیں؟ یہ سب سے آگے والا شخص تو دھرم سنگھ دکھائی پڑتا ہے"۔

"نہیں بیٹی نہیں، وہ دھرم سنگھ نہیں ہے" یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر سینے سے لگا لیا۔ پھر ببول کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوتے سانڈنی سواروں کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا "آج جگا ڈاکو ڈاکا ڈالنے کے لیے جا رہا ہے"۔

●



ابوالمنصور سرمدی

۹۷ھ کی ایک سرد اور تاریک رات تھی۔ چراغ تو بڑی بات ہے، نومولود بچی کو سرد سمرقندی ہواؤں سے بچانے کے لیے کوئی کپڑا تک نہیں تھا۔ آخر بچی کی ماں اور بہنوں کے اصرار پر غیرت مند باپ کو پڑوسی کے در پہ جانا پڑا، تاکہ وہ چراغ کے لیے تھوڑا سا تیل قرض لاسکے۔ ابھی وہ پڑوسی کے گھر تک پہنچا ہی تھا کہ اس نے سوچا، آج تک یہ ہاتھ کسی کے سامنے نہیں پھیلا ہے۔ عالم الغیب ہماری حالت سے واقف ہے۔ کیا وہ یہ بچی خوش گوار موسم اور دن کے اُجالے میں ہمارے پاس نہیں بھیج سکتا تھا؟ کہیں ہم آزمائش میں تو مبتلا نہیں ہیں؟ وہ اُلٹے قدموں گھر واپس آگیا۔ آہٹ سن کر بڑی لڑکی نے پوچھا

"بابا تیل ملا؟"

"نہیں بیٹی!" باپ نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا۔ "میں نے بہت دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔"

"آپ کسی دوسرے دروازے پر چلے جاتے۔" لڑکی نے بے چینی سے کہا۔ "روشنی مل جاتی تو ہم اس معصوم کو ٹھنڈی ہوا سے بچانے کے لیے کوئی کپڑا ڈھونڈ ہی لیتے۔"

"دوسرا دروازہ؟" باپ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بابا دوسرا دروازہ۔" لڑکی نے جھنجلا کر کہا۔ "آپ نے دستک دے کر دیکھا تو ہوتا۔"

"دوسرا دروازہ تو بیٹی ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔" باپ نے نرمی سے جواب دیا۔ "مگر اُس پر دستک دینے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ رات تاریک اور سرد سہی مگر ہمیں شاید تیل کی ضرورت نہیں ہے۔" اُس نے آسمان کی طرف انگلی اُٹھائی۔ "ہماری ضروریات وہ ہم سے بہتر جانتا ہے۔ اُسے تو اُن باتوں کا بھی علم ہے جو ہم نہیں جانتے۔"

ان چند لفظوں میں ایسا اُجالا تھا اور یقین کی اتنی گرمی تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں گھر والے سکون سے لیٹ گئے لیکن غریب باپ کو نیند نہیں آئی۔ اُسے آج پہلی بار اپنی مفلسی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ آخر کس لغزش نے اُس پر اور اُس کے خاندان پر رحمت کے دروازے بند کر دیے ہیں؟ وہ مسلسل سوچ رہا تھا اور اسی سوچ میں تھوڑی دیر کے لیے اُس کی آنکھ جھپک گئی۔ اُس نے خود کو دربارِ رسالت میں دیکھا۔ حضور نے اُس سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا صرف چراغ کے لیے کوئی اتنا پریشان ہوتا ہے؟"

اُس نے پشیمان ہو کے سوچا کہ اگر وہ اپنی بیٹی کے کہنے پر پڑوسی کے دروازے تک نہ جاتا تو حضوری کے اس موقع پر نگاہیں ندامت سے نہ جھکتیں۔ اُس نے حضورؐ سے کہنا چاہا۔ "آقا! غلام سے بڑی لغزش ہوگئی مجھے معاف کر دیجیے۔ آیندہ آپ مجھے بے صبر بندوں میں نہیں پائیں گے۔" پشیمانی نے یہ بھلا دیا تھا کہ جس نے بچی عطا کی ہے وہی اس کا چہرہ دیکھنے اور اسے سردی سے بچانے کا انتظام بھی کرے گا۔ اب میں بے سوال کھڑا ہوں کیونکہ اللہ کے پاس تمام سوالوں کے جواب موجود ہیں اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔"

رسولِ اکرمؐ کی آواز آئی۔ "تیری بچی اندھیرے میں اس طرح آئی ہے جیسے

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

تذکرۃ اولیا	انوار اصفیا	طبقات الکبرا	سفینۃ الاولیا	رابعہ بصری
شیخ فریدالدین عطار	ناشر: شیخ غلام علی	عبدالوہاب شعرانی	دارا شکوہ	وداد السکاکینی

رات کے بعد سورج نکلتا ہے۔ اس کی روشنی دور دور پھیلے گی۔ تیری یہ بچی بڑا نام پیدا کرے گی۔ اور اس بچی کی شفاعت کے سبب میری امت کے ایک ہزار افراد بخشے جائیں گے۔"

بوڑھے شخص پر لرزہ طاری تھا اور وہ رسولِ اکرمؐ کے خطاب سے ہوش کھو بیٹھا تھا کہ پھر آواز آئی "والئ بصرہ ہم پر روزانہ سو مرتبہ درود بھیجتا ہے اور جمعے کی شب اس کی جانب سے ہمیں چار سو درود ملتے ہیں، آج بھی جمعے کی شب تھی مگر آج ہم تک اس کے درود نہیں پہنچے لہٰذا اسے ہمارا پیغام پہنچا دو کہ وہ کفارے کے طور پر تمہیں چار سو درہم دے دے۔"

صبح ہوئی تو نومولود بچی کے باپ کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ایک معمولی اندھیرے نے اسے دیدارِ رسولؐ کی روشنی تک پہنچا دیا تھا۔ اس کی بے چینی بڑھ گئی کہ اتنی بڑی سرکار کو اتنی چھوٹی سی بات کے لیے ایسی زحمت ہوئی؟ غلام کی تشفی کے لیے آقا نے خود اسے دربار میں طلب کر لیا، وہ اپنی بے صبری پر بہت دیر تک گریہ و زاری کرتا رہا۔ پھر حکم کے مطابق ایک تحریر لکھ کے والئ بصرہ کے ایوان میں جا پہنچا۔ دربان کے ہاتھوں اس نے تحریر اندر پہنچوائی۔ والئ بصرہ نے رقعہ پڑھا تو دیوانہ وار رونے لگا کہ آقا نے اپنے غلام کو یاد کیا ہے۔ اس خوشی میں اس نے اسی وقت حکم جاری کیا کہ ابھی دس ہزار درہم فقرا میں تقسیم کیے جائیں اور مسلسل چار دن تک اس دروازے سے کوئی سوالی خالی ہاتھ نہ لوٹے۔ پھر وہ ننگے سر ننگے پاؤں باہر آیا اور بوڑھے شخص کے قدم چھو کے کہا "حضرت! آپ میرے آقا کے فرستادہ ہیں۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب آج سے آپ کی ملکیت ہے لیکن حکم چونکہ چار سو درہم کا ہوا ہے اس لیے اس وقت یہ چار سو درہم قبول فرمائیے۔" وہ کچھ توقف کے بعد بولا "بزرگ! آپ کو میرے آقا کی قسم آئندہ جب بھی آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو مجھے حکم دیجیے، یہ امر میرے لیے عین سعادت کا باعث ہوگا۔ آپ کی یہ تحریر ایک شفاعت نامہ ہے۔ میں اسے فرشتوں کو دکھانے کے لیے اپنے کفن میں لے جاؤں گا۔"

بچی کا نام رابعہ رکھا گیا۔ جب تک رابعہ کا باپ زندہ رہا گھر میں کسی شے کی کمی نہ ہوئی لیکن جب رابعہ نے ہوش سنبھالا تو باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور بصرے میں دو برس تک ایسا قحط پڑا کہ مٹھی بھر اناج کے لیے جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ پڑا۔ اس نفسا نفسی میں رابعہ بھی تینوں بہنوں کے ساتھ گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ بصرے کے لوگ قافلہ در قافلہ دمشق، بغداد، سمرقند اور بخارا کی طرف جا رہے تھے۔ ہر طرف لوٹ مچی ہوئی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ اس افراتفری میں گیارہ سالہ رابعہ اپنی بہنوں سے بچھڑ گئی۔ رابعہ نے ابھی تک نہ دنیا دیکھی تھی، نہ دنیا کے لوگ دیکھے تھے، وہ گھر ہی میں رہی تھی، اسے نہ آزمائشوں کا علم تھا اور نہ پیٹ کے دوزخ کا تجربہ۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی، وہ صرف بھوک اور پیاس کی شدت سے واقف تھی۔ بیابانوں، صحراؤں اور اجنبی بستیوں کی سنسان راتوں میں وہ کبھی اپنی بہنوں کو آواز دیتی اور کبھی رو رو کر اپنے بابا کو پکارنے لگتی۔

اسی عالم میں ایک دن وہ ایک چھوٹے سے قصبے میں سڑک کے کنارے بیٹھی رو رہی تھی، سو اتفاق سے ایک بردہ فروش کی اس پہ نظر پڑ گئی۔ دوسری صدی ہجری میں بھی اگرچہ غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت بری سمجھی جاتی تھی پھر بھی بغداد کے اس بازار میں سب سے زیادہ چہل پہل رہتی تھی جہاں مردوں، لڑکوں، عورتوں اور لڑکیوں کا مویشیوں کی طرح نیلام کیا جاتا تھا۔ بردہ فروش چلا چلا کے لوگوں کی توجہ رابعہ کی طرف مبذول کراتا رہا لیکن ایک دبلی پتلی فاقہ زدہ بچی کے لیے اسے کوئی خریدار نہیں مل رہا تھا۔ رابعہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ یہ کیسی آوازیں لگائی جا رہی ہیں؟ اسی دوران میں مغرب کی نماز کا وقت آ پہنچا۔ وہ اذان کی آواز سن کے حسبِ عادت نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ رابعہ کو بچپن سے یہ بتایا گیا تھا کہ نماز میں خدا بندے کے سامنے ہوتا ہے اور جب خدا سامنے ہوتا ہے تو کوئی دوسری چیز کوئی دوسری آواز سامنے نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ نماز کی محویت میں اسے معلوم نہیں ہوا کہ ایک ظالم و جابر شخص نے انتہائی کم قیمت پر اسے خرید لیا ہے۔

اس کا مالک ایک جلاد صفت شخص تھا۔ وہ سنگدل اور سنگدل رابعہ سے اتنی محنت لیتا، اتنی مشقت کراتا کہ رابعہ کی کئی کئی نمازیں قضا ہو جاتیں، وہ صبر و شکر سے سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ اسی عالم میں کئی سال بیت گئے۔ چہرے پر نقاب ڈالنے کے دن آ گئے لیکن کنیزوں کے لیے نقاب کی ممانعت تھی اور امتحان ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ایک دن وہ کنوئیں سے پانی کا گھڑا بھر کے گھر آ رہی تھی کہ ایک بدمعاش نے دور سے اسے تاکا اور اس کے پیچھے لگ گیا۔ رابعہ نے گھبرا کے رفتار تیز کر دی۔ بدمعاش بھی تیزی سے راستہ کاٹ کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ یہ خیال آتے ہی کہ ایک نامحرم نے بری نیت سے مجھے دیکھا ہے، رابعہ نیم بے ہوشی سے تیورا کر وہیں گر پڑی اور اس طرح گری کہ بدن کا پورا بوجھ ایک ہاتھ پر پڑا اور وہ ہاتھ شانے سے جدا ہو گیا۔ بدمعاش یہ صورتِ حال دیکھ کے بھاگ کھڑا ہوا۔ رابعہ کو جب ہوش آیا تو درد کی شدت سے اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ اس نے وہیں سجدے میں گر کے دعا کی کہ "بارِ الٰہا! میں تو پہلے ہی بہت بے یار و مددگار تھی۔ اب تو نے مجھ سے ایک ہاتھ بھی لے لیا۔ خیر! اگر تیری مرضی یہی ہے تو ٹھیک ہے۔ تیری مرضی ہی میری زندگی کی سب سے بڑی مسرت ہے، تو مجھے ہر حال میں شکر گزار بندوں کی صف میں پائے گا۔

اسی وقت رابعہ بصری کو پہلی بار کہیں بہت قریب سے ایک آواز سنائی دی کہ "اے رابعہ! غم نہ کر، آنسو پونچھ ڈال۔ کل تجھے وہ مرتبہ حاصل ہوگا کہ تیرے رب کے مقرب فرشتے بھی تجھ پر رشک کریں گے۔"

رابعہ نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا لیکن آواز دینے والا کہیں نظر نہ آیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ شاید یہ کوئی آواز نہیں تھی بلکہ اس کی اپنی آہوں کی صدائے بازگشت تھی۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ کسی نے پھر کہا "رابعہ! گلی کوچوں کی طرف نہ دیکھ، اپنے دل کی بستی دیکھ۔ طلبِ صادق کے تمام راستے اسی بستی سے گزرتے ہیں۔"

رابعہ اس غیبی ندا پہ مبہوت رہ گئی پھر اس کی مسرت کا یہ عالم ہوا کہ ٹوٹے ہوئے ہاتھ کا درد بھی اسے عزیز ہو گیا۔ وہ اپنا ہاتھ بار بار چومتی تھی۔

دوسرے دن رابعہ نے شکرانے کا روزہ رکھا لیکن روزے میں بھی وہ اپنے سفاک مالک کی عنایات کا نشانہ بنی رہی کیونکہ اس کے مالک کو اس کے روزے

یا اُس کی عبادت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ اپنے احکام کی جلد سے جلد تعمیل چاہتا تھا۔ جیسے ہی ایک کام ختم ہوتا اُسے فوراً دوسرے کام میں لگا دیا جاتا۔ رسم کے مطابق کنیز یا غلام کے لیے مالک کے ہر حکم کی تعمیل فوری طور پر ضروری سمجھی جاتی تھی۔ رات گئے تک رابعہ مسلسل کام میں مصروف رہی، پھر جب کام ختم ہوا تو وہ پوری رات عبادت میں گزارنے کے لیے اپنی کوٹھری میں آگئی۔ رات کے آخری حصّے میں مالک کو پھر اس سے کوئی کام پڑ گیا اور وہ رابعہ کو تلاش کرتا ہوا کوٹھری تک پہنچ گیا۔ رابعہ ایک کونے میں سر بسجود تھی۔ مالک نے حیرت سے دیکھا کہ ایک معلق نور رابعہ کے سر پر فروزاں ہے، رابعہ بصری کو اس بات کا ہوش نہیں تھا کہ کس نے آواز دی ہے؟ کون آیا ہے؟ اور کون اس کے قریب کھڑا ہے؟ وہ اُس وقت خشوع و خضوع سے اپنے پروردگار کے حضور آنسو بہا رہی تھی۔ سجدہ گاہ اس کے آنسوؤں سے تربتر تھی اور وہ زیرِ لب کہہ رہی تھی "خدایا! اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اپنی زندگی کی ہر سانس صرف تیرے لیے وقف کر دیتی۔ مجھ سے تیری بندگی کا حق پوری طرح ادا نہیں ہو سکا ہے، مجھے معاف کر دے میرے مولا تیری مشیت ہی نے مجھے غیر کا محکوم بنایا ہے اور اسی لیے میں اس کا ہر ظلم مسکرا کے برداشت کرتی ہوں۔ جو کچھ ہے تیری ہی طرف سے ہے اور تیری طرف سے ہے تو بندی کے لیے انعام ہے۔"

مالک نے جب وہ نور دیکھا اور رابعہ کی لرزہ خیز فریاد سنی تو خوف سے کانپ اُٹھا اور اُلٹے قدموں اپنے بستر پر آکے گر پڑا۔ اُس نے اپنی زندگی میں ایسا اثر انگیز منظر اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ دہشت سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اُس نے رابعہ کے ساتھ اب تک جو ظلم روا رکھے تھے، ان کا شمار مشکل تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان کا ازالہ کس طرح کرے؟ وہ صبح تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور اس سے پہلے کہ رابعہ صبح کے وقت کام پر واپس آتی، وہ اس کی کوٹھری میں پہنچا اور بے اختیار اس کے قدموں پر گر گیا۔ وہ رو رو کر رابعہ سے اپنے پچھلے رویّے کی معافی مانگ رہا تھا "رابعہ! اگر آپ یہاں قیام فرمانا چاہیں تو میں ساری عمر آپ کی غلامی کے لیے تیار ہوں، ہر وہ ظلم مجھ پر کیجیے جو نادانستگی میں، میں نے آپ پر کیا ہے۔ آپ آج سے آزاد ہیں اور جہاں چاہیں جا سکتی ہیں مگر میری التجا ہے کہ آپ یہیں رہیں۔ یہ میری خوش بختی ہوگی۔"

رابعہ بصری خاموشی کے ساتھ کوٹھری سے باہر نکل کے آبادی سے دُور ایک سنسان مقام پر آگئی اور یہاں اس طرح عبادت میں مشغول ہو گئی کہ اس کے لیے دن اور رات کی گردشوں اور بدلتے موسموں کا امتیاز ختم ہو گیا۔ یہاں سے رابعہ کے جذب و سلوک کا سفر شروع ہوتا ہے۔ بستی کے لوگوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی شب و روز عبادت میں مستغرق رہتی ہے تو وہ اُس کے گرد جمع ہونے لگے اور رابعہ کا نام عقیدت و احترام سے لیا جانے لگا۔

رابعہ بصری کا یہ معمول تھا کہ وہ ایک ہزار رکعت نماز روزانہ پڑھتی تھیں۔ شیخ فریدالدین عطار کا کہنا ہے کہ رابعہ پردہ نشینوں کی مخدومہ یکے از خاصانِ خدا، سوختۂ عشق، قربِ الٰہی کی شیفتہ تھیں اور پاکیزگی میں مریمِ ثانی تھیں۔ رابعہ بصری کی عبادتوں کا چرچا دُور دُور تک پھیل گیا تھا اور اولیا اللہ اور مشائخِ عظام پند و نصائح حاصل کرنے کے لیے دُور دُور سے ان کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ خدا کے ہاں بندۂ مرد و زن کے چہروں کی تقسیم سے نہیں بلکہ تسلیم و رضا سے پہچانے جاتے ہیں، اللہ صورت نہیں، قلب دیکھتا ہے، رابعہ بصری کا قلب خدا کی تجلیوں کا ایک آئینہ تھا۔

طویل چلّہ کشی اور عبادت کے بعد ان کے دل نے صدا دی کہ "اب اٹھو، محبوب کی جلوہ گاہ کا تماشا دیکھو۔ دیکھو کہ اُس کا گھر کس آن کا، کس شان کا ہے" چنانچہ آپ اپنے گدھے پر ایک قافلے کے ساتھ حج کے لیے چل پڑیں۔ گدھا دو چار منزلوں کے بعد ہی مر گیا۔ رابعہ بصری نے اپنا سامان کاندھے پر لاد کے سفر جاری رکھنا چاہا۔ قافلے کے کچھ لوگ ان کے مراتب سے آگاہ تھے۔ انھوں نے ان سے دست بستہ عرض کیا کہ "سامان اُٹھانے کی سعادت ہمیں عطا کی جائے۔"

جواب ملا "میں نے یہ سفر تمھارے سہارے نہیں کیا ہے جس کے گھر جا رہی ہوں اس کی مرضی یہی ہے کہ شوقِ دیدار ہے تو ان آداب کے ساتھ آؤ جو عشق کے لیے لازمی ہوتے ہیں۔"

درخواست گزاروں نے مزید بحث مناسب نہیں سمجھی۔ عشق میں ویسے بھی ناصح کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ قافلہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ پھر جب رابعہ بصری نے دیکھا کہ قافلہ اب خاصی دور نکل گیا ہے تو انھوں نے جلال کے عالم میں اپنا سامان ریت کے ایک ٹیلے پر پھینک دیا اور آسمان کی جانب سر اٹھا کے کہا "اللہ! میں نے جو کچھ قافلے والوں سے کہا تھا، وہ سب جھوٹ ہے۔ میرا عشق اپنی جگہ ہے لیکن میزبانی کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ کیا ایک کمزور، نادار اور عاجز عورت کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے؟ تو نے پہلے تو مجھے اپنے گھر مدعو کیا، پھر راستے میں میرا گدھا مار ڈالا، اور اب تو نے مجھے اس بیابان میں تنہا چھوڑ دیا ہے؟"

ابھی یہ شکوہ ختم نہیں ہوا تھا کہ گدھے کے بے جان لاشے میں حرکت ہوئی اور وہ ایسی بے تابی سے اٹھا جیسے کسی نے اُسے سوتے سے جھنجوڑ کر کھڑا کر دیا ہو۔ رابعہ بصری مسکرانے لگیں اور ان کا چہرہ پھر آسمان کی جانب اٹھ گیا۔ وہ کہنے لگیں "محبوب! دیکھو مجھے اسی طرح تمھاری محبت حاصل رہے ورنہ میں عشق میں جان کا نذرانہ پیش کرنا بھی جانتی ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے گدھے پر دوبارہ سامان لادا اور اکیلی مکّے کی سمت روانہ ہو گئیں لیکن مکّے کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایک وادی میں رک گئیں اور سوچنے لگیں کہ کہاں تو یہ اشتیاق تھا کہ پلکوں سے راستہ صاف کرتی ہوئی دیارِ حبیب تک پہنچوں گی اور اب کہاں یہ عالم ہے کہ آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے؟ اس مسئلے پر وہ جتنا غور کرتیں، ذہن الجھتا جاتا۔ ناچار انھوں نے گدھے سے سامان اتارا اور اسی جگہ عبادت میں مشغول ہو گئیں۔ ہزاروں نفل روزانہ پڑھتے ہوئے کئی دن گزار دیے۔ انھوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ جب تک وہاں سے سلسلہ جنبانی نہیں ہوگی، آگے نہیں بڑھوں گی۔ پھر ایک رات ذہن سے یکایک پردہ اُٹھ گیا۔ آپ اسی وقت سجدے میں گر گئیں۔ "ربِّ

العالمین! میری تخلیق خاک سے ہوئی ہے اور اپنا گھر تو نے پتھر سے تعمیر کیا ہے۔ خاک اور پتھر کی آویزش کیسے ہوگی مولا؟ وہ دیوار گرادے اور بلا واسطہ مجھ سے بات کر۔ میں مکان سے نہیں مکین سے ملنے آئی ہوں۔"

بلا واسطہ جواب آیا "رابعہ! کیا تو نظامِ عالم درہم برہم کر کے اہلِ عالم کا خون اپنی گردن پر لینا چاہتی ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ جب موسیٰ نے دیدار کی خواہش کی تھی اور ہم نے اپنی تجلیات میں سے ایک ادنا تجلی طور پر ڈالی تھی تو طور پاش پاش ہو گیا تھا؟ اپنا سفر جاری رکھ۔"

محبوب کے جمال و جلال دیکھنے کا یہی اشتیاق رابعہ بصری کو دوسرے سال بھی حج کے سفر پر لے گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری طرف سے ابراہیم ادھم چودہ سال سے ہر قدم پر نمازِ شکرانہ ادا کرتے ہوئے کعبے کی طرف آرہے تھے اور اب کعبے کی حدود میں داخل ہونے والے تھے۔

رابعہ بصری مکے کے قریب اُس وادی میں پہنچیں جہاں گزشتہ سال ان کے قدم خود بخود رک گئے تھے۔ انھوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو کعبہ خود ان کی سمت چلا آرہا تھا۔ وہ جھنجلا گئیں۔ "اے پتھر کے گھر! اپنی جگہ واپس جا، میرا ذوق و شوق دیکھ کہ میں تیری سنگی دیواروں سے نہیں، اپنے اُس محبوب سے ملنے آئی ہوں جو یہ کہتا ہے کہ کعبہ میرا گھر ہے۔ تجھے شاید معلوم نہیں کہ مجھے کعبے کے حسن سے زیادہ جمالِ خداوندی کی تمنا ہے۔"

دوسری طرف ابراہیم ادھم حرم میں داخل ہوگئے اور آخری رکعت کے بعد جب انھوں نے کعبے پر نظر ڈالنی چاہی تو کعبہ اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ وہ بلک بلک کے رو پڑے۔ مسلسل چودہ برس کی کڑی ریاضت انھیں رائیگاں اور بینائی زائل معلوم ہونے لگی۔ اسی لمحے غیبی ندا آئی "ابراہیم! تیری بینائی زائل نہیں ہوئی بلکہ کعبہ ایک خاتون کے استقبال کے لیے گیا ہے اور وہ عشق گرفتہ اُس سے الجھ کر رہ گئی ہے۔ اب اُس وقت تک انتظار کر جب تک عشق اپنی بے تابیوں کا پورا اظہار نہ کر لے۔"

ابراہیم پر رقت طاری ہو گئی۔ انھوں نے روتے ہوئے پوچھا "میرے معبود! وہ قابلِ احترام خاتون کون ہے؟"

جواب ملا "وہ دیکھ! رابعہ اب تیرے سامنے آرہی ہے۔"

ابراہیم ادھم نے نگاہ اٹھا کے دیکھا تو رابعہ بصری کمر جھکائے لاٹھی ٹیکتی چلی آرہی تھیں اور کعبہ پھر اپنی جگہ ایستادہ تھا۔ رابعہ کے چہرے سے نور منعکس ہو رہا تھا۔ ابراہیم ادھم والہانہ آگے بڑھے اور انھوں نے رابعہ بصری سے کہا "عظیم المرتبت خاتون! تمھارے خیر مقدم کے لیے کعبہ اپنی جگہ سے ہل گیا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ کل کائنات جل کر راکھ ہو جائے؟ آخر تمھیں اس سے کیا حاصل ہوگا؟"

رابعہ بصری نے ان کا سوال سکون سے سنا اور کہا "ابراہیم! ہنگامہ میں نے نہیں، تم نے شروع کر رکھا ہے۔ تم چودہ برس تک مسلسل رینگنے کے بعد اب کعبے تک پہنچے ہو۔"

ابراہیم ادھم بولے "تاخیر کی شکایت سے پہلے تاخیر کا سبب تو پوچھا ہوتا خاتون! راستے بھر میں نے ہر قدم پر رُک کے شکرانے کی نماز ادا کی ہے اسی وجہ سے یہاں پہنچنے میں اتنی دیر ہوئی۔"

"اپنا تماشا بناتے ہوئے آؤ گے تو دیر نہیں لگے گی؟" رابعہ بصری نے جواب دیا۔ "البتہ اگر کبھی جلدی آنا ہو تو میری طرح محبت، عجز اور انکسار کے ساتھ شوقِ دیدار کے مختصر راستے سے آنا، جلدی آ جاؤ گے۔"

پھر دونوں نے رو رو کر کعبے کا طواف کیا اور رابعہ بصری نے حج ادا کرنے کے بعد انتہائی عاجزی سے دعا کی کہ "پروردگار! شوق دیا ہے تو تکمیلِ شوق بھی کر۔ تو نے حج کے اجر کا وعدہ کیا ہے اور یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ صبر و شکر کا اجر بھی ملے گا۔ اگر تو میرا حج قبول نہیں کرتا تو شوقِ دید کی ناکامی پر صبر کا اجر ہی عطا کر دے۔"

ابراہیم ادھم نے رابعہ کی دعا سنی تو لرز کر رہ گئے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر رابعہ کچھ دن اور زندہ رہ گئیں تو کیا ہوگا؟ یا تو نظامِ عالم برقرار رہے گا، یا رابعہ زندہ رہیں گی۔ دونوں کی بیک وقت موجودگی ناممکن ہوتی جا رہی ہے۔

رابعہ بصری حج سے واپس آئیں تو ان کی بے قراری حد سے سوا ہو چکی تھی۔ وہ رات رات بھر عبادت کرتیں اور ہمہ وقت روتی رہتیں۔ فراقِ محبوب میں ان کا یہ حال ہو گیا تھا کہ انھوں نے مکمل گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ ایک بار کشف کے عالم میں انھوں نے دیکھا کہ فرشتے ایک مُردے کے ساتھ سختی سے پیش آ رہے ہیں۔ رابعہ نے گھبرا کے زیرِ لب کہا "رحم خداوندا! اس سے کیا تقصیر ہو گئی ہے؟"

جواب آیا "اس شخص نے اپنی زندگی میں ایک بار ایک ایسا لفظ منہ سے نکال دیا تھا جس سے مخاطب کی دل آزاری کا پہلو نکل سکتا تھا۔"

رابعہ بصری خوف و دہشت سے بُری طرح رونے لگیں۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ زندگی بھر اپنا مدعا صرف قرآنی آیات کے ذریعے ظاہر کیا کریں گی تاکہ کسی لفظ کی گرفت نہ ہو سکے چنانچہ زندگی کے آخری لمحے تک وہ اپنا مافی الضمیر قرآنی الفاظ میں ادا کرتی رہیں۔

حج کا زمانہ پھر آ رہا تھا انھوں نے سوچا کہ گزشتہ سال تو کعبہ میرے استقبال کو آیا تھا لیکن اس بار میں خود کعبے کا استقبال کروں گی۔ چنانچہ وہ بستی سے نکل کے دور جنگل میں پہنچیں اور کعبے کی سمت انھوں نے کروٹ کے بل لڑھکنا شروع کر دیا۔ انھوں نے اپنا پورا وجود کسی پتھر کی طرح تبدیل کر لیا تھا۔ حشرات الارض، موسم کے تغیرات، کوہ و بیاباں، ندی نالے، جو بھی رابعہ بصری کے راستے میں مزاحم ہوا ان کے عشق کی حدت کی تاب نہ لا سکا۔ پورا راستہ ایک مخملیں فرش بن گیا۔ اس طرح وہ برابر سات برس تک کروٹ کے بل لڑھکتی ہوئی عرفات پہنچ گئیں۔ ابھی عرفات کی حدود میں داخل ہی ہوئی تھیں کہ ایک آواز ان کے کانوں میں گونجی "رابعہ! اس طلب میں کیا رکھا ہے؟ تو نے بصرے ہی میں ہم سے کہہ کے دیکھا ہوتا، ہم وہیں تجھے اپنی تجلی سے نواز سکتے تھے۔"

رابعہ نے عرض کیا "پروردگار! بے شک میں غلطی پر تھی مگر یہ جانِ ناتواں تیری تجلیوں کا بار کس طرح اٹھا سکتی ہے۔ مجھے معاف کر دے۔ میں اپنا خاکی جسم نوری بنانے کی طالب ہوں اور آج تیرے حضور فقر کی صفت مانگنے آئی ہوں۔"

"رابعہ!" ندا آئی۔ "فقر کا رتبہ تو ہمارے قہر کے مترادف ہے۔ ہم نے یہ قہر صرف ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیا ہے جو ہم سے اس طرح متصل ہو جاتے ہیں کہ ہم میں اور ان میں سر مو فرق نہیں رہتا۔ انھیں قربت کی اس منزل تک پہنچا کے ہم انھیں لذتِ وصال سے محروم کر دیتے ہیں اور ہجر کی آگ میں جھونک دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے اُن طلب گاروں پر کوئی حزن و ملال طاری نہیں ہوتا بلکہ وہ حصولِ قرب کے لیے اور شدت سے سرگرم ہو جاتے ہیں۔"

رابعہ بصری اشک بار ہو گئیں۔ وہ مجسم شوق بن گئیں اور التجا کرنے لگیں "پھر مجھے وہ آتشِ فراق ہی دے دے تاکہ میں عرش کی بلند منزل پر پہنچ جاؤں۔"

آواز ابھری "رابعہ! کیا دیکھتی نہیں کہ تو ابھی دنیا کے ستر پردوں میں مستور ہے۔ ان پردوں سے نکلنے کے لیے بڑے بڑے چاہنے والوں کو زندگی بھر جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ پھر بھی کوئی کسی پردے میں الجھ کے گر پڑتا ہے اور کوئی کسی پردے میں لیکن جو ان پردوں سے نکل کر ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں، انھیں ہم اپنے قہر کی لذتوں سے نوازتے ہیں اور اس مقام تک بہت کم طالب پہنچتے ہیں۔"

رابعہ بصری نے پھر گریہ و زاری شروع کر دی۔ روتے روتے بولیں۔ "مجھے فقر کی نعمت سے مالا مال کر دے معبود! میں اس آزمائش میں پوری اترنے کی کوشش کروں گی۔"

جواب آیا۔ "تو جب تک یہ سوال ستر پردوں سے باہر آ کے نہیں کرتی، اُس وقت تک تجھے فقر کا نام بھی نہیں لینا چاہیے۔"

مگر جب رابعہ بصری کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو صدا گونجی "نگاہ اٹھا اور سامنے دیکھ!"

رابعہ نے نگاہ اٹھائی۔ ہوا میں خون کا ایک سمندر معلق نظر آیا۔ مد و جزر کی وہ کیفیت تھی کہ ایک لہر عرشِ معلا تک پہنچتی تھی اور دوسری پاتال تک جاتی تھی۔ چند لمحوں کے لیے انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے یہ بے قرار لہریں پوری کائنات بہا لے جائیں گی۔ ان کے بدن پر رعشہ طاری ہو گیا۔ انھوں نے دریافت کیا۔ "خداوندا! یہ سب کیا اور کیوں ہے؟"

جواب ملا "یہ ہمارے عشاق کی خوں فشاں آنکھوں کا سمندر ہے، جو ہماری راہ میں چلے تھے مگر چند قدم چل کے خون رونے لگے۔"

رابعہ بصری نے کہا "پروردگار! کیا میں اُن خوش نصیبوں کی ایک جھلک دیکھ سکتی ہوں؟"

جس لمحے وہ یہ سوال کر رہی تھیں انھیں نسوانی معذوری ہو گئی۔ ندا

آئی۔" رابعہ! دیکھا؟ تو نے سات برس تک لڑھکتے ہوئے ہم تک پہنچنے کی کوشش کی ہے مگر جب تو قرب کی منزل تک پہنچی تو ایک حقیر سی علت نے تیری راہ مسدود کر کے رکھ دی۔ بشریت کی ایک حد معین کر دی گئی ہے۔"

رابعہ نے پھر التجا کی: "اگر میری بشریت کی حد یہی ہے تو یہ حد مجھے تیرے گھر میں رہنے سے روک رہی ہے۔ مجھے بصرے واپس جانے کی اجازت دے۔ اب میں تیرے ذکر ہی کو تیرا جمال سمجھوں گی۔"

رابعہ بصرے واپس آگئیں اور جب تک زندہ رہیں، عبادت خانے کے گوشۂ تنہائی سے باہر نہیں نکلیں۔ وہ خدا اور اس کی قدرت پر کامل یقین رکھتی تھیں۔ ایک دن دو درویش رابعہ بصری کے گھر پہنچے۔ انھوں نے کہا۔ "رابعہ! ہم کئی دن کے بھوکے ہیں۔ ہمیں کھانا دے۔ صرف تیرے گھر ہمیں حلال رزق میسر آسکتا ہے۔"

رابعہ بصری نے انھیں عزت و تکریم سے بٹھایا۔ اس وقت گھر میں صرف دو روٹیاں تھیں۔ رابعہ وہ روٹیاں درویشوں کو پیش کرنے ہی والی تھیں کہ دروازے پر ایک سائل نے صدا دی۔ وہ بھی روٹی ہی کا سوال کر رہا تھا۔ رابعہ نے وہ دونوں روٹیاں مہمانوں کے بجائے سائل کو دے دیں اور مہمانوں کے پاس خالی ہاتھ جا کر بیٹھ گئیں۔ درویشوں نے کہا "رابعہ! کیا تو نے سنا نہیں کہ ہم کئی دن کے بھوکے ہیں؟ اب ہم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ زیادہ دیر انتظار کر سکیں۔ گھر میں جو کچھ ہے جلدی سے لے آ۔ ہمیں ابھی ایک طویل سفر پر بھی جانا ہے۔"

رابعہ نے کہا۔ "خدا کا وعدہ ایفا ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ چند منٹ صبر کرو۔ خوانِ نعمت آنے ہی والا ہے۔"

وہ یہ گفتگو کر ہی رہی تھیں کہ ایک کنیز خوان لے کے حاضر ہوئی۔ اس میں خوش ذائقہ سالنوں کے ساتھ کئی روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بھوکے درویشوں نے بے اختیار کہا۔ "رابعہ! بلاشبہ خدا کا وعدہ سچا ہے۔ اب جلدی سے خوان ہمارے سامنے رکھ تاکہ ہماری اشتہا آسودہ ہو۔"

رابعہ بصری نے جواب دیا۔ "درویشو! پہلے مجھے اس بات کا یقین کر لینے دو کہ یہ خوان کہیں غلط تو نہیں آگیا ہے؟" انھوں نے جلدی جلدی روٹیاں گنیں۔ اٹھارہ روٹیاں تھیں۔ انھوں نے کنیز سے کہا۔ "یہ خوان اپنی مالکہ کے پاس واپس لے جاؤ۔ یہ ہمارے لیے نہیں ہے۔"

کنیز نے دست بستہ عرض کیا۔ "مالکہ نے یہ آپ ہی کے لیے بھجوایا ہے یقین کیجیے۔ کنیز سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی ہے۔"

"زبردست غلطی سرزد ہوئی ہے۔" رابعہ بصری بولیں۔ "یہ خوان ہمارا نہیں ہوسکتا۔ اپنی مالکہ کے پاس جا کے کہو کہ وہ تمھیں صحیح جگہ روانہ کرے۔"

کنیز اصرار کرتی رہی۔ دونوں درویش بھی بضد تھے کہ جو کچھ آگیا ہے غنیمت ہے، صبر و شکر سے اسے قبول کر لینا چاہیے لیکن رابعہ بصری اپنی بات پر قائم رہیں کہ "جو چیز ہمارے لیے نہیں ہے اس پر ہمارا کوئی حق بھی نہیں ہے۔"

ناچار کنیز خوان واپس لے گئی۔ اس نے جا کے اپنی مالکہ سے تمام حال کہا۔ مالکہ نے خوان غور سے دیکھا اور کچھ سوچنے لگی۔ پھر کنیز سے بولی۔ "رابعہ نے سچ کہا ہے۔ اس خوان میں دو روٹیاں اور رکھ کے خوان دوبارہ ان کی خدمت میں لے جاؤ۔"

اس بار جب رابعہ بصری نے روٹیاں شمار کیں تو ان کی تعداد بیس تھی۔ چہرے پر ایک ملکوتی مسکراہٹ بکھر گئی۔ "ہاں! اس بار یہ صرف ہمارے لیے بھیجا گیا ہے۔" خوان انھوں نے درویشوں کے سامنے رکھ دیا۔ "آپ جتنا کھا سکتے ہوں کھا لیجیے۔ جو بچے وہ زادِ راہ کے طور پر ساتھ لے جائیے گا۔"

کھانے کے دوران میں ایک درویش نے سوال کیا۔ "رابعہ پہلی بار خوان واپس بھیج دینے میں کیا راز تھا؟"

رابعہ بصری نے جواب دیا۔ "درویشو! جب تم آئے تھے تو گھر میں صرف دو روٹیاں تھیں۔ میں نے وہ دونوں روٹیاں خیرات کر دیں اور یہ بات ذہن میں رکھی کہ خدا نے ایک کے عوض دس دینے کا وعدہ کیا ہے مگر جب خوان پہلی بار آیا تھا تو اس میں صرف اٹھارہ روٹیاں تھیں چنانچہ میں نے خوان لوٹا دیا پھر جب خوان دوبارہ آیا تو اس میں بیس روٹیاں تھیں اس لیے میں نے اسے رکھ لیا کیونکہ خدا نے اپنا وعدہ حرف بحرف پورا کر دیا تھا۔"

ایک دفعہ رابعہ بصری کو عبادت کے دوران میں تھکن کے باعث نیند آگئی۔ ایک چور نے انھیں غافل دیکھا تو چادر اٹھا کر فرار ہونے لگا لیکن اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک بے در کمرے میں بند ہو چکا ہے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ گھبرا گھبرا کے حیرانی سے دیواروں کے ساتھ سر مارتا رہا کہ دروازہ کہاں گیا؟ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا؟ معاً اسے رابعہ بصری کی پیہم عبادتوں کا خیال آیا اور اس نے سوچا کہ وہ غلط جگہ آگیا ہے چنانچہ جلدی سے اس نے چادر سوتی ہوئی رابعہ بصری کے قدموں کے پاس رکھ دی اور توبہ و استغفار کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد جب اس نے آنکھ اٹھا کے دیکھا تو دروازہ نہ صرف اپنی جگہ موجود تھا بلکہ کھلا ہوا بھی تھا۔ گمان ہوا کہ شاید اندھیرے میں وہ یہ دروازہ دیکھ نہیں سکا تھا۔ اس گمان کے تحت لالچ نے اسے پھر چوری پر اکسایا۔ اس دفعہ چادر اٹھا کے جب وہ دوبارہ بھاگنے لگا تو دروازہ پھر غائب ہو گیا اور دیوار راہ میں حائل ہو گئی۔ چور نے اپنی آنکھوں پر یقین کرنے کے لیے کئی بار چادر رکھی، کئی بار دروازہ نظر آیا اور غائب ہوا۔ آخر وہ چوری کا ارادہ ترک کر کے دوبارہ توبہ تلا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ یکبارگی اسے حجرے میں سے ایک آواز سنائی دی "اے شخص! کیا تجھے معلوم نہیں کہ چادر والی نے خود کو ہماری حفاظت میں دے رکھا ہے؟ ایک دوست خوابیدہ ہے تو کیا ہوا؟ دوسرا دوست تو جاگ رہا ہے۔" چور نے اسی وقت صدقِ دل سے آئندہ کبھی چوری نہ کرنے کا عہد کیا

اور اسی وقت جنگلوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ اُسے اپنا ہوش بھی نہ رہا۔

رابعہ بصری کرامتوں سے بے حد اجتناب برتتی تھیں۔ ایک بار انھوں نے کئی روز سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ خادمہ نے یہ حالت دیکھ کر کھانا پکانے کی اجازت لی اور کھانا تیار کرنے لگی مگر پیاز نہ ہونے کی وجہ سے سالن نہیں پک سکتا تھا۔ خادمہ نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "گھر میں پیاز نہیں ہے۔ اگر اجازت ہو تو تھوڑی سی پڑوس سے مانگ لاؤں؟"

رابعہ بصری نے جواب دیا۔ "تجھے معلوم نہیں میں نے برسوں پہلے خدا سے یہ عہد کیا تھا کہ اُس کے سوا کسی سے کچھ طلب نہیں کروں گی۔ لہٰذا اگر پیاز نہیں ہے تو آج ہم روکھی روٹی کھا لیں گے۔"

ابھی ان کا یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ ایک پرندہ اپنی چونچ میں چھلی ہوئی پیاز لے آیا اور براہِ راست ہانڈی میں ڈال کے اُڑ گیا۔ خادمہ نے خوش ہو کے کہا۔ "مالکن! دیکھیے، مالک نے عجیب طریقے سے ہمیں پیاز کا تحفہ بھجوا دیا۔"

رابعہ نے آہستہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن جب میں نے روکھی روٹی کھانے کو کہا تھا تو اس میں کوئی طلب نہیں تھی، تسلیم و رضا کا جذبہ تھا۔ پرندے کا اس طرح غیر فطری طور پر پیاز لانا کوئی شیطانی عمل بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر خدا کو پیاز دینی ہوتی تو وہ جب بھی پیاز دے سکتا تھا۔ آج سے اس گھر میں پیاز نہیں آئے گی۔" انھوں نے زندگی کی آخری سانسوں تک پیاز نہ استعمال نہیں کی۔

وہ اجتناب کے باوجود ایک صاحبِ کرامت خاتون تھیں۔ ایک بار وہ حسن بصری کے مکان پہنچیں۔ حسن اپنے مکان کی چھت پر اس طرح گریہ و زاری کر رہے تھے کہ ان کے رونے کی آواز دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ رابعہ نے اوپر پہنچ کر دیکھا تو آنسوؤں سے پوری چھت بارش کے پانی کی طرح بھیگی ہوئی تھی۔ رابعہ نے کہا۔ "حسن! اگر تمھاری یہ گریہ و زاری محض ظاہر کا عمل ہے تو اسے بند کر دو اور اپنے باطن میں کوئی سوز پیدا کرو۔"

حسن بصری نے رابعہ کی یہ بات تقدس سے سنی لیکن مصلحتاً خاموش ہو گئے۔ چند دن بعد دونوں کی ملاقات فرات کے ساحل پر ہوئی۔ ملاقات کے دوران میں اذان کی آواز گونجی۔ حسن بصری نے فوراً دریا کی سطح پر مصلا بچھاتے ہوئے کہا۔ "رابعہ! نماز کا وقت ہے۔ آؤ، ہم دونوں نماز ادا کر لیں۔"

رابعہ مسکرائیں۔ "اگر پانی پر یہ مصلا مخلوق کے دکھانے کے لیے ہے تو اچھا تماشا ہے کیونکہ دوسرے لوگ ایسا کرنے سے قاصر ہیں۔" یہ کہہ کے انھوں نے اپنا مصلا ہوا کے دوش پر بچھا دیا اور حسن بصری سے کہا۔ "آؤ حسن! ہم دونوں یہاں نماز ادا کریں تاکہ خلقِ خدا کی نگاہوں سے محفوظ رہیں۔ نماز عبادت ہے، اسے شعبدہ کیوں بنائیں؟"

حسن بصری منفعل ہو کے معافی کے خواستگار ہوئے۔ رابعہ نے اُن کی دل جوئی کے لیے کہا۔ "خدا گواہ ہے، میں تمھیں منفعل کرنا یا تم پر اپنی برتری ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی بلکہ صرف یہ کہنا چاہتی تھی کہ جو فعل تم نے انجام دیا ہے وہ تو معمولی مچھلیاں بھی انجام دے سکتی ہیں اور جو کچھ میں نے کیا وہ ایک حقیر سی مکھی بھی کر سکتی ہے۔ خدا کے نزدیک اہمیت صرف خلوص کے سجدے کی ہے۔ سجدے کے مقام کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

حسن بصری اپنے زمانے کے اولیا میں خود ایک بلند مرتبے کے بزرگ تھے۔ ان کا زورِ کلام بے مثل تھا۔ تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو ہزاروں لاکھوں کا مجمع لگ جاتا اور لوگ خوفِ الٰہی سے رونے لگتے۔ پھر خدا کی رحمت کا حال بیان کرتے تو ان کے چہرے مسرت سے دمک اُٹھتے۔ حسن بصری اُس وقت تک وعظ شروع نہیں کرتے تھے جب تک رابعہ بصری محفل میں نہیں آجاتی تھیں۔ ایک بار لوگوں نے عرض کیا کہ "حضور! ہزار ہا لوگ گھنٹوں وعظ کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے اللہ والے بھی شامل ہیں لیکن آپ صرف ایک بڑھیا کے انتظار میں اتنا وقت ضائع کر دیتے ہیں۔"

حسن بصری نے جواب دیا۔ "ہاتھی کا شربت چیونٹی کے برتن میں کیسے سما سکتا ہے؟"

وعظ کے دوران میں اکثر آپ بے حد جلال میں آجاتے تھے۔ الفاظ کی گرمی سے خدشہ پیدا ہوتا تھا کہ سارا مجمع آگ کی طرح نہ بھڑک اٹھے۔ ایسے عالم میں آپ رابعہ بصری سے مخاطب ہو کر کہتے۔ "رابعہ! خدا کے حضور اِس آگ کا ذمے دار میں نہیں ٹھہروں گا کیونکہ یہ جوش اور گرمی تمھاری وجہ سے ہے۔ خدارا خود کو قابو میں رکھو ورنہ تمھاری حدت سے ایک دن ہم سب جل مریں گے۔"

حسن بصری اور رابعہ بصری رات رات بھر حقیقت و معرفت کے موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ حسن بصری کہتے تھے کہ رابعہ سے گفتگو کے دوران مجھے نہ تو اپنے مرد ہونے کا احساس ہوتا ہے نہ رابعہ کے عورت ہونے کا احساس۔ البتہ صبح جب اُن سے رخصت ہو کر باہر نکلتا ہوں تو خود کو پہلے سے کہیں زیادہ مفلس اور رابعہ کو پہلے سے کہیں زیادہ مخلص پاتا ہوں۔

رابعہ بصری کے گھر ایسی ہی ایک نشست جمی ہوئی تھی۔ حسن بصری کے ساتھ ان کے بہت سے معتقد بھی تھے۔ معرفت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ رات کی تاریکی رفتہ رفتہ کمرے پر مسلط ہوتی جارہی تھی۔ گھر میں چراغ نہیں تھا۔ رابعہ نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ دفعتہً ان کی انگلیاں اس طرح روشن ہو گئیں کہ پورا مکان بقعۂ نور بن گیا۔ رابعہ صبح تک ہاتھ بلند کیے رہیں اور اُس روشنی میں رات بھر معرفت کے دریا بہتے رہے۔

چلتے وقت حسن بصری کے ایک ارادت مند نے رابعہ بصری سے کہا کہ "اگر آپ کی یہ کرامتیں عام ہو گئیں تو لوگ آپ کو پیغمبروں کی صف میں کھڑا کر دیں گے۔"

رابعہ بصری نے یہ سب کچھ براہِ راست خدا سے حاصل کیا تھا، انھیں شرعی علوم پر زیادہ دسترس نہیں تھی لیکن انھوں نے پلٹ کر جواب دیا "جو شخص صدقِ دل سے رسولِ اکرمؐ کی اطاعت کرتا ہے، اُسے ان کے معجزوں میں سے کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور ملتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انبیا کے سلسلے میں یہ امر معجزہ کہلاتا ہے اور ولیوں کے سلسلے میں کرامت۔ کرامت کسی کو اُس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک وہ خاکِ پائے رسولؐ کا ایک ذرّہ نہ بن جائے۔"

شریعت اور طریقت کے اس عرفان کے باوجود آزمائشیں جاری تھیں۔ امتحان دینے والی ایسی صابرہ تھی کہ اس نے محبوب کی مرضی ہی کو زندگی کا مقصود بنا لیا تھا۔ ایک مرتبہ رابعہ بصری نے سات دنوں اور راتوں کا روزہ رکھا۔ ساتویں روز جب افطار کا وقت آیا تو جی چاہا کہ آیندہ سات دن اور سات راتیں بھی اسی تسلسل میں گزار دیں۔ وہ ابھی روزے کی نیّت کر ہی رہی تھیں کہ نفس نے فریاد کی "رابعہ تو مجھے کب تک تکلیف دے گی؟"

اسی وقت اچانک ایک شخص نے کھانا لا کر پیش کر دیا۔ رابعہ نے کھانا لے لیا اور اپنے نفس کو جواب دیا "مجھ سے پہلے جو عاشق گزرے ہیں، اُن کے نفس کی غذا ان کے محبوب کی یاد تھی مگر تیری حیثیت ایک کتّے سے بھی بدتر ہے۔ کتّا کم سے کم اپنے مالک کا اشارہ تو سمجھتا ہے۔ تو تو کتّا بھی اچھی ذات کا نہیں ہے۔ ذرا صبر کر۔ چراغ جلا لوں پھر تجھے سیر کر دوں گی۔" وہ چراغ جلانے اُٹھیں۔ اتنے میں بلّی آئی اور کھانے کا خوان الٹ کر چلی گئی۔

نفس نے پھر سرگوشی کی "رابعہ! کم سے کم پانی ہی پلا دے تاکہ پیاس بجھا لوں۔" رابعہ بصری نے پانی کا کوزہ اٹھایا لیکن جیسے ہی آبخورے میں پانی ڈالا، چراغ بجھ گیا۔ اندر سے پھر کسی نے التجا کی "مجھے اندھیرے ہی میں پانی دے دے۔ اب انتظار کی تاب نہیں ہے۔" رابعہ بصری نے اندھیرے ہی میں پانی سے روزہ کھولنا چاہا مگر پیالہ بھی ہاتھ سے چھوٹ کے ٹوٹ گیا۔ رابعہ کا نفس بلکتا رہ گیا۔ اپنے نفس کی یہ بے چیدگی، یہ زبوں حالی دیکھ کے رابعہ بصری نے خدا سے کہا "الٰہی! یہ کیا بھید ہے کہ مجھ سے ہر اختیار چھنا جا رہا ہے؟ اگر یہی مرضی تھی تو پہلے منع کر دیا ہوتا۔ میں تیری خوشنودی کے لیے اپنا نفس پہلے ہی مار لیتی۔ اب بتا کہ میں نفس کو کیا جواب دُوں؟"

غیب سے آواز آئی "اگر تو یہ چاہتی ہے رابعہ کہ دُنیا کی نعمتیں تیرے لیے وقف کر دی جائیں تو ہم تیرے دل سے اپنا غم واپس لے لیتے ہیں۔ ہمارا غم اور دُنیا کی لذّتیں، یہ دونوں چیزیں ایک ہی دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔"

رابعہ نے جواب دیا "مولا! میں بشریّت کی دیواروں میں قید ہوں اور تیرے قول کے مطابق بشریّت کی حدود متعیّن ہیں۔"

جواب ملا "انتخاب خود تیرے ہاتھ میں ہے۔"

رابعہ بصری نے یہ سن کے اپنا دل دُنیا سے قطعاً بے تعلق کر لیا اور خدا کے سوا ہر امید، ہر سہارے سے منہ موڑ لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ "اس کے بعد میں نے اپنی ہر نماز آخری نماز سمجھی اور خود کو اُس کے ذکر میں مشغول کر لیا۔ اُس کا ذکر دنیا بھر کی آلائشوں سے نجات دلا دیتا ہے۔"

ان کا بیشتر وقت گوشہ نشینی میں بسر ہوتا تھا۔ ایک روز کسی معتقد نے پوچھا "آپ اس تنہائی سے گھبراتی نہیں ہیں؟"

رابعہ بصری نے کہا "تنہائی کیسی؟ میں تو ہر وقت اپنے اللہ کے ساتھ رہتی ہوں۔"

معتقد نے پوچھا "کیا آپ نے اللہ کا جلوہ دیکھا ہے؟"

رابعہ نے جھنجلا کے جواب دیا "میں نے اُسے پہچانا ہے۔ اگر نہ پہچانتی تو اس کی عبادت کیسے کرتی؟" اس دوران میں کچھ اور اہل اللہ بھی جمع ہو گئے۔ آپ نے ان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے معتقد سے کہا "ان بزرگوں سے پوچھو کہ یہ خدا کی عبادت کیوں کرتے ہیں؟"

ایک بزرگ نے یہ سن کے جواب دیا "رابعہ! میں جہنّم کے اُن طبقات سے خائف رہتا ہوں جن سے حشر کے روز مجھے گزرنا پڑے گا۔ میں خدا کی عبادت جہنم سے محفوظ رہنے کے لیے کرتا ہوں۔"

دوسرے بزرگ نے کہا "میں اس لیے عبادت کرتا ہوں

کہ جنّت کا ہر دروازہ عبادت ہی کے راستے سے آتا ہے۔"

رابعہ بصری نے جلال سے ایک ہاتھ میں آگ اور دوسرے میں پانی کا برتن لیا اور کھڑی ہو گئیں۔ "اگر تم لوگوں نے خدا کی قدرت اپنی خواہشات کے برابر سمجھ لی ہے تو قسم خدا کی میں اس پانی سے جہنّم ہمیشہ کے لیے سرد کیے دیتی ہوں اور اس آگ سے جنّت جلا کر راکھ کر دیتی ہوں۔ اگر جنّت اور دوزخ کی تخلیق نہ ہوتی تو کیا تم اپنے رب کی بندگی سے منکر ہو جاتے؟ لوگو! تم خود کو اللہ کے مقربین میں سے سمجھتے ہو لیکن اگر تم جزا اور سزا کے تصوّر سے عبادت کرتے ہو تو یقین کرو کہ تم خدا کے منکر ہو کیونکہ عبد اور معبود کے درمیان بندگی کے سوا کوئی سزا اور کوئی جزا قابلِ اعتنا نہیں ہے۔ رابعہ بصری کا جلال دیکھ کے اُن بزرگوں نے سورۃ رحمان کی تلاوت شروع کر دی۔ تلاوت کی محویت میں رابعہ بصری کے ہاتھ سے پیالہ گر پڑا اور آگ ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور وہ اپنے خدا سے مخاطب ہو گئیں "مولا! میں اگر جہنّم کے ڈر سے تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھے جہنّم میں جھونک دے اور اگر میری عبادت میں جنّت کی خواہش کارفرما ہو تو مجھ پر جنّت حرام کر دے۔"

اُسی وقت آواز آئی "رابعہ! جنّت اور دوزخ کے علاوہ تیسرا مقام کون سا ہے؟"

رابعہ نے رقّت سے کہا "محبوب! تیسرا مقام تیرا دیدار ہے۔ مجھے صرف اپنے جمال کی دید سے سرفراز کر دے ورنہ شکایت رہے گی کہ دوست کے ساتھ دوست جیسا برتاؤ نہیں کیا گیا۔"

آواز آئی "شاکی نہ ہو رابعہ! تجھے ایسی قربت سے نوازا جائے گا کہ ہم تجھ سے کلام کریں گے اور تو ہم سے کلام کرے گی۔"

ابتدا میں رابعہ بصری کے حسن و جمال کی دُھوم مچی ہوئی تھی مگر غلامی سے آزاد ہو کے نوجوانی کے شب و روز انھوں نے یادِ الٰہی میں گزار دیے۔ ان کے چہرے پر پاکیزگی کی ایک ایسی نقاب تھی کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں خود بخود جھک جاتی تھیں۔ اُسی زمانے میں ایک نوجوان نے انھیں رات کے وقت ایک قبرستان میں چاند کی طرح دمکتے دیکھا۔ وہ آپ کو کوئی غیر مرئی مخلوق سمجھ کے بھاگ کھڑا ہوا لیکن دوسری صبح جب وہی چہرہ اُسے بصرے کے ایک بازار میں نظر آیا تو وہ عقل و خرد سے ہاتھ دھو بیٹھا اور رات دن اُسی کے تصوّر میں رہنے لگا۔ آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تو لوگوں سے پتہ پوچھتا ہوا حضرت رابعہ بصری کے گھر جا پہنچا۔ آپ کہا کرتی تھیں کہ دل کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھو، کیا معلوم محبوب کس وقت دستک دے دے؟ مگر گھر کے دروازے بند ہوں یا کھلے ہوئے، اُن کی دانست میں برابر تھے۔ نوجوان کو خلافِ توقع ان کا دروازہ کھلا ہوا ملا۔ اس نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ رات کا وقت تھا۔ اندر چراغ روشن تھا۔ نوجوان یہ سوچ کے بے باکی سے اندر داخل ہو گیا کہ حالِ دل سُنا دینے میں کیا حرج ہے؟ زیادہ سے زیادہ انکار ہی تو ہو جائے گا۔ واپسی کا دروازہ بہرحال کھلا ہوا ہے لیکن جب وہ اندر پہنچا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ چھت سے ایسی پُرسوز آواز آ رہی تھی جیسے کوئی زیرِ لب ہجر کا رونا رو رہا ہو۔ نوجوان تیزی سے زینے پر چڑھ گیا۔ رابعہ بصری عشا کی نماز سے فارغ ہو کے ثناخوانی کر رہی تھیں۔

"پروردگار! ستارے روشن ہو گئے۔ لوگ سو گئے بادشاہوں نے دروازے بند کر لیے ہر محب اپنے محبوب سے محوِ راز و نیاز ہے اور میں تیرے سامنے کھڑی ہوں۔"

نوجوان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اسی اثنا میں رابعہ نے پلٹ کر اُسے ایسی قہر آلود نظروں سے دیکھا کہ اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ رابعہ نے اس کے چہرے کے قریب آ کر پوچھا "کیا تم مجھ سے شادی کی درخواست کرنے آئے ہو؟"

نوجوان نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے اپنی زبان کی طرف اشارہ کیا کہ وہ بول نہیں سکتا۔

رابعہ نے کہا "اس سے پہلے کہ زبان کی طرح تیرا دل بھی چُپ ہو جائے، تو جس راستے سے آیا ہے اُسی راستے سے لوٹ جا۔"

نوجوان صرف آنکھوں سے التجا کر سکتا تھا کہ "نیک خاتون! میری گویائی مجھے واپس دے دے۔ میں تیرے مرتبے سے واقف نہیں تھا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے معاف کر دے۔ لاعلمی ہمیشہ قابلِ معافی ہوتی ہے۔"

اُس کے خاموش آنسوؤں کے جواب میں رابعہ نے کہا "نوجوان! تو نے اگر مجھ سے کوئی زیادتی کی ہوتی تو میں تجھے یقیناً معاف کر دیتی۔ میں نے خود کو بہت پہلے ـــــ اپنے اللہ کے حوالے کر دیا تھا۔ اب یہ معاملہ تیرے اور اللہ کے درمیان ہے۔ معافی مانگنا ہے تو اس سے مانگ۔ تو صدقِ دل سے توبہ کرنے کا ارادہ کرے تو شاید توبہ کی خاطر تیری زبان کھل جائے۔" یہ کہہ کے وہ نماز کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ نوجوان بھی بے اختیار سجدے میں گر گیا۔ وہ رو رہا تھا۔ نہ معلوم کب تک روتا رہا۔ جب اسے ہوش آیا تو زبان کھل چکی تھی اور توبہ توبہ کا ورد کر رہی تھی۔

بصرے کے بازاروں میں سالہا سال تک ایک مجذوب گرمی، جاڑے اور برسات سے بے نیاز ہو کے دیوانہ وار توبہ توبہ کے نعرے لگاتا رہا۔ اس کے نعروں سے بصرے کی راتیں گونج اٹھتی تھیں اور بچے سہم کے ماؤں کے سینوں میں دبک جاتے تھے۔ آخر ایک دن وہ مجذوب اچانک کہیں غائب ہو گیا پھر کبھی اس کا پتہ نہیں چلا۔

اُسی زمانے میں بصرے کے حاکم محمد بن سلیمان ہاشمی نے شادی کا ارادہ کیا اور لوگوں سے پوچھا "کسی ایسی نادرِ روزگار خاتون کا نام بتاؤ جس کی موجودگی میں چراغوں

سلطان محمود غزنوی

اپنے غلام ایاز پر بہت مہربان تھا۔ دربار کے دوسرے لوگ ایاز پر محمود کا یہ التفات دیکھ کر اس سے حسد کرنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ سلطان کے بیٹوں کو بھی ایاز سے کد ہو گئی تھی۔ وہ ایک غلام کو دربار میں اپنے سے زیادہ محترم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ایک روز محمود کے ایک لڑکے نے بھرے دربار میں محمود سے ایاز پر اس بے جا محبت اور بے جا مہربانی کی شکایت کی۔ محمود نے شکایت کا کوئی جواب دینے کے بجائے وزیروں، بیٹوں اور ایاز سے کہا کہ "کل سب لوگ دریا کے کنارے جمع ہو جائیں۔"

دوسرے روز سب لوگ دریا کے کنارے جمع ہو گئے۔ محمود غزنوی نے اپنے ایک وزیر کو حکم دیا۔ "دریا میں اس طرح غوطہ لگاؤ کہ تمہارے کپڑے قطعی نہ بھیگیں۔"

وزیر دریا میں اتر گیا مگر جب باہر نکلا تو اس کے کپڑے پانی میں شرابور تھے۔ محمود غزنوی نے اس سے پوچھا کہ "ایسا کیوں ہوا؟"

وزیر کچھ دیر تک شرمندہ کھڑا رہا۔ پھر گردن جھکا کے مردہ آواز میں بولا "جہاں پناہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص پانی میں اترے اور اس کے کپڑے نہ بھیگیں۔"

پھر محمود غزنوی ایک ایک کر کے تمام وزیروں اور بیٹوں کو یہی حکم دیتا رہا اور سب کے سب اسے ایک ناممکن بات سمجھتے رہے۔ آخر میں ایاز کی باری آئی۔ وہ محمود کا حکم ملتے ہی دریا میں اتر گیا۔ جب وہ باہر آیا تو اس کے کپڑے بھی بھیگے ہوئے تھے۔ محمود نے غضب ناک ہو کے کہا۔ "ایاز! ایسا کیوں ہوا؟"

ایاز نے ادب سے جواب دیا۔ "ظلِ الٰہی! مجھ سے ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔ پھر کوشش کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ دریا میں چلا گیا اور اس کے کپڑے دوبارہ بھیگ گئے۔ ایاز نے یہ عمل دس بار دہرایا۔ ہر بار کپڑے بھیگتے رہے اور وہ یہی کہتا رہا "مجھ سے ضرور کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ پھر کوشش کرتا ہوں۔"

آخر محمود نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور حاضرین سے مخاطب ہو کے کہا۔ "نااہلو! حاسدو! سمجھ میں آیا کہ میں ایاز سے اتنی محبت کیوں کرتا ہوں؟ دیکھو، یہ اپنے سر الزام لے کے کس خوبصورتی سے میری غلطی نباہ رہا ہے۔"

کی روشنی کی ضرورت نہ رہے۔"

سب نے بیک زبان رابعہ کا نام لیا چنانچہ حاکم نے انھیں شادی کا پیام بھیجتے ہوئے لکھا کہ "میرے تمام خزانے اور زر و جواہر ہمیشہ تمہارے قدموں پر رہیں گے۔"

رابعہ نے جواب میں لکھا۔ "میں نے تجھے صرف اس لیے معاف کیا کہ تو لوگوں کے بہکائے میں آ گیا ہے۔ تو مرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ آخرت کی فکر کر کیونکہ زمین میں وہ سانپ بچھو پیدا ہو چکے ہیں جو اپنی بھوک مٹانے کے لیے تیرا گوشت نوچنے اور تیری ہڈیاں چاٹنے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

حاکم کو یہ جواب ملا تو وہ روتے روتے بے ہوش ہو گیا۔ اندھیری قبر کا منظر ہر وقت اس کے سامنے رہنے لگا۔ جب تک زندہ رہا، توبہ و استغفار میں مصروف رہا۔ ایوانِ حکومت اسے ہمیشہ ایک قید خانہ محسوس ہوا۔ لوگوں نے بارہا کوشش کی کہ اسے کسی طرح رابعہ کے سامنے لے جا کر معافی دلوا دیں تاکہ اس کے ذہن سے عاقبت کا خوف نکل جائے لیکن وہ کہتا تھا کہ "جس کی حرف تحریر نے میری دنیا بدل دی ہے اگر وہ مجھ سے ہم کلام ہو گئی تو سوچ سکتا ہے، مجھے کوئی اس سے بھی ہولناک منظر دکھائی دے۔ اس طرح میں دوسری سانس بھی نہ لے سکوں گا۔ میں اس کا احسان مند ہوں کہ اس نے مجھے زندگی کے لیے اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کچھ وقت دے دیا ہے۔"

رابعہ بصری نے شادی نہیں کی۔ شادی نہ کرنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے زاہدوں کی طرح وہ بھی پوری یکسوئی اور تن دہی سے عبادات میں مصروف رہ سکیں اور ازدواجی رشتے ان کی عبادت میں رخنہ نہ ڈالیں۔ رابعہ بصری کو شدت سے یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی روح، ان کا بدن، ان کی سانسیں سب کچھ اللہ کی ملکیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عربی کے مشہور شاعر ابو نواس کا یہ شعر اکثر گنگناتی تھیں "اے لوگو! تم دنیا کو گہری نظر سے دیکھو گے تو وہ تمہیں ایک دوست نظر آئے گی جس کے دل میں تمہارے لیے خالص دشمنی کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

بصرے کی حیونہ نامی ایک مجذوبہ رابعہ کی عزیز ترین سہیلی تھی۔ سالہا سال سے شب بیداری دونوں کا معمول تھا۔ ایک رات رابعہ کی آنکھ لگ گئی۔ آدھی رات کے وقت یکایک انھیں اپنے جسم پر ٹھوکروں اور تھپیڑوں کا احساس ہوا۔ آنکھ کھلی تو حیونہ بال بنائے، سرمہ لگائے، آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے لیے انھیں جھنجوڑ کر کہہ رہی تھی۔ "رابعہ اٹھ! ہدایت پانے والوں کی عروسی شب آ گئی ہے۔ دیکھو، وہ مقدس ذات کیسی ہے جس نے رات کی دلھنوں کو تہجد کے نور سے زینت بخشی ہے۔"

رابعہ گھبرا کے اٹھیں اور تہجد کے سجدے میں گر گئیں۔ رابعہ بصری سے ایسی ایسی کرامتیں ظاہر ہوتی تھیں جن سے بڑے بڑے اہل اللہ قاصر نظر آتے تھے۔ وہ اپنے دور کی قافلہ سالار تھیں۔ انھوں نے اپنا روحانی مسلک معرفت کے قواعد کی رو سے خود قائم کیا تھا۔ وہ ایک سایہ دار درخت کی طرح اپنے پورے عہد پر پھیلی نظر آتی ہیں۔ دنیا کی بادِ سموم کے ستائے ہوئے لوگ اس درخت کے سائے میں آرام کرتے تھے۔ معرفت کی جس بلندی پر رابعہ بصری پہنچ چکی تھیں، وہاں تک پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں تھی۔

ایک دفعہ ایک ڈاکو رابعہ کو غافل سمجھ کر ان کے گھر میں گھس گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس دروازے پر بڑے بڑے حکام اور امرا دعا لینے آتے ہیں اور یقیناً دوسری خانقاہوں کی طرح یہاں بھی زر و جواہر کے نذرانے پیش کرتے ہوں گے۔ ڈاکو نے گھر کا کونا کونا چھان مارا لیکن اسے پانی کے ایک ٹوٹے ہوئے برتن اور پیوند لگی ہوئی ایک کمبل کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ جھنجلاہٹ میں وہ واپس ہونا چاہتا تھا کہ اسے رابعہ کی نرم اور شیریں آواز سنائی دی۔ "کیا تم چور ہو؟"

ڈاکو نے خشونت سے جواب دیا۔ "تم جو چاہو سمجھ لو۔"

"اگر تم واقعی چور ہو تو یہاں سے کچھ لیے بغیر نہ نکلنا۔" رابعہ بصری کے لہجے میں

ی تھی۔

یہاں رکھا ہی کیا ہے؟" ڈاکو نے جواب دیا "میں بصرے کا سب سے مشہور ں اور دو جواہر کے سوا کسی چیز پر نظر ڈالنا اپنے معیار سے کم تر سمجھتا ہوں۔"

رابعہ بصری کو یہ دیانت داری پسند آگئی۔ کہنے لگیں "خوب! اِس لوٹے ں سے وضو کر کے حجرے میں داخل ہو جاؤ اور دو رکعت نماز پڑھ لو۔ پھر تم سے اتنا کچھ لے کے نکلو گے کہ تمھیں ساری زندگی میں نہ ملا ہو گا۔"

ڈاکو نے کچھ سوچا اور وضو کر کے حجرے میں گیا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ رابعہ ر نگاہ اُٹھا کر کہا "معبود! یہ شخص میرے دروازے پر آیا تھا مگر یہاں ے نہیں ملا۔ اب میں نے اسے تیرے در پر کھڑا کر دیا ہے۔"

ڈاکو کو نماز میں اتنی لذت ملی کہ وہ مزید دو رکعتیں پڑھنے کے لیے کھڑا اسی طرح صبح تک اس نے بے شمار رکعتیں پڑھ ڈالیں۔ جب رابعہ بصری ے میں داخل ہوئیں تو وہ سجدے میں پڑا رو رو کر خود سے کہہ رہا تھا "حشر کے ب خدا مجھ سے پوچھے گا کہ نافرمانی کرتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ تو نے اپنے رں سے چھپائے اور یہ یاد نہ رکھا کہ ایک ذات ایسی بھی ہے جس سے کوئی چھپا نہیں رہتا؟ میں کیا جواب دوں گا؟"

جب اس کی یہ کیفیت ختم ہو گئی تو رابعہ بصری نے اس سے پوچھا "یہ وقت ی کیسی گزری؟"

اس نے تحمّل سے جواب دیا "غربت سے میں مجبور اور حقیر بن کر خدا کے ے کھڑا ہوا تو اس نے میرا عذر قبول کر لیا، میرے گناہ بخش دیے اور مجھے میرا مطلوب یا۔" یہ کہہ کے وہ مکان سے باہر نکل گیا۔

رابعہ بصری کچھ دیر تک حیرت کے ساتھ گھر سے نکلتے ہوئے نئے دل کو ں رہیں پھر سجدہ ریز ہو کے گڑگڑانے لگیں "مولا! تو نے اسے قبول کر لیا ہے۔ نے جب سے تجھے پہچانا ہے، میں بھی تیرے سامنے کھڑی ہوں۔ کیا تو نے مجھے بھی ں تمام کوتاہیوں کے ساتھ قبول کر لیا ہے؟"

دا آئی "رابعہ کس خیال میں ہے؟ دیوانی! اسے ہم نے تیری ہی وجہ سے ل کیا ہے۔"

عشق آنکھوں کے ذریعے دل تک پہنچتا ہے۔ ایسے عشاق دنیا میں کم گزرے ں گے جنھوں نے محبوب کو دیکھے بغیر عشق کیا ہو۔ رابعہ بصری نے خدا سے ایسا ق کیا کہ اس عشق کی آگ میں اپنی روح تک راکھ کر دی۔ ان کے یہ اشعار آج ان کی محبت کے آئینہ دار ہیں: "میرے محبوب! حیوان کی آواز، پتّا کھڑکنے کی ٹ، ہوا کی سرسراہٹ، پانی گرنے کی صدا، بجلی کی کڑک اور کسی پرندے کے نغمے، ز سیاہ سائے یہ سب تیری یکتائی کی گواہی دیتے ہیں۔"

ایک دن ابوسفیان ثوری رابعہ کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ رابعہ کی جگہ لکڑی یک بدن ستون سے ٹکا کھڑا ہے جیسے اگر کوئی انگلی سے چھو دے تو وہ زمین پر آ رہے سفیان کو خیال ہوا کہ شاید کسی دماغی صدمے سے رابعہ پر سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ انھوں بڑھ کر نبض دیکھی تو وہ ساکت تھی۔ قریب تھا وہ چیخ مار کر کہتے کہ "آج بصرے کا

حضرت نظام الدین اولیا

کی خدمت میں ایک سائل حاضر ہوا۔ اُس وقت اُن کے پاس اُسے دینے کے لیے کچھ موجود نہیں تھا چنانچہ انھوں نے اپنی جوتیاں اُسے دے دیں، سائل واپس چلا گیا۔

اُن دنوں امیر خسرو شہنشاہ کے ساتھ بنگال گئے ہوئے تھے۔ واپسی کے وقت انھوں نے ایک سرائے میں قیام کیا۔ اُن کا شمار چونکہ بادشاہ کے مصاحبوں میں ہوتا تھا۔ اس لیے ہاتھی، گھوڑوں، کنیزوں اور غلاموں کی بڑی تعداد ان کے ساتھ تھی۔ اُس دن سرائے میں یکایک امیر خسرو نے بڑی بے چینی سے کہا "بُوئے پیرمی آید۔ بُوئے پیرمی آید" (پیر کی خوشبو آتی ہے۔ پیر کی خوشبو آتی ہے)

لوگوں نے کہا "یہاں پیرو مُرشد کہاں، ہم دلّی سے بہت دُور ہیں۔" لیکن امیر خسرو کے اضطراب میں کمی نہیں ہوئی۔ وہ یہی کہتے رہے "بُوئے پیرمی آید، بُوئے پیرمی آید"

لوگوں نے اِدھر اُدھر سونگھنا شروع کیا اور امیر خسرو کے اضطراب کا شہرہ ساری سرائے میں ہو گیا۔

اُسی وقت امیر خسرو کا ایک ہم سفر بھاگا ہوا آیا اور کہنے لگا "آپ صحیح کہتے ہیں۔ ایک مسافر دلّی سے آیا ہوا ہے۔ شاید وہ حضرت کی خدمت میں گیا ہو اور ان سے کوئی عطیہ لایا ہو۔"

امیر خسرو فوراً مسافر کے پاس پہنچے اور اُس سے حقیقتِ حال دریافت کی۔ مُسافر نے کہا "ہاں، میں حضرت کی خدمت میں گیا تھا۔ انھوں نے مجھے یہ دو جوتیاں عنایت کی ہیں۔"

امیر خسرو نے بیتابی سے دریافت کیا "کیا تم یہ جوتیاں فروخت کر سکتے ہو؟" مسافر ضرورت مند تھا۔ کہنے لگا "کیا دو گے؟"

امیر خسرو بولے "یہ سب ہاتھی، گھوڑے، غلام اور تمام نقدی لے لو مگر جوتیاں مجھے دے دو۔"

مسافر نے بے دلی سے کہا "کیوں مذاق کرتے ہو بھائی؟"

امیر خسرو نے پیشانی پر بل ڈالے بغیر اُسی وقت ساری چیزیں اس کے حوالے کر دیں اور جوتیاں لے کر اپنی دستار میں باندھ لیں۔ یہ واقعہ لکھنؤ میں پیش آیا تھا۔ امیر خسرو وہاں سے دہلی تک تنہا، ننگے پاؤں، پیدل آئے اور جب وہ حضرت نظام الدین اولیا کے سامنے پہنچے تو حضرت نے مسکرا کر کہا۔

"ترک! جوتیاں بہت سستی خرید لیں۔"

چاند غروب ہو گیا ہے۔" اُسی وقت رابعہ نے پلٹ کے مسکراتے ہوئے کہا "ابوسفیان! تم نے مجھے سفر سے کیوں واپس بُلا لیا؟"

ابوسفیان نے حیرت سے کہا "رابعہ! میں تو سمجھا تھا کہ تم نے پردہ کر لیا ہے؟" رابعہ نے جواب دیا "یہ آنکھیں کھلی رکھا کرو ابوسفیان! میں کبھی پردے سے باہر ہونے کے باوجود تمھارے سامنے نہیں ہوتی۔"

"تم کہاں تھیں؟" ابوسفیان کے لہجے میں ابھی تک حیرت تھی۔

"آج کی طرح آئندہ کبھی میرے راستے میں نہ آنا۔" رابعہ نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے تمام حجابات اٹھا دیے ہیں۔ اب محب اور محبوب کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہا۔" ممکن تھا کہ یہ جملہ سن کر ابوسفیان بے ہوش ہو جاتے، رابعہ نے جلدی سے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم ابھی ناتواں بہت ہو۔ تمھیں معلوم نہیں ہے کہ جام، شراب اور ندیم، ان تینوں کے درمیان چوتھی وارفتۂ محبت میں ہوں۔ ساقی سرور کا پیالہ پے در پے بھرتا جاتا ہے اور میں ہوں کہ پیے جاتی ہوں۔ نہ معلوم یہ میرا نشہ ہے، حقیقت ہے یا وہم ہے کہ جب بھی نگاہ اٹھاتی ہوں اُسے دیکھتی ہوں اور جہاں بھی ہوتی ہوں اُس کے ساتھ ہوتی ہوں۔ تجھے کیا معلوم میں نے کتنی راتیں اس کی محبت میں جلتے ہوئے گزاری ہیں لیکن نہ میرے آنسو تھمے نہ وصل ہوا نہ میری زخمی آنکھ پل بھر کے لیے جھپکی۔"

رابعہ بصری کی نگاہ ایک زخمی نگاہ تھی۔ انھوں نے بڑی طویل عمر پائی۔ ان کی زندگی مجاہدات، خیر اور تقوے سے بھرپور تھی اس لیے وہ اُمّ الخیر کہلائیں اور سوختۂ عشق مشہور ہوئیں۔ سو سال تک انھوں نے شب بیداری کی۔ شب زندہ داری کی رسم انھی سے چلی۔ آخری دنوں میں ان کے بدن سے ایک غیر مرئی آگ کی لپٹیں اس طرح اٹھتی تھیں کہ قریب بیٹھنے والا اُس کی تپش سے بے قرار ہو جاتا تھا۔ خود رابعہ وہ تپش اپنے آنسوؤں سے کم کرتی رہتی تھیں۔ کسی نے ان سے پوچھا۔ "رابعہ! اب تو آپ ولایت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہیں۔ آخر اب اس گریہ وزاری کا کیا سبب ہے؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "میں ڈرتی ہوں آخری گھڑی یہ نہ سننا پڑے کہ رابعہ ہمارے سامنے کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہے۔"



ضعیفی میں وہ اپنے یہ اشعار کثرت سے پڑھنے لگی تھیں۔ "دن کی روشنی، رات کی تاریکی، گھومنے والے آسمان، ابلتے ہوئے سمندر، منور چاند، چمکتے ستارے سب تجھے سجدہ کرتے ہیں۔ میں بھی تیرے حضور سجدۂ بندگی پیش کرتی ہوں۔ روئے زمین اور آسمانوں پر جو کچھ ہے، تو نے سب کا انجام مقرر کر دیا ہے۔ میرے لیے بھی کوئی انجام مقرر کر دے۔"

رابعہ کا جسم جیسے جیسے کمزور ہوتا گیا، دل بیدار ہوتا رہا۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ خاکی جسم محبوب اور محب کے درمیان حائل ہے اور یہ دیوار ہٹ گئی تو دوری ختم ہو جائے گی۔ وہ بہت کم کھاتی تھیں۔ نقاہت کی بنا پر بسا اوقات نماز پڑھتے پڑھتے گر پڑتیں۔ شہر میں ان کی بیماری کی خبر عام ہوئی تو ایک خلقت عیادت کے لیے ٹوٹ پڑی۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ آخر وقت میں ان کی دعائیں لے لے لیکن جب بھی کوئی دُعا کی درخواست کرتا، رابعہ بصری سہم کر ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیتیں۔ "بدبخت ہٹ جا میرے سامنے سے۔ مجھ جیسی کمزور اور ناتواں سے دُعا کی درخواست کر رہا ہے؟ میں یہ تک نہیں جانتی کہ خود میرا کیا حشر ہو گا؟"

رابعہ اس امر سے بہت ڈرتی تھیں کہ لوگ انھیں اپنے اور خُدا کے درمیان واسطہ نہ سمجھ لیں۔ اس لیے وہ ہر شخص کو عبادت کی تلقین کرتیں۔ ان کے مختصر سے گھر میں ایک بانس پر ان کا کفن ہمیشہ ان کے سامنے لٹکا رہتا۔ نیچے کچی اینٹوں کا ایک چبوترا تھا۔ وہ اسی پر نماز پڑھتیں اور تھک جاتی تو پھر وہیں اونگھ لیتیں۔ آخری دنوں میں انھوں نے کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ یہ ہجری ایک سو اسّی کی بات ہے۔ وفات سے دو دن پہلے وہ بے حد خوش نظر آنے لگی تھیں، چہرے پر آسودگی پیدا ہو گئی تھی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اب حالت بہتر ہو رہی ہے لیکن انھوں نے اپنی خادمہ کو بتا دیا تھا کہ "اُس نے میری بات مان لی ہے۔ اب دُوری ختم ہونے والی ہے۔ موت کے بعد مجھے عام آدمیوں کی طرح خاموشی سے زمین میں اُتار دینا اور دنیا کی نظروں سے میری قبر ممکنہ حد تک چھپانا۔ جو چادر اس وقت میرے جسم سے لپٹی ہوئی ہے، اسی سے مجھے ڈھانک دینا۔"



مشہور مشائخ ان سے معرفت پر بحث کر رہے تھے۔ رابعہ بصری گفتگو کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گئیں۔ وہ ایک خاص سمت دیکھتی ہوئی مسکرا رہی تھیں۔ پھر انھوں نے مشائخ اور معتقدین سے آہستگی کے ساتھ کہا کہ "یہاں جگہ کم ہے۔ آپ لوگ ملائکہ کے لیے جگہ چھوڑ دیجیے۔" چنانچہ سب لوگ باہر آ گئے اور دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ اس کے بعد اندر سے ایک انتہائی شیریں آواز ابھری۔ "اے نفسِ مطمئنہ! اپنے مولا کی جانب مراجعت کر۔"

کچھ دیر بعد لوگوں نے اندر جا کے دیکھا تو محبوب اور محب کے درمیان سے آخری پردہ بھی ہٹ چکا تھا، ایک ولی اللہ نے چہرے پر چادر ڈالتے ہوئے کہا۔ "آج اُس کا وصال ہو گیا جس نے خُدا کی شان میں کبھی گستاخی نہیں کی اور مخلوق سے کچھ طلب کرنا تو درکنار، اپنے حقیقی مالک سے بھی کبھی کچھ نہیں مانگا۔"

اسی رات کسی نے رابعہ بصری کو خواب میں دیکھا۔ وہ بہت خوش تھیں۔ خواب دیکھنے والے نے دریافت کیا۔ "رابعہ منکر نکیر سے ملاقات کیسی رہی؟"

جواب ملا "نکیرین نے مجھ سے سوال کیا کہ تیرا رب کون ہے؟ میں نے کہا۔ خُدا سے جا کر کہو جس ناسمجھ عورت کو تو نے کبھی فراموش نہیں کیا، وہ تجھے کیسے بھول سکتی ہے اور جب دنیا میں اُس کا تیرے سوا کسی سے تعلق نہیں تھا تو پھر اب کیوں ملائکہ درمیان میں لاتے جا رہے ہیں؟"

رابعہ بصری نے ایک بار کہا تھا۔ "عشق وہی جانتا ہے جس نے اس کا مزہ چکھا ہے۔ جو لوگ عشق کا بیان کرتے پھرتے ہیں وہ گونگے اور بہرے ہیں۔ ہیبت زبان گنگ کر دیتی ہے، حیرت دل کو اظہار سے منع کرتی ہے، غیرت نظر دل کے لیے حجاب ہے اور دہشت عقل کو اقرار سے روکتی ہے۔ یہاں ایک دائمی دہشت اور ابدی حیرت ہے پھر بھی دل کی شگفتگی اور وارفتگی ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ دل سے کہو اُس وقت تک سنبھلا رہے، جب تک اسرار خود عیاں نہ ہو جائیں۔"

ابوسفیان ثوری رابعہ بصری کی وفات کے بعد اکثر کہا کرتے تھے کہ "اسرار عیاں ہونے کے بعد رابعہ نے اپنی مسرّت کیسے برداشت کی ہو گی؟"



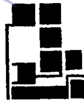
سب رنگ


SILVER EDGE
NOVA
STAINLESS BLADES
SILVER EDGE · NOVA

اُن مجرموں کی کہانی جو ایک پہلو ہمیشہ نظر انداز کر دیتے ہیں، ایک بد قسمت قاتل کی اثر انگیز رُوداد

دُنیا بھر سے، اِدھر اُدھر سے
چار شریر، زہر بھری، رسیلی مختصر مختصر کہانیاں

سائرلی ہیر * نرگس شیخ



مُختصر مُختصر کہانیوں میں پہلی

لندن کے باشندے پروگرس کلب سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پال مال پر اس سے زیادہ پُرشکوہ عمارت کوئی نہیں ہے۔ یہ شرفا کا کلب ہے۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلّق رکھنے والے لوگ اس سے متعلّق ہیں۔ میں خود تو اس کلب میں شامل نہیں ہوں البتہ میرا ایک اچھا دوست والٹر اس کا رکن ہے۔ کچھ روز پہلے ایک دن والٹر نے مجھے اپنے کلب میں کھانے کی دعوت دی۔ والٹر کے متعلّق میں ایک بات بتا دوں، اسے جرم و سزا کے موضوع سے بے حد دلچسپی ہے۔ اس نے قتل کی بے شمار وارداتیں کہانیوں کی صورت میں قارئین کے سامنے پیش کی ہیں اور خود کو جرمیات کا ماہر کہلوانا پسند کرتا ہے اس لیے کھانا کھانے کے بعد جب ہم تمباکو نوشی کے کمرے میں جمع ہوئے تو مجھے والٹر کے حلقۂ احباب میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ایک افسر ویسٹ لینڈ کو دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ والٹر کے قریب قریب تمام دوستوں کو جرم و سزا کے موضوع سے دلچسپی تھی۔

مشروبات کا دور چل رہا تھا۔ ولیسٹ لینڈ نے اچانک مجھ سے پوچھا "کیا آپ اس کلب میں کبھی پہلے بھی آئے ہیں؟"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا "لیکن یہ بہت پرانی بات ہے۔ کئی سال قبل آیا تھا۔ اس کلب کے ایک رکن مسٹر ہیمنڈ نے مجھے مدعو کیا تھا۔"

ہیمنڈ کا نام لیتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہاں اس کا نام لے کے غلطی کی ہے کیونکہ حال ہی میں اسے اپنی بیوی کو قتل کرنے کے الزام میں پھانسی کی سزا ملی تھی۔



میرا دوست والٹر فوراً سمجھ گیا کہ میں کس ہیمنڈ کا ذکر کر رہا ہوں؟ وہ کہنے لگا "میرا خیال ہے کہ ہیمنڈ کا مقدمہ پولیس کے جدید تحقیقاتی طریقے کا اعلا نمونہ تھا۔ اس کا سزا پانا قانون پسند شہریوں اور پولیس کی زبردست فتح تھی۔ اور خاص طور پر تمہاری ولیسٹ لینڈ!"

"عزت افزائی کا شکریہ والٹر!" ولیسٹ لینڈ نے انکسار سے کہا "لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ مقدمہ حل کرنے میں قسمت نے ہمارا بہت ساتھ دیا تھا۔ اگر خوش قسمتی سے ہمیں مضبوط شہادتیں دستیاب نہ ہو جاتیں تو ہیمنڈ کے خلاف ہمارا موقف کمزور رہتا۔ تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ واقعاتی شہادتیں خواہ کتنی ہی ٹھوس کیوں نہ ہوں، عدالت کی نظر میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔"

"درست ہے" میرے دوست نے اثبات میں سر ہلایا "میں جب بھی قسمت کے متعلق غور کرتا ہوں، یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ کیسے کیسے ذہین اور فطین مجرموں کو قسمت نے شکست دی ہے۔ کوئی چھوٹا سا، معمولی سا واقعہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے، ان کے بہترین اور بے مثال منصوبے خاک میں ملا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایبرٹلری کا مشہور مقدمہ..."

لیکن میرا دوست حسب عادت اس مشہور مقدمے کی رُوداد نہیں سنا سکا کیونکہ ایک شخص نے اچانک مداخلت کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے ہم انتھونی کو دنیا کا سب سے بدقسمت قاتل قرار دے سکتے ہیں۔"

ہر شخص کی نظریں اس شخص پر جم گئیں۔ وہ پستہ قد اور دُبلے پتلے جسم کا ایک عام سا آدمی تھا۔ مجھے یاد آیا کہ کسی نے تعارف کراتے وقت اس کا نام ہالسن بتایا تھا اور وہ بھی وہاں میری طرح کسی کا مہمان تھا۔ "انتھونی؟" میرے دوست والٹر نے ذہن پر زور دیتے ہوئے دُہرایا "کیا نام بتایا آپ نے؟ انتھونی؟"

"اس کا پورا نام انتھونی ایڈورڈ ہے۔"

"مسٹر ہالسن! آپ نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔" والٹر نے کہا "شاید میں گزشتہ سو سال کے ہر قابلِ ذکر جرم اور ہر قابلِ ذکر مجرم سے واقف ہوں لیکن یہ نام میری نظر سے کبھی نہیں گزرا۔ کیوں ولیسٹ لینڈ! تم نے سنا ہے یہ نام؟" اسکاٹ لینڈ یارڈ کے افسر نے انکار میں سر ہلایا۔ "مسٹر ہالسن" والٹر نے طنز کے لہجے میں اسے مخاطب کیا "کیا آپ کو مجرم کا نام صحیح یاد ہے؟"

"جی ہاں، کیا آپ پوری کہانی سننا پسند کریں گے؟"

"ضرور، ضرور، یہ مقدمہ میری معلومات میں ایک اضافہ ثابت ہوگا۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے آج تک دنیا کے سب سے بدقسمت قاتل کا نام نہیں سنا اور اسکاٹ لینڈ یارڈ بھی اس سے لاعلم ہے۔" والٹر سگریٹ جلا کر آرام سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں جو کہانی سنانے والا ہوں، وہ بہت سیدھی سادی ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے" ہالسن نے کہا "میں نے اس کا تذکرہ صرف اس لیے کیا تھا کہ جب بھی بدقسمتی کے موضوع پر گفتگو ہوتی ہے، مجھے انتھونی کا نام یاد آ جاتا ہے۔ انتھونی ایک بدمزاج، خود غرض اور لالچی آدمی تھا۔ اس کی بدقسمتی کا آغاز اُس وقت سے ہوا جب اس نے اپنے والدین کے ترکے کی رقم راتوں رات دولت مند بن جانے والے ایک منصوبے پر لگا ڈالی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس قسم کے منصوبے صریحاً فراڈ ہوتے ہیں۔ راتوں رات لکھ پتی بننے کی ہوس نے انتھونی کو اندھا کر دیا تھا۔ اس اندھے پن کا نتیجہ وہی نکلا جو اس قسم کے منصوبوں کا نکلتا ہے۔ اُس کی ساری رقم ڈوب گئی۔ اس نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور مقدمے کا فیصلہ اس کے حق میں ہوا۔ عدالت نے مدعا علیہ کو حکم دیا کہ وہ انتھونی کو دس ہزار پاؤنڈ اور مقدمے کے تمام اخراجات ادا کرے لیکن عدالت سے اپنے حق میں فیصلہ حاصل کرنا الگ بات ہے اور اس فیصلے پر عمل کروانا الگ بات۔ انتھونی کے وکیل نے مخالف فریق سے رقم حاصل کرنے کے لیے قانونی چارہ جوئی کی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ البتہ انتھونی کو اپنے وکیل کو کچھ اور رقم ادا کرنی پڑی۔ مخالف فریق نے خود کو دیوالیا قرار دے دیا تھا۔ انتھونی قانونی طور پر رقم کا حق دار تھا لیکن مخالف فریق کے پاس پیسے ہوتے تو ملتے۔ اس پورے معاملے کا سب سے اذیت ناک پہلو یہ تھا کہ اس کے فریق نے اگرچہ خود کو دیوالیا قرار دے دیا تھا مگر اس کے ٹھاٹ باٹ، رہن سہن اور معمولات میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح شاہانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ لندن سے باہر ایک نواحی علاقے میں اس کی بہت بڑی کوٹھی تھی کوٹھی کے ساتھ ایک وسیع باغ تھا۔ وہ روزانہ ریل کے ذریعے لندن آتا تھا۔ حسب معمول فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں اس کی نشست محفوظ رہتی تھی جس میں تمباکو نوشی کی اجازت تھی۔ قلی وغیرہ اسے دیکھتے ہی ہاتھ اٹھا کر سر جھکا کر تعظیم دیتے تھے۔ بے چارہ انتھونی بھی روزانہ اسی ٹرین سے لندن آتا تھا لیکن وہ تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر کرتا تھا جس میں تمباکو نوشی کی اجازت نہیں ہوتی تقریباً روزانہ ان دونوں کا آمنا سامنا ہوتا تھا۔ انتھونی جب اپنے فریق کو شاندار لباس میں، بہترین سگار منہ میں دبائے سر کی جنبش سے قلیوں کے سلام







کا جواب دیتے دیکھتا تو غصّے کی شدّت سے اس کی مٹھیاں بھنچ جاتیں لیکن وہ بے بس تھا، اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔

مدعا علیہ کے بظاہر دیوالیا ہونے کا اصل سبب یہ تھا کہ اس نے ساری جائداد، دولت، ریس کے گھوڑے اور ہر قابلِ ذکر چیز پہلے ہی اپنی بیوی کے نام کر دی تھی۔ ملازمین کی تنخواہیں، کھانے پینے کا خرچ اور اس کے شاہانہ اخراجات قانونی طور پر اس کی بیوی پورے کر رہی تھی آپ سب کو اس قانون کا علم ہے کہ شوہر پر اگر کوئی رقم واجب ہو تو وہ اس کی بیوی سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ مدعا علیہ اسی قانون سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک خوب صورت اور خوش مزاج عورت تھی لیکن ایسی اچھی بیوی کے ساتھ اُس کا رویّہ ظالمانہ حد تک بُرا تھا۔

ہم آسانی سے یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اگر انتھونی کا اپنے مقروض سے روزانہ سامنا نہ ہوتا تو وہ یقیناً کچھ عرصے بعد مایوس ہو کر صبر کر لیتا لیکن روزانہ سامنا ہونے پر جب وہ اپنا اور اس کا موازنہ کرتا تھا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا غصّہ ایک ایسے نقطے پر پہنچ گیا کہ اگر وہ کسی دن ریلوے اسٹیشن ہی پر اپنے مقروض کو قتل بھی کر دیتا تو کسی کو تعجب نہ ہوتا لیکن یہ امر اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ اسے انتقام کی نہیں، اپنے پیسوں کی پروا تھی۔ اگر وہ مقروض کو جان سے مار دیتا تو اسے اس کے دس ہزار پاؤنڈ کیسے واپس ملتے؟ چنانچہ وہ کسی ایسی ترکیب کی تلاش میں تھا جس کے ذریعے اس کے مقروض کی رقم اور جائداد اس کی بیوی کے نام نہ رہے بلکہ اس کے نام ہو جائے، اس طرح اُس سے قرض وصول کرنا آسان ہو جاتا۔ انتھونی مدّت تک دماغ لڑاتا رہا کہ کیا کرنا چاہیے؟ آخر ایک روز اس کے ذہن میں ایک ایسی ترکیب آ ہی گئی جو بہت سیدھی سادی تھی اور اس کے مسئلے کا منطقی حل تھی۔ مقروض نے بڑی چالاکی سے تمام دولت اور جائداد اپنی بیوی کے نام منتقل کر دی تھی۔ اب انتھونی کو صرف یہ کرنا تھا کہ وہ یہ صورتِ حال اُلٹی کر دے اور بیوی کی تمام دولت اور جائداد دوبارہ شوہر کے نام منتقل کرا دے پھر فوراً اپنا قرض وصول کرے۔ انتھونی کی ترکیب بہت آسان لیکن ہول ناک تھی۔ اُسے اس امر کا پورا یقین تھا کہ مقروض کی بیوی کی وصیّت شوہر کے حق میں ہو گی کیونکہ تمام دولت اور جائداد حقیقتاً اُسی کی تھی۔ لہٰذا انتھونی نے مقروض کی بیوی کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اِس طرح وصیّت کی رو سے اس کا مقروض اپنی بیوی کی تمام دولت اور جائداد کا مالک بن جاتا جس کی مالیت اس کے دس ہزار پاؤنڈ سے کئی گنا زیادہ تھی اور جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کیا، انتھونی کے اندازے صد فی صد درست ثابت ہوئے۔

اس نے اپنے منصوبے پر جلد از جلد عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کئی روز تک مقروض کے مکان کی نگرانی کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اُس کی بیوی روزانہ صبح کوٹھی سے کہیں جانے کے لیے اپنی گاڑی میں نکلتی ہے۔ کوٹھی کے چاروں طرف ایک باغ تھا اور باغ کے اِرد گرد پانچ فٹ اونچی ایک چہار دیواری تھی۔ چہار دیواری کا پھاٹک ہر وقت مقفّل رہتا تھا کیونکہ اطراف کے کسانوں کی گائیں چرتی ہوئی باغ میں گھس آتی تھیں اور سبزے قسم کی ہر چیز کھا جاتی تھیں۔

ایک روز انتھونی بیرونی دروازے کی قریبی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ مقررہ وقت پر مدعا علیہ کی بیوی اپنی گاڑی میں باہر آئی اور اس نے بیرونی دروازے کے قریب گاڑی روکی اور حسبِ معمول پھاٹک کھولنے کے لیے گاڑی سے اُتری۔ انتھونی بھی فوراً جھاڑیوں سے باہر نکلا، پھر قریب پہنچ کے اس نے اپنے پستول سے اُس بے چاری کے سر پر دو گولیاں چلائیں۔ وہ اسی وقت جاں بحق ہو گئی۔ اس کام کے لیے انتھونی نے ایک جرمن پستول استعمال کیا تھا۔ یہ پستول اس نے کئی سال پہلے محض سستا ہونے کی وجہ سے خرید لیا تھا۔ اس نے پستول کے دستے سے انگلیوں کے نشانات صاف کیے اور اسے جھاڑیوں میں پھینک دیا پھر اطمینان سے اپنے گھر چلا

آیا۔ چونکہ مقتولہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے اسے معلوم تھا کہ پولیس اس جرم کا شبہ اُس پر کبھی نہیں کرے گی۔ اس کا یہ اندازہ بھی درست ثابت ہوا۔"

"پھر اسے سزا کیسے ہوئی؟" میرے دوست والٹر نے پوچھا۔

"اسے سزا ہوئی ہی نہیں، اسے تو گرفتار تک نہیں کیا گیا۔" ہابسن نے جواب دیا۔ "میں نے سزا کے بارے میں کچھ کہا بھی نہیں۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ انتھونی دنیا کا سب سے بدقسمت قاتل تھا۔ آپ خود غور فرمائیے کہ اس نے اپنی رقم حاصل کرنے کے لیے جو منصوبہ بنایا تھا، وہ کتنا عمدہ اور صحیح ثابت ہوا۔ اس کے باوجود اسے اپنے دس ہزار پاؤنڈ نہیں ملے۔ آپ اسے بدقسمتی کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں؟ اس کے منصوبے میں کوئی جھول نہیں تھا کوئی خامی نہیں تھی۔ اس کے اندازے بھی درست تھے اور اس نے بڑی کامیابی سے اپنے منصوبے پر عمل بھی کیا تھا یہ سب کچھ اس نے اپنی ہی رقم حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔ وہ کسی دوسرے کی دولت حاصل کرنا نہیں چاہتا تھا پھر بھی اسے دس ہزار میں سے دس پاؤنڈ بھی نہیں ملے۔"

"کیا بیوی نے اپنی وصیّت بدل دی تھی؟" والٹر نے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ وصیّت کے مطابق تمام دولت اور جائداد کا وارث انتھونی کا مقروض ہی تھا۔" ہابسن نے جواب دیا۔ "مگر ہوا یہ کہ انتھونی خود کو الزام سے بچانے کی احتیاطوں میں اس قدر مصروف رہا کہ اس نے یہ نہیں سوچا، اس قتل کا شبہ کس پر کیا جائے گا؟ عام بات ہے کہ جب کسی قلاش شوہر کی دولت مند بیوی قتل ہو جاتی ہے اور شوہر، بیوی کی دولت کا وارث بھی ہوتا ہے تو پولیس سب سے پہلے شوہر ہی سے اپنی تفتیش کا آغاز کرتی ہے۔ اگر انتھونی اس نکتے پر بھی غور کر لیتا تو ضرور کوئی ایسا بندوبست کرتا کہ اس جرم کا ذمے دار اس کا مقروض نہ قرار پائے کیونکہ کسی مجرم کو جرم ثابت ہونے کے بعد جرم کا پھل کھانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس قانون کا سب کو علم ہے کہ اگر کوئی شخص دولت کی ہوس میں کسی کو قتل کر دے اور اس پر جرم ثابت بھی ہو جائے تو وصیّت نامے کے باوجود اسے مقتول یا مقتولہ کے ورثے سے ایک پیسہ بھی نہیں ملتا۔

پولیس نے جب مقتولہ کے شوہر کے خلاف تفتیش کا آغاز کیا تو انتھونی کی بدقسمتی عروج پر پہنچ گئی۔ گھریلو ملازموں کے بیانات سے یہ ثابت ہو گیا کہ واردات کی صبح میاں بیوی کے درمیان زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ بیوی نے غصّے میں یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ وہ فوراً اپنے وکیل کے پاس جا کر وصیّت تبدیل کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اُس روز وہ اپنے معمول کے مطابق کہیں اور نہیں جا رہی تھی بلکہ وکیل کے دفتر جا رہی تھی۔ پولیس کو جھاڑیوں سے آلۂ قتل یعنی انتھونی کا جرمن پستول مل گیا تھا۔ اتفاق دیکھیے کہ اسی قسم کا ایک پستول مقتولہ کے شوہر کے پاس بھی تھا جو اُس نے کئی سال پہلے خریدا تھا اور اس کے بیان کے مطابق خریدنے کے کچھ عرصے بعد وہ گم ہو

گیا تھا۔ یہی دو شہادتیں اتنی مضبوط تھیں کہ کوئی عدالت انھیں نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ نیز پولیس کو ایک ایسا گواہ بھی مل گیا جس نے بتایا کہ اس نے مقتولہ کے شوہر کو واردات سے کوئی دس منٹ پہلے باغ میں گھومتے دیکھا تھا۔ یہ گواہ ملزم کا مالی تھا جو اُس وقت اتفاقاً وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس کی بیوی کے ہاتھ پر چائے کی اُبلتی ہوئی کیتلی گر گئی تھی، وہ ڈاکٹر کو فون کرنے جا رہا تھا۔ یہ عینی شہادت ملزم کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ اس پر مقدمہ چلا اور عدالت نے اسے مجرم قرار دیتے ہوئے پھانسی کی سزا سنا دی پھر جلد ہی اُسے پھانسی دے دی گئی۔ اس طرح انتھونی کے دس ہزار پاؤنڈ ہمیشہ کے لیے ڈوب گئے۔ مقروض کی زندگی میں ہر قرض خواہ کو تھوڑی بہت امید رہتی ہے کہ شاید اسے اپنی رقم کبھی واپس مل جائے لیکن مقروض مر جائے تو یہ امید بھی ختم ہو جاتی ہے۔ انتھونی کی کُل کائنات وہی دس ہزار پاؤنڈ تھے اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے مقروض کی موت کے ساتھ وہ بھی زندہ درگور ہو گیا۔ کیا یہ سزا اس کے لیے کافی نہیں تھی؟

چند لمحوں کے لیے سکوت طاری ہو گیا پھر اچانک کسی نے پوچھا۔

”آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ انتھونی کے مقروض کا نام کیا تھا؟“

ہالبن اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ ”اوہ، مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔ مجھے وکٹوریا اسٹیشن سے ٹرین پکڑنی ہے۔“ اس نے اپنے میزبان سے کہا۔ ”اب میں اجازت چاہوں گا دوستو!“ پھر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا باہر چلا گیا۔

ہالبن کے جاتے ہی محفل بھی برخاست ہو گئی۔ مجھے بھی خاصی دیر ہو گئی تھی اس لیے میں بھی اپنے میزبان کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا۔ باہر مجھے اسکاٹ لینڈ یارڈ کا افسر ویسٹ لینڈ نظر آیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر ہالبن ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے پاس گاڑی موجود تھی اور وکٹوریا اسٹیشن میرے گھر کے راستے میں پڑتا تھا اس لیے میں نے ہالبن کو اپنی گاڑی میں اسٹیشن تک پہنچانے کی پیش کش کی۔ یہ پیش کش اس نے شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔

کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے پھر میں نے ایک جگہ گاڑی موڑتے ہوئے ہالبن سے پوچھا ”میرا خیال ہے کہ آپ کی کہانی میں جس مقروض کا ذکر تھا، اس کا نام ہیمنڈ تھا؟“

”آپ کا قیاس درست ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مجرم نہیں تھا۔ پھر بھی اسے پھانسی دے دی گئی؟ اُف کس قدر ہولناک بات ہے۔ بے چارے ہیمنڈ کے دل پر کیا گزری ہو گی کیونکہ کم سے کم اسے خود تو معلوم تھا کہ وہ بے گناہ ہے؟“

”آپ اُس کی موت پر فضول رنجیدہ ہو رہے ہیں۔ وہ اس سے بھی کڑی سزا کا مستحق تھا۔ اگر آپ اس کی بیوی کے ساتھ اس کا سلوک دیکھ لیتے تو یقیناً یہی کہتے جو میں کہہ رہا ہوں۔“

میں خاموش ہو گیا۔ میرے ذہن میں خیالات کا ایک سلسلہ جا[ری]
تھا۔ مرحوم ہیمنڈ میرا ملنے والا تھا اور میں اس کی فطرت سے کسی حد تک وا[قف]
تھا۔ بکنگھم پیلس کے سامنے سے گزرتے وقت، میں نے ہالبن سے پو[چھا]
”آپ کو صحیح واقعات کا علم کیسے ہوا؟“

”انتھونی کالج میں میرا ہم جماعت تھا۔ جب سے میں اپنے آبائی [...]
منتقل ہوا ہوں، قصبے کے شراب خانے میں اس سے تقریباً روز ملاقا[ت]
ہو جاتی ہے۔ مقدمے کے دوران میں اخباری اطلاعات کی بنیاد پر ہم [...]
میں بحث کیا کرتے تھے۔ ایک رات شراب پیتے ہوئے اس کے منہ سے [...]
بات نکل گئی کہ میں اس کی طرف سے مشکوک ہو گیا۔ پھر میں نے اُس پر سوا[لوں]
کی بوچھار کر دی۔ کچھ دیر بعد اس نے گھبرا کے سب کچھ قبول کر لیا اور شر[وع]
سے آخر تک ساری کہانی سنا دی۔“

”کیا یہ واقعہ مقدمے کے دوران میں پیش آیا تھا؟“

”جی ہاں۔“

”اس کے باوجود آپ نے کچھ نہیں کیا؟“ میں نے تقریباً چلا کے [...]
”آپ نے بے گناہ ہیمنڈ کو پھانسی ہو جانے دی؟“

”جی ہاں۔ آپ ذرا میرا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ہیمنڈ کا [...]
ایک قاتل کے کردار سے کہیں زیادہ بُرا تھا۔ اگر انتھونی یہ سب کچھ نہ کر[تا]
تو مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک روز ہیمنڈ خود اپنی بیوی کو قتل کر دیتا۔ اس
کے علاوہ آپ یہ سوچیے کہ اگر ہیمنڈ کی جگہ اصل مجرم انتھونی پھانسی پا جا[تا تو]
اس سے مقتولہ کو کیا فائدہ پہنچتا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ ہیمنڈ جیسے بدکردار شخص [کا]
مرجانا ہی بہتر تھا۔ کم سے کم میرے حق میں نہ صرف بہتر بلکہ بہت ضروری [...]

”کیا مطلب؟“ میں نے سر گھما کے اسے گھورا۔ وکٹوریا اسٹیشن سا[منے]
نظر آ رہا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی کیونکہ اب میں اپنی گاڑی میں ا[س]
شخص کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

”میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا تھا کہ مقتولہ میری چچی تھیں اور مسٹر ہیمنڈ
میرے چچا تھے۔“ ہالبن نے کہا ”ایک میں ہی اپنی چچی کا قریبی رشتے دار [...]
تھا اس لیے انکل ہیمنڈ کے قاتل تسلیم ہو جانے سے چچی کی تمام دولت ا[ور]
جائداد کا وارث میں قرار پایا۔ میں غریب تھا اس لیے انکل ہیمنڈ کے مق[ابلے]
میں اس دولت کا صحیح حق دار بھی میں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر قتل [...]
روز چچی زندہ رہ جاتیں تو وہ اپنی وصیت تبدیل کر کے مجھی کو اپنا وارث [...]

میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ ہالبن دروازہ کھول [کر]
باہر نکلا ”بے حد شکریہ جناب! امید ہے، آیندہ بھی ملاقات ہوتی رہے گ[ی]۔“
اس نے بڑی شائستگی سے کہا اور دروازہ بند کر کے اسٹیشن کی عمار[ت]
میں داخل ہو گیا۔





ترجمہ * اثر نعمانی

مختصر مختصر کہانیوں میں دُوسری

ہندوستان کے ایک راجہ کی کہانی، جس نے اپنی رعایا کے لیے ایک کنواں تعمیر کیا تھا

کیا سانپ کی آنکھوں میں یہ قوّت ہوتی ہے کہ وہ آدمی پر تنویمی عمل کر سکے؟ میں اس سوال کا کوئی یقینی جواب نہیں دے سکتا۔ اس کا جواب کوئی ایسا برطانوی سپاہی دے سکتا ہے جو ہندوستان میں طویل عرصے تک ملازمت کر چکا ہو یا کوئی سیّاح دے سکتا ہے جس نے بالخصوص ایسے ملکوں کی سیاحت کی ہو جہاں سانپ پائے جاتے ہیں۔ میں صرف ایک تاجر تھا اور تجارت کے لیے ہندوستان میں رہا ضرور ہوں لیکن میرا قیام زیادہ تر بمبئی یا کلکتے میں رہا۔ اِن شہروں میں کوئی سانپ دیکھنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا لندن کے علاقے پکاڈلی میں ناممکن ہے۔

بہر حال اس سوال نے میرے ذہن میں کچھ پُرانی یادیں تازہ کر دی ہیں۔

نوجوانی میں ایک بار مجھے وسطی ہند کی ایک ریاست ڈوگارا پور جانے کا اتّفاق ہوا تھا۔ ڈوگارا پور ایک بہت چھوٹی سی ریاست تھی اور دوسری ریاستوں کی طرح اُسے بھی اپنے داخلی معاملات میں مکمّل آزادی حاصل تھی بلکہ برطانوی حکّام اس ریاست کے معاملے میں کچھ زیادہ الگ تھلگ رہتے تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی اس کا راجہ آکسفورڈ یونیورسٹی کا فارغ التحصیل نوجوان تھا۔ لندن، ڈیوولی اور کینس میں امرا کا طبقہ اُسے بابی کے نام سے پکارتا تھا۔ انگلینڈ میں وہ بالکل انگریزوں کی طرح رہتا تھا لیکن اپنی ریاست ڈوگارا پور میں اُس کا لباس، طور طریق، رہن سہن سب کچھ مقامی رنگ میں رنگ جاتا تھا۔ لوگ اُسے دبی دبی زبان سے خونی راجہ کہتے تھے لیکن یہ اطمینان کرنے کے بعد کہتے تھے کہ کوئی اجنبی اُن کی باتیں سُن تو نہیں رہا ہے؟ بابی کو ایک افسانوی کردار ڈاکٹر جیکل یا مسٹر ہائڈ سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ وہ انگلینڈ میں انگریزوں سے زیادہ انگریز تھا اور ڈوگارا پور میں راجپوتوں سے زیادہ راجپوت۔

ریاست ڈوگارا پور میں باقاعدہ سول سروس تھی، خفیہ پولیس تھی، ایک لائبریری تھی اور ایک تھیٹر اور ایک اسپتال بھی تھا لیکن اِن چیزوں کے علاوہ وہاں ایک اور چیز بھی تھی جسے چیخوں کا کنواں کہتے تھے۔ میری کہانی کا تعلّق سول سروس اور چیخوں کے کنوئیں سے ہے۔ میں ریاست کی سول سروس سے، خصوصاً وزارتِ مالیات سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ واقفیت محض کاروبار کی وجہ سے تھی۔ مالیات کا محکمہ صرف تین افراد پر مشتمل تھا۔ علی داد نامی ایک ایرانی نژاد مسلمان اور دو ڈوگرا راجپوت کلرک اس کے رُکن تھے۔ کلرکوں میں ایک شخص نوجوان اور دوسرا نسبتہً پختہ عمر کا تھا۔ نوجوان کلرک کا نام چرن داس اور دوسرے کا ہرنام سنگھ تھا۔ چرن داس چھوٹے قد، بھاری جسم اور مسکراتے ہوئے چہرے کا مالک تھا۔ ہرنام سنگھ کا قد لمبا اور جسم دُبلا تھا۔ اُس کے چہرے پر قریب قریب ہر وقت خشونت چھائی رہتی تھی۔ ڈوگرا راجپوت ہونے کے علاوہ دونوں میں صرف ایک بات مشترک تھی۔ وہ یہ کہ دونوں بہت محنتی، ذہین اور تجربہ کار تھے۔ اُن کے رجسٹروں کے اندراجات نہایت صفائی سے انگریزی میں ہوتے تھے۔ دونوں کا طرزِ تحریر بھی بہت اچھا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو علی داد انھیں تیس روپے ماہانہ مشاہرے پر کبھی ملازم نہ رکھتا۔ اُس زمانے میں تیس روپے اتنی بڑی تنخواہ تھی کہ اُس کا تصوّر تک بہت کم کلرک کر سکتے تھے۔

مالیات کا کام بے حد رازداری کا حامل تھا۔ علی داد اور راجہ آپس میں طے کرتے تھے کہ کس چیز پر کتنا ٹیکس لگایا جائے؟ پھر دونوں کلرکوں کو ریاست کا بجٹ بنانا پڑتا تھا۔ ڈوگارا پور میں ٹیکس ہر قیمت پر وصول کیا جاتا تھا۔ راجہ کو

دولت اتنی ہی عزیز تھی جتنی برانڈی، گھوڑے یا رقص کرتی ہوئی لڑکیاں۔

یہی وجہ تھی کہ جو لوگ پہلے ہی مطالبے پر ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے انھیں دوسرا موقع دیے بغیر ایک دم چیخوں کے کنوئیں میں پھینک دیا جاتا تھا۔ کنوئیں کے زہریلے سانپ اُن کا خاتمہ کر دیتے تھے پھر راجہ اُن کی جائداد اور ہر چیز بحقِ ریاست ضبط کر لیتا تھا۔

میں ٹوگاراپور میں ایک سرکاری مہمان جیسی حیثیت رکھتا تھا۔ میرے قیام کے دوران میں ایک بار راجہ نے دفعتہً سول سروس میں تخفیف کرنے کا فیصلہ کیا۔ قرعۂ فال وزارتِ مالیات کے نام پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کچھ اہم راز بجٹ بننے سے قبل ہی فاش ہو گئے تھے۔ ایک نئے ٹیکس کے متعلق کچھ افواہیں تاجروں تک پہنچ گئی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب وہ ٹیکس لگایا گیا تو راجہ کی توقع سے بہت کم وصول یابی ہوئی۔ راجہ کو یقین تھا کہ علی داد اور اُس کے دو کلرکوں کے سوا یہ راز کسی اور شخص کے ذریعے باہر نہیں جا سکتا۔

علی داد چونکہ وزیرِ مالیات سمجھا جاتا تھا اس لیے سب سے پہلے اُسی کی شامت آئی۔ راجہ نے اُسے فرض سے کوتاہی کا مرتکب قرار دیا اور کوئی صفائی سُنے بغیر چیخوں کے کنوئیں میں ڈلوا دیا۔ یہ کنواں زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن چوڑا بہت تھا۔ اس کے دائرے کی دیوار ایک عام آدمی کے سر سے کچھ بلند تھی مگر ہاتھوں کی پہنچ کے اندر تھی۔ کنوئیں میں بے شمار زہریلے سانپ موجود تھے۔ اُن کی آنکھوں کا غیر معمولی سحر آدمی کو اپنی کشش سے نکلنے نہیں دیتا تھا ورنہ اگر سانپ موقع دیتے تو کسی شخص کے لیے کنوئیں سے باہر نکلنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ ایک آدھ شخص نے یہ کوشش کی تھی اور وہ نکل بھی آیا تھا مگر راجہ کے مستعد سپاہی باہر کھڑے تھے، انھوں نے اُسے پھر کنوئیں میں دھکیل دیا۔ کنوئیں کی تہہ ہموار تھی اور اُس پر ریت بچھی ہوئی تھی۔ کنوئیں کے بیچوں بیچ ایک نہایت لمبا شہتیر گاڑ دیا گیا تھا۔ شہتیر انتہائی مضبوط گرہ دار لکڑی کا تھا اور کنوئیں کے دہانے سے بہت زیادہ بلند تھا۔ دُور دُور کھڑے ہوئے لوگوں کو صاف نظر آ جاتا تھا۔ کنوئیں کی تہہ سے اُس پر چڑھتے ہوئے اُوپر تک آ جانا مشکل نہیں تھا مگر کوئی شخص اس پر چڑھ کے باہر چھلانگ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ کنوئیں کی غیر معمولی چوڑائی کے باعث دوبارہ تہہ میں گر جانے کا خطرہ رہتا تھا اور تہہ میں گر کے سانپوں سے بچنا محال تھا۔ جسے بھی کنوئیں میں ڈالا جاتا، وہ سانپوں سے جان بچانے کے لیے شہتیر پر چڑھ جاتا تھا اور اُس وقت تک اُس سے چمٹا رہتا تھا جب تک اُس کے ہاتھوں میں سکت رہتی تھی۔ پھر جب اُسے محسوس ہوتا کہ اب وہ نیچے گر جائے گا تو وہ خوف کے سبب بُری طرح چیخنے لگتا تھا۔ کچھ سانپ کنوئیں کی تہہ میں ہر وقت موجود رہتے تھے اور زیادہ تر سانپ آدمی کی چیخیں سُن کے دیواروں کے سوراخوں سے باہر نکل آتے تھے اور جب وہ بدنصیب شخص نیچے گرتا تھا تو ایک دم اُس پر اپنے زہریلے پھنوں سے یلغار کر دیتے تھے۔

علی داد بھی زیادہ دیر تک شہتیر پہ نہیں رہ سکا۔ تہہ کے سانپ پھن اُٹھا اُٹھا کر اُس کی طرف گھور رہے تھے اور ٹکٹکی باندھے اُسے تک رہے تھے۔ علی داد بُری طرح چیخ رہا تھا۔ جیسے جیسے اُس کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں، سوراخوں سے سانپ نکل نکل کر کنوئیں کی تہہ میں جمع ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ اُس کے سُن ہاتھوں سے شہتیر چھُوٹ گیا اور وہ ایک آخری کرب ناک چیخ کے ساتھ کنوئیں میں جا پڑا اور ریاست ٹوگاراپور صرف چند ثانیوں میں اپنے وزیرِ خزانہ سے محروم ہو گئی۔



علی داد کی عبرت ناک موت سے بھی راجہ کا انتقام پورا نہیں ہوا تھا۔ ابھی دونوں ڈوگرا کلرک باقی تھے۔ راجہ کا خیال تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں نئے ٹیکس کی خبر تاجروں تک پہنچانے کے مجرم ہیں۔ وہ انسانی خون کا پیاسا تھا اس لیے یقیناً دونوں کلرکوں کو چیخوں کے کنوئیں میں پہنچانا چاہتا ہوگا مگر مشکل یہ تھی کہ اگر وہ دونوں مار دیے جاتے تو راجہ کے پاس کوئی اُن جیسا تجربہ کار کلرک باقی نہ رہتا جس سے امّید ہوتی کہ وہ ریاست کا شعبۂ مالیات حُسن و خوبی سے سنبھال لے گا چنانچہ اُن دونوں میں سے ایک کا زندہ رہنا ضروری تھا مگر سوال یہ تھا کہ کسے مارا جائے اور کسے زندہ رکھا جائے؟ چرن داس اور ہرنام سنگھ دونوں بہت شدّ و مد کے ساتھ خود کو بے گناہ کہہ رہے تھے۔ راجہ بعض معاملات میں بڑا عملی آدمی تھا۔ اسے چرن داس یا ہرنام سنگھ، کسی سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اُس کی نظر میں دونوں برابر تھے۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ کام اور کارکردگی کے اعتبار سے جو بھی بہترین ہوگا، اُسے زندہ رکھا جائے گا۔ ظاہر ہے، یہ ایک عملی فیصلہ تھا۔ راجہ نے یہ فیصلہ بروئے کار لانے کے لیے آزمائش کا جو طریقہ سوچا تھا، وہ بھی عملی اور منطقی تھا۔ اُس نے چرن داس اور ہرنام سنگھ کا امتحان اس طرح لینے کا انتظام کیا کہ ریاست کے دوسرے لوگ بھی اُس سے لطف اندوز ہو سکیں۔

میں راجہ کا مہمان تھا اس لیے مجھے امتحان گاہ پہنچنے کی خصوصی دعوت دی گئی۔ امتحان گاہ ایک کھُلے میدان میں تعمیر کی گئی تھی۔ ایک اونچا اسٹیج تھا۔ اُس کے تین اطراف کپڑا تان کر ایک کمرہ سا بنایا گیا تھا۔ سامنے تھیٹر کے اسٹیج کی طرح پردہ گرا ہوا تھا۔ اسٹیج کے سامنے صوفوں اور کرسیوں کی کئی قطاریں تھیں جہاں ریاست کے عہدے دار اور دوسرے معزّزین بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے راجہ اور اُس کے مقرّبین کے ساتھ پہلی صف میں جگہ ملی تھی۔ جہاں تک میرا تعلّق تھا، میں چرن داس کے حق میں تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ہرنام سنگھ سے کم عمر تھا اور اُس کے چہرے پر معصومیت تھی، یا شاید اس لیے کہ اُس کی ایک خوب صورت بیوی تھی اور ایک پھُول جیسا بچّہ تھا۔ ابھی اُن دونوں کو اُس کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف ہرنام سنگھ تھا۔ وہ چرن داس سے زیادہ پختہ کار اور خود اعتماد نظر آتا تھا۔ چونکہ یہ فریقین کی قوّتِ برداشت کا مقابلہ تھا اس لیے لوگوں کی اکثریت اس بات پر متفق تھی کہ ہرنام سنگھ چرن داس پر سبقت لے جائے گا۔

اسٹیج کا پردہ اُٹھا۔ اسے ایک دفتر کی طرح تیار کیا گیا تھا۔ دو بڑی


سپر
ریکسونا میں شامل ۴ نایاب تیلوں کا اثر
جِلد کو حسین اور شگفتہ رکھتا ہے!
SUPER
REXONA
contains four rare beauty oils
RX 2.300.74.U8
R: LINTAS

میزیں آمنے سامنے رکھی تھیں۔ اُن کے ساتھ کرسیاں تھیں۔ میزوں پر فائلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ روشنائی، قلم، پنسل، فٹ رول اور وہ تمام چیزیں موجود تھیں جن کی ایک کلرک کو ضرورت ہو سکتی ہے۔ دونوں میزوں پر بالکل ایک جیسی چیزیں رکھی گئی تھیں۔ میزوں کے پیچھے چند اور کرسیاں بچھی تھیں جن پر یہ مقابلہ جانچنے اور پرکھنے کے لیے سول سروس کے تجربہ کار کلرک اس طرح بیٹھنے والے تھے جیسے باکسنگ کے کسی مقابلے میں ایمپائر بٹھائے جاتے ہیں۔

پھر گھنٹی بجی۔ اسٹیج کے ایک جانب سے چرن داس اور دوسری جانب سے ہرنام سنگھ نمودار ہوا۔ چرن داس بہت پریشان اور گھبرایا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس ہرنام سنگھ مطمئن اور پُرسکون نظر آرہا تھا۔ دونوں اپنی اپنی میزوں پر بیٹھ گئے۔ اُن کے سامنے حساب کتاب کے کئی سادہ رجسٹر بھی رکھے ہوئے تھے۔ انھیں متعلقہ فائلوں سے تمام اندراجات رجسٹروں میں منتقل کرنے تھے۔ یہ اندراجات ریاست کے ٹیکس دینے والے افراد سے متعلق تھے کس ٹیکس دینے والے کا کیا نام ہے؟ کیا پتہ ہے؟ کیا پیشہ ہے؟ کتنی آمدنی ہے؟ اور وہ کتنا ٹیکس ادا کرتا ہے؟ یہ معلومات مختلف فائلوں میں محفوظ تھیں، انھیں رجسٹروں میں چڑھانا تھا اور ساتھ ساتھ رقموں کی میزان بھی لگانی تھی۔

دوسری گھنٹی بجی۔ مقابلے کے منصف کلرک آکے پچھلی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پھر فوراً تیسری گھنٹی بجی اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ چرن داس کی حالت بہت خراب تھی۔ اُس کے چہرے پہ زردی چھائی ہوئی تھی۔ ہاتھوں میں رعشہ سا تھا اور انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی سے اپنے بارے میں مایوس ہو چکا ہے۔ اس کے برعکس ہرنام سنگھ نے بے حد خود اعتمادی کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ ایک ایک فائل اُٹھاتا اور رجسٹر میں کالموں کے اعتبار سے تیزی کے ساتھ اندراجات کرتا جاتا۔ چرن داس کی حالت دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر گاہے گاہے ایک طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوتی اور وہ بڑی حقارت سے اُسے دیکھ کے دوبارہ اپنے کام میں لگ جاتا۔ ایک بار چرن داس نے بھی اپنا جھکا ہوا سر اُٹھایا اور ہرنام سنگھ کی حقارت دیکھ لی۔ پھر غالباً اُس کا راجپوتی خون جوش میں آیا اور اُس کے چہرے پر سرخی نمودار ہوئی۔ اُس کے انداز سے ایک مصمم عزم کا اظہار ہوا اور اُس کے کام میں بھی وہی پھرتی اور خود اعتمادی نظر آنے لگی جس کا ہرنام سنگھ مظاہرہ کر رہا تھا۔

مقابلہ چونکہ کافی دیر تک یعنی کام مکمل ہونے تک جاری رہنا تھا اس لیے حاضرین بیچ بیچ میں سرگوشیاں کرنے لگتے یا کھانے وغیرہ کے لیے اُٹھ کر جاتے اور دوبارہ واپس آجاتے۔ اب وہ دونوں قریب قریب یکساں رفتار سے کام کر رہے تھے۔ فائلیں اِن ٹرے سے منتقل ہو کے آؤٹ ٹرے میں جمع ہوتی جا رہی تھیں لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ہرنام سنگھ کے ہاتھوں اور چہرے سے تھکن نمایاں ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ ہرنام سنگھ واضح طور پر بُری طرح تھکا ہوا اور پسینے میں شرابور تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کے چرن داس کو بے گناہ سمجھنے والے لوگ بہت خوش تھے اور انھیں توقع تھی کہ چرن داس یہ مقابلہ جیت جائے گا مگر ہرنام سنگھ تھکن کے باوجود بہت زیادہ پیچھے نہیں تھا۔ اُس کی یہ کیفیت دیکھ کے چرن داس نے پھر ایک نئے ولولے اور نئے جوش سے کام کرنا شروع کر دیا۔ شاید اُسے بھی اپنی جیت کی امید ہو گئی تھی۔ اب اُس کے ہاتھ انتہائی تیزی سے چل رہے تھے۔ سب کو تعجب تھا کہ وہ صبح سے کام کر رہا ہے مگر تھکن سے چُور ہونے کے باوجود اب بھی اُس کی پھرتی اور مستعدی میں کمی نہیں آئی۔

ابھی ہرنام سنگھ کے سامنے ایک پوری فائل نامکمل موجود تھی کہ چرن داس نے اپنا رجسٹر مکمل کر لیا۔ لوگوں نے تالیاں بجا بجا کے مسرت کا اظہار کیا مگر آخری فیصلے کے لیے محض کام ختم کر لینا کافی نہیں تھا۔ چند منٹ بعد ہرنام سنگھ بھی اپنا کام ختم کر چکا تھا۔

پچھلی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے منصفین آگے آگئے۔ انھوں نے دونوں کے رجسٹروں کا غور سے معائنہ کیا پھر چرن داس کو بلا کے رجسٹر کا آخری صفحہ کھولا اور ایک جگہ انگلی رکھ کے کچھ پوچھا۔ چرن داس کا چہرہ ایک دم فق ہو گیا۔ غالباً اپنی تیزی اور پھرتی کی وجہ سے وہ کوئی غلطی کر گیا تھا۔ منصفین نے ایک دو مقامات پر اور اعتراض کیا۔ اس کے برعکس ہرنام سنگھ کے رجسٹروں میں انھیں کوئی خرابی نظر نہیں آئی اور اس طرح چرن داس کامیابی کے بالکل قریب پہنچ کے بھی ہار گیا۔ ہرنام سنگھ کی جیت کا اعلان کر دیا گیا۔ اُس کے حامی مسرت سے اُچھل اُچھل کے چلانے اور تالیاں بجانے لگے۔

آخر جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو راجہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ "دیوتاؤں نے اپنا فیصلہ سُنا دیا ہے۔" اُس نے بلند آواز سے کہا۔ "چرن داس مجرم ہے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ اُسے سانپوں کے کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔"

دوسرے دن راجہ نے عام چھٹی کی منادی کرا دی اور ساری پرجا کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ چرن داس کی سزا کا نظارہ کر کے عبرت حاصل کرے۔ چرن داس کو دوپہر کے وقت کنوئیں میں پھینکا گیا۔ میں چونکہ مہمان تھا اس لیے راجہ نے مجھے اپنے ساتھ کھڑے ہونے کی عزت بخشی۔ کنوئیں کے چاروں طرف پرجا کے لیے اس طرح سیڑھیاں بنا دی گئی تھیں جس طرح کسی سرکس یا اسٹیڈیم میں ہوتی ہیں۔ سیڑھیوں کے قریب ریاست کے اہل کاروں اور معززین کے لیے کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ البتہ میں اور راجہ کنوئیں کی دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ ہمارے قریب ایک آدھ خاص ملازم اور محافظ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ہمارے اور دوسرے لوگوں کے درمیان وہ فاصلہ برقرار رکھا گیا تھا جو راجہ اور پرجا کے درمیان ہوتا ہے۔

چرن داس کنوئیں کی تہہ میں پہنچتے ہی وحشت زدہ ہو کے شہتیر پر چڑھ گیا۔ جب تک وہ شہتیر پر تھا سانپوں سے محفوظ تھا۔ وہ ہماری توقع سے زیادہ جری اور باہمت ثابت ہوا۔ خوں خوار سانپ دیکھ کر اُس نے کسی خوف کا اظہار

نہیں کیا نہ ہی اُس کے منہ سے کوئی چیخ نکلی۔ سانپ حسبِ معمول اپنے پیاسے پھن اُٹھائے بُری طرح اُسے گھُور رہے تھے "مجرم بڑا بہادر بن رہا ہے مگر تم دیکھنا کہ سانپ اُسے اپنی آنکھوں کے حیرت انگیز سحر سے جلد ہی نیچے کھینچ لیں گے۔" راجہ نے مجھ سے کہا "یہ نظارہ شراب کی چُسکیاں لیتے ہوئے دیکھا جائے تو اِس کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ بھلا کلکتے اور بمبئی میں تمھیں یہ کھیل کہاں ملیں گے۔"

اُس کے اشارے پر برانڈی اور شیمپین ملا کے بنائی ہوئی شراب کے دو گلاس فوراً فراہم کر دیے گئے۔ میں اور راجہ اپنے اپنے گلاس ہاتھوں میں لیے کنوئیں کی دیوار پر جھک کر نیچے کا منظر دیکھنے لگے۔ سانپ اپنے شکار کے لیے بہت بے چین تھے مگر چرن داس چیخ نہیں رہا تھا بلکہ تماشائیوں کے ہجوم میں ایک طرف دیکھ دیکھ کے مُسکرا رہا تھا۔ میں نے اُس کی نظروں کا تعاقب کیا تو دیکھا کہ بھیڑ میں ایک جگہ اُس کی بیوی بھی کھڑی ہے۔ مجھے یاد آیا راجہ نے حکم دیا تھا کہ "جس وقت چرن داس کو سزا دی جائے، اُس وقت اُس کی بیوی کو بھی اپنے گناہ گار پتی کا انجام دیکھنے کے لیے موجود ہونا چاہیے۔"

چرن داس کو مُسکراتے دیکھ کر راجہ نے بھی اُس کی بیوی کی طرف دیکھا اور زہرخند سے حکم دیا کہ "اسے کنوئیں کی دیوار کے قریب بلا کے کھڑا کیا جائے تاکہ وہ اُن سانپوں کی زیارت بھی کر سکے جو اُس کے پتی کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اِس حکم کی بھی فوراً تعمیل کی گئی اور چرن داس کی بیوی کنوئیں کے پاس لا کے کھڑی کر دی گئی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل خاموش کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے پہ نہ اضطراب تھا، نہ خوف و ہراس۔ جب بھی چرن داس اُس کی طرف دیکھتا، اُس کے ہونٹوں پر بھی ایک خفیف سی مُسکراہٹ پھیل جاتی جیسے وہ اُسے کسی بات کا اطمینان دلا رہی ہو۔ میں نے قیافے سے اُس کے خیالات کا اندازہ لگا لیا۔ شاید وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہی مرنے کا فیصلہ کر کے آئی تھی اور غالباً اس مقصد کے لیے کوئی زہر بھی ساتھ لائی تھی کہ جیسے ہی اُس کا شوہر تھک کر شہتیر سے نیچے گرے گا اور سانپ اُسے ڈسیں گے، وہ بھی زہر کھا لے گی۔

ہم سب انتظار کر رہے تھے۔ اِس دوران میں ایک خدمت گار برابر راجہ کا گلاس شراب سے بھرتا رہا۔ میں بہت کم پینے کا عادی ہوں اس لیے بڑے بڑے گھونٹ بھرنے کے بجائے صرف چُسکیاں لے رہا تھا —— میرا گلاس دوبارہ بھرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ راجہ جام پہ جام چڑھاتا گیا۔ یہاں تک کہ چرن داس کے ہاتھوں کی گرفت شہتیر پر ڈھیلی پڑنے لگی اور وہ آہستہ آہستہ نیچے پھسلنے لگا۔ سانپ اور زیادہ مستعد ہو گئے۔ بہادر راجپوت شہتیر سے لپٹا ہوا اِس طرح کانپ رہا تھا جیسے کوئی درخت گرنے سے پہلے جھرجھری لیتا ہے۔ وقت کی رفتار جیسے تھم گئی تھی۔ مجمع پر ایک پُرہول سکوت چھا گیا۔ "وہ گر رہا ہے۔" ہجوم کا کوئی شخص چیخ کر بولا۔

پھر اچانک ایک جگر خراش چیخ بلند ہوئی۔ دُھوپ کی روشنی میں ایک جسم کنوئیں میں گرتا نظر آیا۔ ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

مگر گرنے والا شخص چرن داس نہیں تھا بلکہ خود راجہ تھا۔ وہ شراب کے نشے میں کنوئیں کی دیوار پہ ضرورت سے زیادہ جُھک گیا تھا اور اُس کا توازن بگڑ گیا تھا۔ جب اُس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تو سنبھلنے کے بجائے کنوئیں میں جا گِرا۔ اب کوئی اُس کی مدد نہیں کر سکتا تھا اور کرتا بھی کیوں؟ ریاست میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جسے اُس ظالم کے گرنے سے خوشی نہ ہوئی ہو۔ وہ کوئی چوٹ کھائے بغیر کنوئیں میں گرا اور کسی بزدل کی طرح چیختا ہوا دیوار پر چڑھنے کے لیے بھاگا لیکن کنوئیں کے سانپ اُس سے کہیں زیادہ چُرتیلے تھے۔ اس سے پہلے کہ راجہ دیوار پر چڑھتا، سانپوں نے بُری طرح اُسے آلیا۔ وہ اُس سے لپٹ لپٹ گئے اور بار بار اُس کے جسم پر پھن مارنے لگے۔ راجہ بُری طرح تڑپ رہا تھا اور حلق پھاڑ پھاڑ کے چیخ رہا تھا۔ سانپ اپنے شکار میں اتنے مصروف تھے کہ اُن میں سے کسی کی توجہ چرن داس کی طرف نہیں گئی۔

چرن داس شہتیر سے پھسلتا ہوا نیچے آگیا تھا۔ شہتیر سے نیچے آکے اُس نے موقع پاتے ہی دیوار کی طرف چھلانگ لگا دی۔ لوگوں نے خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے اُسے باہر نکلنے میں مدد دی اور دوسرے ہی لمحے اُس کے ہاتھ پکڑ کے اُسے کنوئیں سے کھینچ لیا پھر اُسے اپنے کندھوں پر سوار کر کے گاتے بجاتے اُس کی بیوی کو ساتھ لے کے واپس چلے گئے۔

ٹوگاراپور میں اگر آج بھی آپ لوگوں سے اِس سلسلے میں پوچھیں تو یہی جواب ملے گا کہ سانپوں نے راجہ کو اپنے زہر سے، اپنی آنکھوں کے سحر سے کنوئیں میں کھینچ لیا تھا مگر حقیقت یہ نہیں تھی۔ پھر کیا وہ شراب کے نشے کے باعث نیچے گرا تھا؟ ہاں، گِرنے کا ایک یہ جواز بھی پیش کیا جا سکتا ہے لیکن بات کچھ اور تھی۔ دِن کے وقت برانڈی اور شیمپین ملا کر پینا اچھا نہیں ہوتا۔

راجہ کو دراصل اُس آنسو نے مارا تھا جو میں نے چرن داس کی بیوی کی آنکھ سے بہتے دیکھا تھا۔ صرف ایک آنسو، جسے اُس نے جلدی سے پونچھ لیا تھا۔ میں اُس زمانے میں نوجوان تھا۔ نوجوانوں کا خون گرم ہوتا ہے۔ وہ بے حد جذباتی بھی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ کوئی خطرناک فیصلہ کر لیتے ہیں اور اچھی طرح سوچنے سے پہلے اُس پر عمل بھی کر ڈالتے ہیں۔ چرن داس کی بیوی کا آنسو دیکھ کے میں نے بہت خاموشی کے ساتھ جُھک کے انتہائی پھُرتی سے راجہ کو پیچھوں کے کنوئیں میں دھکیل دیا تھا۔ مجھے یہ یقین تھا کہ پورے مجمع کی نگاہیں چونکہ شہتیر سے پھسلتے ہوئے چرن داس کی طرف لگی ہوئی تھیں اس لیے میری یہ حرکت کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ ویسے بھی ہمارے اور مجمع کے درمیان اتنا فاصلہ ضرور تھا جتنا راجہ اور پرجا کے درمیان ہوتا ہے۔







ترجمہ * اطہر ندیم

مختصر مختصر کہانیوں میں تیسری

ایک سعادت مند شوہر کی کہانی؟ ایک دلچسپ تماشا ایک وعدہ جس کا ایفا ہر حال میں کیا گیا

"سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں" میری بیوی غصے میں تھی اس نے اس جملے کے علاوہ بھی پتہ نہیں کیا کیا کہا۔ وہی بار بار دُہرائی ہوئی باتیں کہ میں خود غرض ہوں، بے پروا ہوں، مجھے اُس کا کوئی خیال نہیں ہے، صرف اپنے کاموں کے متعلق سوچتا رہتا ہوں، مجھ پر قطعی اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور میں نے آج تک اپنا کوئی وعدہ پورا نہیں کیا۔ وغیرہ

اُن دنوں ہم ایک کشادہ اور خوش نما فلیٹ میں رہتے تھے۔

یہ جھگڑا صبح ناشتے کی میز پر شروع ہوا تھا اور جھگڑے کی بُنیاد میری بیوی کی ڈائمنڈ رسٹ واچ تھی جسے میں مرمّت کے لیے لے جانا ایک بار پھر بھول گیا تھا۔" میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ اب خاموش بھی ہو جاؤ۔" میں نے غصہ پیتے ہوئے سکون سے کہا۔" میں آج ہی بلکہ ابھی تمھاری گھڑی لے جاتا ہوں اور کان پکڑ کے وعدہ کرتا ہوں کہ جس طرح لے جاؤں گا اسی طرح واپس لے آؤں گا' بھولوں گا نہیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر رسٹ واچ اپنی جیب میں رکھ لی۔" میں یہاں سے سیدھا سلیمان پاشا کی دکان پر جاؤں گا اور اُس وقت تک وہیں بیٹھا رہوں گا جب تک وہ اسے درست نہ کر دے۔ بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ بھروسا کرو' اطمینان رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس طرح میں نے اپنی بیوی کا غصہ ٹھنڈا کیا ظاہر ہے اتنی دیر میں ناشتہ بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ میں نے قاہرہ کا مخصوص ناشتہ کیا۔ یہ ناشتہ سیاہ ترین کافی پر مشتمل تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوا تو سفارت خانے سے فون آگیا۔ کسی خصوصی کام کے سلسلے میں بلایا جا رہا تھا۔ میں فوراً پہنچا۔ معلوم ہوا کہ جنرل نجیب کے ہیڈ کوارٹر پر کوئی اہم کانفرنس ہے۔ اُس میں شرکت کرنی ہے۔

سرکاری مصروفیات شروع ہو جائیں تو مشکل سے ختم ہوتی ہیں۔ دن بھر کے انہماک کے بعد جب مجھے کچھ ہوش آیا تو شام ہو چکی تھی۔ میں تھکا ماندہ رات کے کھانے سے کچھ پہلے گھر پہنچا۔ اتّفاق سے بیوی کہیں گئی ہوئی تھی۔ میں نے کپڑے تبدیل کیے بغیر الماری سے وھسکی نکال کے ایک گلاس بھرا اور کرسی پر آ بیٹھا اور اخبار اٹھا کے دیکھنے لگا۔ سگریٹ کی خواہش ہوئی تو جیب میں ہاتھ ڈالا مگر انگلیاں سگریٹ کے بجائے بیوی کی ڈائمنڈ رسٹ واچ سے مَس ہوئیں۔ میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ رسٹ واچ میرے ہاتھ میں تھی اور میں اسے گھور رہا تھا۔

یہ لعنتی رسٹ واچ، آج پھر میں اس کی مرمّت کرانا بھول گیا؟ اور وہ بھی اتنے پختہ وعدے کے بعد؟ اب یقیناً قیامت آجائے گی۔

میں دل میں شرمندہ بھی تھا اور بیوی کے غصے کے خیال سے پریشان بھی۔ میں نے گھبراہٹ میں میز کے گرد دو تین چکر لگاتے مگر اس طرح پریشان ہونے سے کیا ہوگا۔ میں نے خود سے کہا۔ ابھی کچھ ایسی رات بھی نہیں ہوئی ہے۔ سلیمان پاشا کی دکان کھلی ہوگی۔ کیوں نہ میں ابھی شہر واپس جاؤں اور گھڑی کی مرمت کرا کے بیوی کی واپسی سے پہلے لوٹ آؤں؟ پھر بیوی کو یہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی کہ آج میں پھر یہ کام بھول گیا تھا۔

میں تیزی کے ساتھ باہر آیا، گیرج سے کار نکالی اور شہر روانہ ہو گیا مگر بدقسمتی سے جب میں بازار پہنچا اور کاروں سے لبریز سڑک پر اپنی گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوا تو سلیمان پاشا دکان بند کر کے جا چکا تھا۔

اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ بیوی کے دلبرانہ غصے سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ پھر اب جب ایک قیامت آنی ہی ہے تو فوراً گھر پہنچنے کی کیا ضرورت ہے؟

میں دریائے نیل کے ساحل پہ ایک ائیرکنڈیشنڈ بار میں گھس گیا۔ یہ بار منتخب کرنے کی ایک وجہ تھی۔ یہاں کبھی کبھی میرے دوست بھی آ جاتے تھے۔ خیال تھا کہ اگر اُن میں سے کوئی مل گیا تو کچھ وقت اچھا گزر جائے گا لیکن اندر پہنچ کے میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔ پھر بھی مجھے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کیونکہ میری نظریں ایک خوبصورت شے میں الجھ کے وہیں رک گئی تھیں۔ وہ ایک بہت حسین اور دلکش امریکن لڑکی تھی۔ میں نے اسے پہلے کبھی اس بار میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ تنہا بیٹھی تھی اس لیے مجھے اُس سے متعارف ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے اسے پینے کی پیش کش کی۔ میری پیش کش اس نے قبول کر لی۔ ہم نے چند جام پیے۔ بار میں ہلکی ہلکی موسیقی بھی ابھر رہی تھی، میں نے اس سے رقص کے لیے کہا۔ وہ کسی تامّل کے بغیر اٹھ کر میرے ساتھ رقص کرنے لگی۔ ہم نے کئی بار رقص کیا۔ رات زیادہ ہوتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی شراب کا نشہ بھی بڑھ رہا تھا۔ اب مجھے گھر اور بیوی کی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی۔ ذہن میں ایک دھندلا سا خیال تھا مگر وہ اتنی دور کی چیز معلوم ہو رہا تھا کہ مجھے کوئی تشویش نہیں تھی۔ میں نے اس لڑکی سے کہا۔ "میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ کیا تم اپنے گھر تک میری رہنمائی کر سکتی ہو؟"

وہ اس طرح مسکرائی جیسے اسے بہت دیر سے ان الفاظ کی توقع ہو اور جیسے اس نے پہلے سے سب انتظام کر رکھا ہو۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ میں نے شراب کا بل ادا کیا اور لڑکی کا ہاتھ اپنے پہلو میں دبائے بار سے باہر آ گیا۔ رات بہت پُرسکون، خنک اور خوشگوار تھی۔

تاروں بھرا نیلا آسمان نہایت اچھا لگ رہا تھا۔ میں اسے لے کے اپنی کیڈیلاک کار میں آ بیٹھا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور دریائے نیل کے ساتھ خدیو اسماعیل پر چل دیا۔ لڑکی مجھ سے لگی بیٹھی تھی۔ اس کے بدن، بالوں اور لباس سے بھینی بھینی خوشبوئیں اُٹھ رہی تھیں اور میرے پورے وجود پر ایک پُراسرار نشہ چھا رہا تھا۔ میں نے کار کا ریڈیو کھول دیا۔ سحر انگیز ماحول کی رنگینی دوبالا کرنے کے لیے موسیقی کی لہریں فضا میں بکھر گئیں۔

"کاش یہ راستہ کبھی ختم نہ ہو اور ہم اسی طرح چلتے رہیں۔" لڑکی خواب ناک لہجے میں بولی۔

بہت رومانی الفاظ تھے مگر عجیب بات تھی کہ ان الفاظ نے مجھے میری دوسری ذمہ داریوں کا احساس دلا دیا۔ اس احساس کے ساتھ ہی مجھے وقت کا خیال آیا کہ نہ معلوم کیا بجا ہے؟ میں ایک دم چونک گیا اور مجھے اپنی بیوی کی ڈائمنڈ رسٹ واچ یاد آ گئی۔

لڑکی بڑی محبت کے ساتھ مجھ سے لگی بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میرے پورے جسم پر چیونٹیاں سی بکھیر رہے تھے۔ اُس کی یہ ادا اُس رومانی ماحول میں قطعی فطری اور متوقع تھی لیکن جب میری جیب میں ہزاروں ڈالر کی قیمتی رسٹ واچ پڑی ہو تو یہی بات ذہن میں ایک شبہ بھی پیدا کر سکتی تھی۔ "ایک منٹ ٹھیرنا!" میں چونک کر سیدھا ہو گیا۔ میں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر گھڑی ٹٹولی پھر جیسا کہ مجھے اندیشہ تھا، گھڑی غائب تھی۔ میں نے غصے سے سوچا، اس لڑکی نے محبت کی آڑ میں بڑی خوبصورتی سے مجھ پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ میں نے فوراً گاڑی رکنے کے لیے بریک لگائے۔ رات کے سناٹے میں پہیے چیخ اٹھے۔ کار ایک دو گز پھسلی پھر رک گئی۔ "کھیل ختم ہو گیا۔" میں نے کڑے لہجے میں لڑکی سے کہا۔ "بس میں تمھیں یہیں تک پہنچا سکتا تھا۔"

"کیا ہوا؟" لڑکی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"گھڑی!" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "گھڑی لاؤ۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے دل میں کہا۔ اس کی اداکاری بڑی مؤثر ہے۔ "میں کہہ رہا ہوں، سیدھی طرح گھڑی میرے حوالے کر دو ورنہ تم زبردست مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔" میرا غصہ بڑھ رہا تھا۔

وہ خاموشی سے میری صورت تک رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں اور سنہرے بال دریائے نیل کی مرطوب ہواؤں سے بکھر رہے تھے۔ آسمان پر چاند بھی چمک رہا تھا اور اس کی پھیکی چاندنی اس کے چہرے پر پڑ کر اسے کچھ اور زیادہ معصوم ظاہر کر رہی تھی مگر میں اب اُس کے حسن کے فریب میں نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ "میں تم سے گھڑی لے کر رہوں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے تم پر جبر کرنا پڑے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم اگر اپنا حسین چہرہ داغدار بنانا

عرب کے کسی شیخ کے پاس عمدہ نسل کا ایک برق رفتار گھوڑا تھا۔ لوگ اُسے منہ مانگی قیمت پر خریدنے کے لیے تیار تھے مگر شیخ نے اُن کے اشتیاق اور اصرار کے باوجود اُسے فروخت نہیں کیا۔ گھوڑے کی شہرت سن کر ایک روز عرب کا ایک نامی گرامی شہسوار شیخ کے پاس پہنچا اور اُس نے ایک خطیر رقم کے عوض گھوڑا خریدنے کی پیش کش کی اور کہا۔ ”ایسے اچھے گھوڑے کا مستحق مجھ جیسا شہسوار ہی ہو سکتا ہے۔“

شیخ نے زیرِ لب مسکرا کے کہا۔ ”بجا ہے۔ میں تمھاری شہسواری کا معترف ہوں لیکن یہ گھوڑا مجھے بے حد عزیز ہے۔ اس لیے اسے میں کسی قیمت پر نہیں بیچ سکتا۔“

شیخ نے یہ بات ایسے فیصلہ کن انداز میں کہی تھی کہ شہسوار کی آنکھوں سے مایوسی جھلکنے لگی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اچھا شیخ میں چلتا ہوں مگر ایک بات یاد رکھنا مجھے جو چیز پسند آجاتی ہے، میں اسے حاصل کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔“

کچھ دنوں بعد شیخ یہ واقعہ بھول گیا۔ ایک روز وہ اپنے گھوڑے پر سوار کسی جنگل میں جا رہا تھا کہ راستے میں اس نے ایک کمزور اور بیمار آدمی کو دیکھا جو منزل تک پہنچنے کے لیے سواری کا محتاج معلوم ہوتا تھا۔ شیخ کو اس پر ترس آگیا۔ اس نے خود اتر کے اس بیمار شخص کو گھوڑے پر بٹھا دیا۔ وہ شخص گھوڑے پر بیٹھتے ہی تندرست اور توانا نظر آنے لگا۔ شیخ نے حیرت سے اُسے دیکھا اور ایک دم چونک گیا کیونکہ یہ وہی شہسوار تھا جو اس کا گھوڑا خریدنا چاہتا تھا۔ شہسوار نے زہرخند کے ساتھ شیخ سے کہا۔ ”شیخ گھوڑے کی باگ اب میرے ہاتھ میں ہے۔ انگلی کی ایک جنبش کے ساتھ یہ ہوا سے باتیں کرنے لگے گا اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔ پھر منزل تک پہنچنے کے لیے تمھیں کسی اور کی مدد درکار ہوگی۔“

یہ کہہ کے شہسوار روانہ ہونے ہی والا تھا کہ شیخ نے کہا۔ ”ذرا ٹھیرو! ایک بات سنتے جاؤ! میری التجا ہے کہ اگر لوگ تم سے اس گھوڑے کے حصول کی بابت دریافت کریں تو ان سے کہنا کہ شیخ نے یہ مجھے تحفتہً دیا ہے کیونکہ اگر تم نے یہ کہا کہ میں نے شیخ کو بیوقوف بنا کے یہ گھوڑا حاصل کیا ہے تو لوگ ضرورت مندوں پر بھروسا کرنا چھوڑ دیں گے اور کوئی کسی کی مدد کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔“

شہسوار پر اس بات کا بہت اثر ہوا۔ اس نے فوراً گھوڑے سے اُتر کے شیخ سے معافی مانگی اور اس کی باگ شیخ کے ہاتھ میں تھما دی۔

نہیں چاہتیں تو گھڑی چپ چاپ میرے حوالے کر دو۔“

لڑکی اب خوفزدہ معلوم ہو رہی تھی پہلے اس نے مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ پھر میری فولادی گرفت دیکھ کے یکلخت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس نے اپنا پرس کھولا اور بڑی بے دلی سے رسٹ واچ میری گود کی طرف اچھال دی۔ میں نے گھڑی درمیان ہی میں اس طرح پکڑ لی جیسے کوئی کھلاڑی گیند کیچ کرتا ہے۔ پھر میں نے حفاظت سے اسے اپنی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

”باہر نکلو۔“ میں نے لڑکی کو گھورتے ہوئے کار کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکی دروازہ کھول کے آہستہ آہستہ نیچے اتری اور سڑک پر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس پر نفرت سے نگاہ ڈالتے ہوئے کار اسٹارٹ کی اور لوٹ کر اسی طرف چل دیا جہاں سے آیا تھا۔ میں نے آخری بار عقبی شیشے میں دیکھا۔ لڑکی اسی جگہ ساکت و صامت کھڑی میری گاڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں سوچ رہا تھا، اُس نے سوچا ہوگا کہ میں واقعی کوئی نووارد سیاح ہوں اور اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ لوگ صحیح کہتے ہیں کہ کسی کی شکل و صورت دیکھ کر کبھی کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے، کون تصور کر سکتا تھا کہ ایسی دلکش لڑکی، اتنی شریف اور معصوم نظر آنے والی لڑکی چور بھی ہو سکتی ہے؟ اب کوئی کس پر اعتبار کرے؟ میں نے پھر بھی اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا، کوئی اور ہوتا تو اسے پولیس کے حوالے کیے بغیر نہ چھوڑتا۔ اب اسے زیادہ سے زیادہ چند میل پیدل چل کر شہر آنا پڑے گا۔ یا ممکن ہے کوئی لفٹ دے دے۔ یہ اُس کے جرم کی کم سے کم سزا ہے۔ ورنہ چوری کے جرم میں لوگ مہینوں، برسوں جیل میں سڑتے ہیں۔ خیر، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ بیوی کی قیمتی ڈائمنڈ رسٹ واچ تو محفوظ رہی۔ میں نے اسے جیب سے نکال کر دیکھا اور اس کا چمکدار ڈائل دیکھ کر ایک طرح کا اطمینان محسوس کیا۔ ڈائمنڈ رسٹ واچ میری بیوی کو اس کے والد نے تحفے میں دی تھی۔ اسی لیے وہ اسے بہت عزیز تھی۔ بظاہر اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آ رہی تھی مگر میں نے تہیہ کر لیا کہ کل خواہ کچھ ہو جائے، میں اسے سلیمان پاشا کی دکان پر ضرور لے جاؤں گا۔

مگر جب میں گھر پہنچا تو آپ جانتے ہیں کہ سب سے پہلے میں نے کیا دیکھا؟ برآمدے میں میز کرسی اسی طرح پڑی تھیں اور وھسکی کا نصف بھرا ہوا گلاس بھی اسی طرح رکھا تھا اور گلاس کے پاس ہی وہ چیز رکھی تھی جسے میں گھبراہٹ، عجلت اور پریشانی میں وہیں بھول گیا تھا۔ یعنی ایک اور ڈائمنڈ رسٹ واچ۔



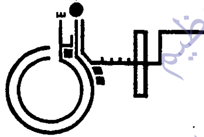
اپنی مدافعت کے نقطۂ نظر سے ملر کا مقدمہ بے حد کمزور اور بے جان تھا۔ ملر ایک معزز اور کامیاب تاجر تھا۔ اچانک گولیاں چلنے کی آواز سُن کر جب چند ملازم کمرے میں داخل ہوئے تھے تو انھوں نے ملر اور مقتول کو ایک ساتھ وہاں دیکھا تھا۔ مقتول شخص ملر کا کاروباری حصّے دار تھا۔ گولیاں چلنے سے پہلے کمپنی کے چند ملازمین نے دونوں حصّے داروں کے درمیان گرما گرم بحث کی آوازیں سنی تھیں۔ وہ بحث کے الفاظ تو نہیں سمجھ سکے تھے لیکن یہ امر انھیں یقینی محسوس ہوا تھا کہ دونوں حصّے دار شدید غصّے کے عالم میں ہیں۔ ان دونوں میں زبردست جھگڑا ہو رہا تھا۔ پھر جب گولیوں کی اطّلاع ملنے پر پہلا پولیس افسر کمرے میں داخل ہوا تھا تو ملر کے منھ سے نکلنے والے جملے ہی اُس کے خلاف ثبوت بن گئے تھے۔ ”میں اُس کا قاتل ہوں، میں نے اسے قتل کیا ہے۔“ اُس نے خلا میں گھورتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا تھا اور جس ریوالور سے اُس نے اپنے حصّے دار پر گولیاں چلائی تھیں وہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ پولیس افسر نے فوراً وہ ریوالور اس سے لے لیا تھا۔ ملر نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ ”یہ محض ایک حادثہ تھا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، میں اُس کا قاتل ہوں۔“ وہ بڑبڑا رہا تھا۔

ملر نے خود اپنا کیس تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن اس نے ایک عقل مندی ضرور کی تھی۔ وہ یہ کہ اپنی مدافعت کے لیے اس نے جس وکیل کی خدمات حاصل کیں، اس کا نام برٹن تھا۔ برٹن نہ صرف ایک جہاں دیدہ اور تجربہ کار آدمی تھا بلکہ ذہین اور چالاک بھی تھا۔ ”تمھیں مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ملر!“ برٹن نے اس سے کہا۔ وہ دونوں حوالات میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ”یہ تم نے اچھا کیا کہ پولیس کو بیان دینے سے پہلے مجھ سے رابطہ قائم کر لیا۔ ایک بات کا چرچا تمھیں اب بھی بچا سکتا ہے میرے

قتل کے ایک مقدمے کی رُوداد، جس میں ایک اندھی دلیل پیش کی گئی

مختصر مختصر کہانیوں میں چوتھی

مورس ہرش مین ✤ ڈاکٹر مقبول حسین





دوست! جیوری کے ارکان بھی ہم جیسے انسان ہوتے ہیں اور ہماری ہی طرح وہ بھی اسکینڈل پسند کرتے ہیں۔"

"اسکینڈل؟" ملر نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں اسکینڈل۔" برٹن نے مضبوط لہجے میں دہرایا۔

"لیکن اس واقعے میں تو کوئی اسکینڈل نہیں ہے۔" ملر نے کہا۔ "یہ ایک خالص کاروباری معاملہ تھا۔ میرا حصّے دار غیر قانونی طور پر کمپنی کا پیسہ اپنے تصرّف میں لا رہا تھا۔ اُس روز اُس سے میرا اسی بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ میں نے غصّے میں ریوالور نکال لیا تھا اور اسے دھمکی دی تھی کہ وہ غبن کا اقرار کرلے اور اب تک جتنی رقم نکال چکا ہے وہ واپس کردے۔ میں اسے گولی مارنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا صرف دھمکا رہا تھا۔"

برٹن نے ملر کا یہ بیان مکمل طور پر نظر انداز کر دیا اور کہا۔ "سنو ملر! یہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ تم شادی شدہ ہو۔"

"ہاں ہاں۔" ملر نے جلدی سے کہا۔ "اور تم میری بیوی میرلن کو جانتے ہو۔ تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اسے خاندان کی اور اپنی نیک نامی کا کس قدر خیال رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے کے بعد وہ مجھ سے علیحدہ ہو جائے گی۔ وہ اپنے نام کے ساتھ میرا یعنی ایک قاتل کا نام لگانا کبھی گوارا نہیں کرے گی۔"

"ٹھیک ہے لیکن اب تک تو تم دونوں ساتھ رہتے آئے ہو۔" ملر نے اثبات میں سر ہلایا۔ برٹن نے کہا۔ "بس تو ٹھیک ہے۔ دُنیا کا ایک سب سے قدیم اور غیر تحریری قانون تمھاری مدد کے لیے موجود ہے۔ اب تم اخباری نمایندوں اور پولیس کو یہ بیان دو گے کہ تمھاری بیوی اور مقتول کے درمیان ناجائز تعلقات استوار تھے اور تم نے اسی وجہ سے مشتعل ہو کر بے ارادہ اسے گولی ماردی۔"

"برٹن! برٹن! تم ذرا ہوش کی باتیں کرو۔ میرے حصّے دار کی عمر ستّر سال تھی۔ وہ ایک آنکھ سے تقریباً اندھا تھا اور چلنے کے لیے اسے چھڑی کے سہارے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ میری بیوی کی اُس سے صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔"

"تو کیا ہوا؟ دُنیا کا سب سے قدیم غیر تحریری قانون اب بھی پہلے کی طرح موثر ہے اور یہ قانون تحریری قانون پر ہمیشہ فتح حاصل کرتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس بار وہ شکست کھا جائے۔"

"لیکن برٹن تم میری بیوی کے غصّے سے واقف نہیں ہو۔ خاص طور پر جب اس کی پاک دامنی کا معاملہ ہوگا تو وہ کیا کچھ نہیں کرڈالے گی؟ وہ اپنی معمولی سی توہین بھی کبھی برداشت نہیں کرتی ہے۔ اتنے بڑے جھوٹے الزام پر تو وہ مجھے زندہ دفن کردے گی۔ اگر اس بنیاد پر ہم نے کوئی عمارت کھڑی کی تو وہ یقیناً گر جائے گی۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو ملر! سچّائی کا میرے اور تمھارے سوا کسی کو علم نہیں ہے۔ تمھاری بیوی انکار کرتی ہے تو کرے، اس کے سچّے بیان پر کوئی یقین نہیں کرے گا، کیا سمجھے؟"

ملر اس دروغ گوئی کے سخت خلاف تھا لیکن اس نے کیا وہی جس کی ہدایت اس کے وکیل نے کی تھی۔ دوسرے روز اس نے اخباری نمایندوں کے سامنے یہی کہانی دہراتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی بیوی سے آج بھی شدید محبّت کرتا ہوں۔" اُس کی آواز بھرّائی ہوئی تھی جس کی اس نے کئی گھنٹے مشق کی تھی۔ "اس کی بے وفائی سے مجھے بڑا صدمہ پہنچا ہے لیکن میں آج بھی اسے معاف کرنے اور واپس لینے کے لیے تیاّر ہوں۔ بس وہ ایک بار مجھے اپنی پیاری صورت دکھادے۔"

اخباری نمایندے اس کے افسردہ اور غمگین چہرے کی تصویریں کھینچ کر چلے گئے اور اخبارات میں اس کا بیان شائع ہونے کے فوراً بعد اسے اپنی بیوی کی پیاری صورت دیکھنے کا موقع مل گیا لیکن اس کی بیوی اس سے معاف کرنے اور واپس لینے کی درخواست کرنے نہیں آئی تھی۔ اس ملاقات کا مقصد کچھ اور تھا۔ "تمھیں اپنے بیان کی تردید کرنی پڑے گی ملر!" میرلن نے چیختے ہوئے حکم دیا۔ اس کے جسمانی خدوخال پانی کے جہاز سے ملتے جلتے تھے اور اس کی پاٹ دار آواز غصّے کی حالت میں خاصی موٹی دیوار میں بھی شگاف پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

"خدا کے لیے میرلن! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔" ملر نے کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "میں محض اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔" میرلن نے چلّاتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی نیک نامی کی قیمت پر تمھیں اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔ اگر تم نے فوراً اپنے بیان کی تردید نہ کی تو یاد رکھو تمھیں پچھتانا پڑے گا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں میرلن! مقدمے کے بعد میں اس کی تردید...."

"نہیں مقدمے کے بعد نہیں بلکہ ابھی اسی وقت، میں مقدمہ ختم ہونے تک انتظار نہیں کرسکتی۔"

"مجھے افسوس ہے میرلن! میں فی الحال...."

"تم پچھتاؤ گے، بہت پچھتاؤ گے۔ ابھی موقع ہے، میری عزّت سے نہ کھیلو۔"

لیکن ملر کو اپنی جان اپنی بیوی کی عزّت سے زیادہ عزیز تھی۔ ملر سے ملاقات کے فوراً بعد میرلن نے ایک پریس کانفرنس طلب کی اور اپنے شوہر کے جھوٹے بیان کی پُرزور لفظوں میں تردید کردی اور کہا، اس کی دُعا ہے کہ اگر اس کے شوہر کو بجلی کی کرسی نصیب نہ ہو تو کم از کم عمر قید کی سزا ضرور ملے۔ میرلن کے نفرت بھرے لہجے نے اخباری نمایندوں پر اُلٹا اثر کیا۔ پہلے انھیں صرف شک تھا کہ اس نے شوہر سے بے وفائی کی ہوگی لیکن اب انھیں ملر کے اس بیان میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ اس کی بیوی کے مقتول کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔

مقدمے کی روداد بیان کرنا فضول ہوگا کیونکہ ہر اخبار پڑھنے والا

مقدمے کی تفصیلات سے بخوبی واقف ہے۔ ملر کے بھرّائے ہوئے لہجے' اس کی بے مثال محبّت، اس کے بعد اس کی بیوی کا تردیدی بیان اور نفرت بھرا لہجہ' ان سب باتوں نے ملر کے وکیل برٹن کی بڑی مدد کی اور مقدمے کی کارروائی ختم ہونے کے بعد جیوری کے ارکان کو متفقہ فیصلے پر پہنچنے میں صرف بارہ منٹ لگے اور انھوں نے ملر کو قتل کے الزام سے بری کر دیا۔

عدالت سے باہر نکلتے ہی ملر کو اس کے خیرخواہوں، دوستوں اور تماشائیوں نے گھیر لیا۔ وہ سب اسے مبارک باد دے رہے تھے اور گرم جوشی سے مصافحے کر رہے تھے۔ ملر ہاتھ ملاتا، مسکراتا، ہجوم چیرتا نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا وکیل برٹن کچھ فاصلے سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے نزدیک اپنے مؤکل کا طرزِ عمل اطمینان بخش تھا۔ اس کی آنکھوں سے اطمینان ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے خود کو ہجوم سے بچا رکھا تھا اور آہستہ آہستہ ملر کے ساتھ ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سیڑھیوں کے قریب پہنچتے ہی کسی اخباری نمایندے نے ملر سے سوال کیا کہ کیا وہ اخبارات کے لیے کوئی پیغام دینا چاہتا ہے؟ کیونکہ اس کی بیوی نے اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس پر ملر نے اخباری نمایندے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے بری ہونے پر سب کا شکر گزار ہوں۔ اب یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ میری کہانی کا ایک ایک لفظ سچّائی اور حقیقت کا مظہر تھا۔"

اچانک ہجوم میں زبردست کھلبلی پیدا ہوئی۔ کسی کے چنگھاڑنے کی آواز سنائی دی۔ اسی وقت ملر کی بیوی مجمع ہٹاتی ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اپنے شوہر پر جھپٹی۔ بیوی پر نظر پڑتے ہی ملر کا چہرہ زرد ہو گیا۔ وہ حملے سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹا، ٹھوکر کھائی، لڑکھڑایا اور سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا فٹ پاتھ پر جا گرا۔ دس منٹ بعد ایک ڈاکٹر نے طبّی معائنے کے بعد اس کی موت کی تصدیق کر دی۔ ڈاکٹر کے اعلان نے ہجوم پر سکتہ طاری کر دیا۔

"لیکن۔ لیکن یہ محض ایک حادثہ تھا" میرلن نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے دھکّا تو نہیں دیا تھا..... میں ....."

"کیا واقعی یہ ایک حادثہ تھا؟" ہجوم میں سے کسی نے طنزاً پوچھا۔ "اس واقعے کے کئی درجن گواہ موجود ہیں خاتون! آپ کس کس کو جھٹلائیں گی؟"

میرلن پر ان جملوں کا حیرت انگیز ردِ عمل ہوا۔ وہ چند لمحے سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہی، پھر جب اس نے سر اٹھایا تو اس کے سخت چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے۔ اس نے مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، پھر اپنے شوہر کی لاش دیکھی۔ "یہ صحیح ہے کہ میں اپنے شوہر سے بے وفائی کر رہی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک مرد سے سچّی محبّت کی تھی۔ اسے بھی اس نے قتل کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے مار دیا۔ یہ ایک حادثہ تھا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، میں اس کی قاتلہ ہوں۔"



فرض کیجیے میر جمشید عالم کی جگہ آپ ہوتے

سب رنگ کا ایک نیا پُراسرار سلسلہ

آپ بیتی * میر جمشید عالم

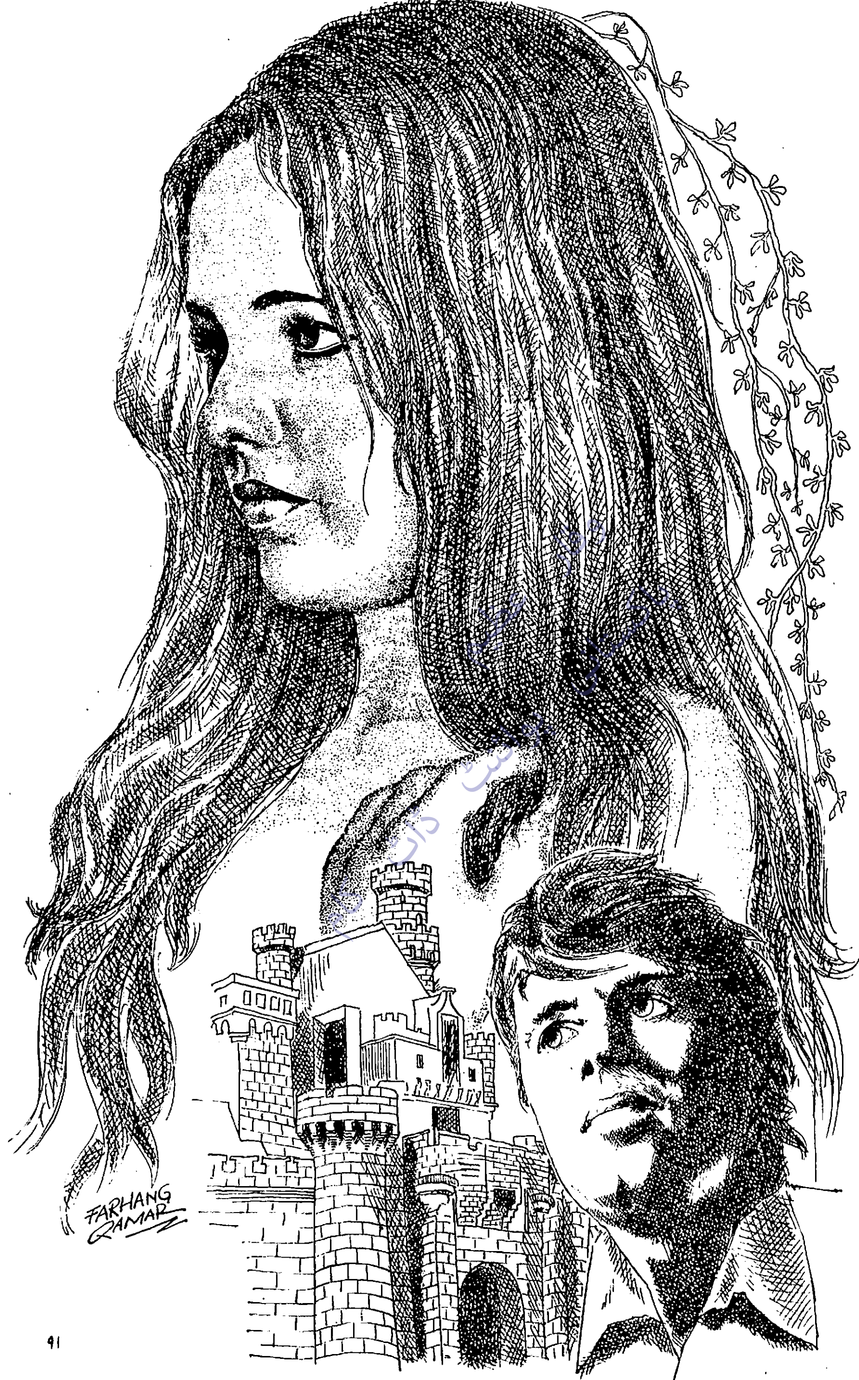
ایک رات مجھ پر پھر وہی دورہ پڑا۔ ہاتھ پاؤں اینٹھ گئے۔ دماغ بوجھل ہوگیا۔ سینے میں جلن ہونے لگی۔ میں اپنے بستر پر موت و زیست کی کشمکش میں پڑا رہا اور میرے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ میں نے اس عالم میں جو کچھ دیکھا وہ میں کسی کو بتانے سے بھی قاصر تھا کیونکہ اس سے پہلے دو بار مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوئی تھی اور جب میں نے اپنے مشاہدات گھر میں بیان کیے تھے تو انھیں ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کے نظرانداز کر دیا گیا تھا مگر جب اس خواب نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ دادی اور چچا خواب کے مطابق ایک ہول ناک حادثے کی نذر ہو گئے تو گھر والوں کو ہوش آیا بہرحال اس بار میں نے کسی سے ایک لفظ کہنے کی جرأت نہیں کی اور اپنے اندر کڑھتا اور دعا کرتا رہا کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے، کاش وہ پہلے کی طرح حقیقت ثابت ہونے کے بجائے میرا وہم ثابت ہو۔

میرے والد سرکاری ملازم تھے۔ آمدنی زیادہ نہیں تھی مگر عزت سے دن گزر رہے تھے۔ والدہ نمازی پرہیزگار خاتون تھیں۔ بڑا بھائی سکندر پڑھ رہا تھا اور میری بہن یاسمن والدہ سے گھریلو تربیت حاصل کر رہی تھی۔ حالات اچھے نہ سہی مگر برے بھی نہیں تھے۔ اپنی ذہنی اور روحانی اُلجھنوں کے باوجود میں نے کسی نہ کسی طرح میٹرک پاس کر لیا تھا لیکن میٹرک پاس کرنے سے مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی کیونکہ والد صاحب نے اچانک مجھے فوج میں بھیجنے کا اعلان کر دیا۔ مجھے فوجی زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں تھا مگر جانا پڑا۔ وہاں جسمانی اعتبار سے مجھے کامیاب قرار دے دیا گیا۔ یہ میری تندرستی، بلند قامتی اور وجاہت کا قصور تھا۔ ممکن ہے، مجھے خود سے مفاہمت کرنی پڑتی کہ خوش قسمتی سے میں تحریری امتحان میں فیل ہوگیا۔ والد صاحب سخت برہم ہوئے۔ انھی دنوں یاسمن کے پیام آنے شروع ہوئے۔ لڑکا ڈاکٹر ارشد، یاسمن کے لیے موزوں اور والد صاحب کے معیار کے مطابق تھا۔ رشتہ خوشی سے منظور کر لیا گیا مگر اس منظوری نے میری وحشتوں میں اضافہ کر دیا۔ مجھے رہ رہ کے اپنا دہشت ناک خواب یاد آتا تھا۔ میں نے بساط بھر اس رشتے کی شدید مخالفت کی مگر کسی نے کان نہ دھرے۔ میں خاموش ہوگیا۔ گھر کے در و دیوار کاٹ کھانے کو دوڑتے تھے۔ آخر دل برداشتہ ہو کے میں نے اپنے شہر، اپنے گھر کو خیرباد کہا اور والدہ کی چھپا کلی چرا کے کلکتے آگیا۔ کلکتہ آدمیوں کا جنگل تھا۔ میں اس جنگل کی خاک چھانتا رہا لیکن کسی شاخ پر مجھے دم لینے کی جگہ نہ ملی۔ دن بھر ٹھوکریں کھاتا اور رات کو بھوکا پیاسا کہیں پڑ رہتا۔ آخر دھیرے دھیرے ایک خستہ حال شخص جارج سے میری ملاقات ہوگئی۔ وہ زمانے کا ٹھکرایا ہوا تھا مگر اب زمانے کو اپنی ٹھوکروں پر رکھتا تھا۔ اس کی اپنائیت نے گھر کی یاد میرے دل سے محو کر دی۔ ہم دونوں ایک ساتھ محنت مزدوری کرتے، ایک ساتھ گھومتے اور ساتھ سوتے۔ دو دیوانے مل گئے تھے۔ جارج ایک مرنجاں مرنج آدمی تھا۔ کرسمس کی شام وہ مجھے ضد کر کے ایک شراب خانے لے گیا۔ وہاں اُس کے پیہم اصرار پر مجھے بھی زہر کے چند گھونٹ حلق سے اُتارنے پڑے۔ پھر شراب کا نشہ دوبالا کرنے کے لیے ہم شباب کدے گئے۔ یہ ایک معیاری نائکہ ننّو بیگم کا بالاخانہ تھا۔ یہاں ایک حسین، نوخیز اور لچکیلی دوشیزہ بانو نغمہ و رقص کا جادو جگا رہی تھی۔ میں ہوش کھو بیٹھا۔ بانو نے بھی مجھ پر کم سے کم اتنی توجہ ضرور صرف کی کہ جب ہم وہاں سے لوٹے تو میری جھولی میں اُس کے تصوّر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پھر تو یہ عالم ہوگیا کہ میں ہفتے بھر خون پسینہ ایک کر کے کماتا، پیٹ کاٹ کے پیسے جوڑتا اور جارج کے سمجھانے کے باوجود بانو کے ہاں پہنچ جاتا۔ رفتہ رفتہ بانو میرے قریب آتی گئی۔ ننّو بیگم کو یہ قربت کھٹکتی تھی مگر پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے اس لیے کام چل رہا تھا اور وقت بہت اچھا گزر رہا تھا۔ انھی دنوں الٰہ آباد سے میرے ایک دوست یاور نے مجھے مطّلع کیا کہ یاسمن کی شادی ہونے والی ہے۔ میں لرز کے رہ گیا۔ میں نے امّاں کی چھپا کلی گروی رکھی، بانو اور جارج سے رخصت چاہی اور پہلی گاڑی سے الٰہ آباد آگیا۔ گھر پہنچا تو حسبِ توقع سرد مہری سے میرا استقبال کیا گیا البتہ یاسمن میرے سینے سے چمٹ گئی۔ شادی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں پھر بھی میں نے التوا کے لیے اپنی اوقات سے بڑھ کے ہاتھ پاؤں مارے لیکن میں اُن کا تھا کون جو وہ میری بات سُن لیتے؟ یاسمن ڈاکٹر ارشد کے ساتھ وداع کر دی گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ڈولی کے بجائے جنازہ اُٹھ گیا ہو۔ چند روز تک حالات خوش گوار رہے اور میرے خدشات کا منہ چڑاتے رہے لیکن جلد ہی ایک دن ڈاکٹر ارشد سراسیمگی کے عالم میں علی الصّباح ہمارے گھر آیا۔ خلافِ توقّع اُس نے گستاخی اور بے ادبی کے ساتھ والد صاحب سے پوچھا کہ یہ کیچو کون ہے اور یاسمن سے اس کا کیا تعلّق ہے؟ کیچو کا نام سُن کے والد صاحب بھڑک اُٹھے اور داماد کو سخت سست کہنے لگے۔ ڈاکٹر ارشد طلاق کی دھمکی دے کے پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ والد صاحب بھی اپنا ریوالور لے کے اُس کے پیچھے پیچھے گھر سے چلے گئے۔ کیچو کا نام میرے لیے بھی ایک معمّا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ چند منٹ بعد میں بھی بھاگم بھاگ ڈاکٹر ارشد کے گھر پہنچا۔ وہاں قیامتِ صغرا میری منتظر تھی۔ والد صاحب ریوالور سے ڈاکٹر ارشد کو ٹھنڈا کر کے خود بھی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے تھے اور اندر خوب صورت یاسمن ایک ڈراؤنی لاش کی صورت میں چھت سے جھول رہی تھی۔ میں بے ہوش ہو کے گر پڑا۔ پھر جب مجھے ہوش آیا تو دن گزر چکے تھے۔ میں اسپتال میں تھا اور میرے شفیق پڑوسی مولوی عبدالحکیم حسرت و یاس کا مجسّمہ بنے میرے سرھانے بیٹھے تھے۔ اُن کی بھرّائی ہوئی آواز نے مجھے یہ مژدہ سُنایا کہ اب میں تمام علائق سے آزاد ہو چکا ہوں۔ میری پرہیزگار ماں ان پے در پے صدمات سے جاں بر نہ ہو سکی تھی اور بڑا بھائی سکندر پاگل ہو کے گھر سے نکل گیا تھا۔ صرف ایک بھائیں بھائیں کرتا ہوا گھر اُن کی یادگار رہ گیا تھا۔ میں در و دیوار سے لپٹ کے رونے کے لیے گھر آگیا۔

میں نے جو تیسرا خواب دیکھا تھا وہ یاسمن سے ہی متعلّق تھا اُسی لیے میں اس شادی کا شدید مخالف تھا۔ میری بات کسی نے نہیں مانی اور سارا گھر برباد ہوگیا۔ چند روز بعد مرزاپور سے میرا چچازاد بھائی بختیار آیا اور اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ چچا جان ایک خوش حال آدمی تھے۔ بچپن میں ان کی لڑکی غزالہ سے میری بات پکّی ہو چکی تھی۔ یہاں آکے ایک بار پھر مجھے اپنوں میں رہنے کا موقع ملا اور میں نے غزالہ کی شہ پہ گرتے پڑتے بی اے کر لیا۔ میں نے امّاں کے زیور اور جائداد کے کاغذات وغیرہ چچا جان کے پاس رکھوا دیے تھے کیونکہ ان کے سوا میرا سرپرست کون تھا؟ ایک روز چچا جان نے باتوں باتوں میں بڑی اپنائیت کے ساتھ یہ انکشاف کیا کہ والد صاحب کے ذمّے اُن کا کچھ قرض باقی ہے اس لیے الٰہ آباد کا مکان بیچ دیا جائے۔ مجھے یہ بات کسی طور منظور نہیں تھی مگر اب الٰہ آباد کا گھر میرے کس

ایک نوجوان کی زندگی کے عبرت انگیز واقعات

سب رنگ کے پُراسرار سلسلے موضوع، دل کشی اور تاثر کے اعتبار سے سب سے منفرد ہوتے ہیں


FARHANG
QAMAR

کام کا تھا؟ اعزا یہاں تھے مغزالہ یہاں تھی۔ میں نے بادلِ ناخواستہ فروخت کے کاغذات پر دستخط کر دیے۔ اس کارروائی کے بعد بکلیت ان لوگوں کا رویہ بدل گیا یہاں تک کہ غزالہ کی منگنی بھی کسی اور سے کر دی گئی۔ میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔ میں نے کیا مگر اس کے صلے میں مجھے نوکروں سے دھکے دے کے نکلوا دیا گیا۔ میں نے ایک لُٹے ہوئے جواری کی طرح الٰہ آباد پہنچ کے یاسمن اور والدین کی قبروں کو بوسہ دیا۔ چار سال گزر چکے تھے لیکن سکندر کا کوئی پتہ نہ تھا۔ چند روز مولوی عبدالحکیم کے پاس گزارنے کے بعد میں شہروں دیہاتوں میں سکندر کو ڈھونڈتا ہوا دوبارہ کلکتے آگیا۔ یہاں میں نے جاسج کو تلاش کرنے کے لیے اپنی سی کوششیں کر لیں لیکن وہ نہیں ملا۔ میں نے بانو کی گلی کا طواف بھی کیا۔ بدقسمتی سے وہ بھی نظر نہیں آئی۔ جیب خالی تھی۔ کہاں جاتا؟ کیا کرتا؟ آخر ایک رات شدید مایوسی کے عالم میں میں دریائے ہگلی کے کنارے جا پہنچا۔ قریب تھا کہ میں اپنا بوجھ بھنور کی موجوں کے حوالے کر دیتا کہ اچانک ایک سایہ سا میری طرف لپکا اور کسی دلکش نسوانی آواز نے مجھے پکار کے میرے پیر زمین میں گاڑ دیے۔ وہ آواز مجھے زندگی کی ترغیب و تعلیم دے رہی تھی۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا لیکن وہاں کون تھا جو میری دادرسی کرتا؟ میں سر جھکائے ایک طرف چل پڑا۔ بے مقصد، بے منزل۔ میں ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک کار میرے پاس آکے رُکی اور ایک خوش لباس آدمی اُتر کے میرے قریب آگیا۔ یہ میرا استاد عابد شیرازی تھا جس نے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے ہمارے ہاں ٹیوشن کر لی تھی۔ پھر والد صاحب کی سفارش سے اُسے ایک بینک میں ملازمت مل گئی تھی۔ اس نے مجھ خستہ حال کو گلے لگا لیا اور میری بپتا سن کے ہمدردانہ اصرار سے مجھے اپنے گھر لے گیا۔ میری زندگی ایک بار پھر ڈھرّے پر آگئی۔ شیرازی اور اُس کی بیوی ساجدہ، دونوں میرا بے حد خیال رکھتے تھے۔ اُن کے ہاں مجھے گھر جیسا آرام تھا۔ کچھ روز سکون کی سانس لینے کے بعد میں نے جاسج کی تلاش میں پھر دوڑ دھوپ شروع کر دی اور آخر اُسے ڈھونڈ کر ہی دم لیا۔ جاسج، بقول اُس کے کنگ جاسج، بالکل نہیں بدلا تھا۔ ہم دونوں پھر ایک ساتھ گھومنے پھرنے لگے۔ جاسج کے ساتھ میں نے بانو کے ہاں جانے کا پروگرام بنایا مگر وہاں خالی ہاتھ جانا مناسب نہیں تھا۔ شیرازی بینک منیجر تھا۔ اُس کے حالات اچھے تھے لیکن میں اُس سے پیسے نہیں مانگ سکتا تھا۔ ویسے ہی اُس کے احسانات کیا کم تھے؟ اور پھر اس نے مجھے جیب خرچ کے لیے روپے بھی دیے تھے۔ میں مزید مطالبہ کس منہ سے کرتا؟ بانو سے ملنے کی تڑپ کچھ اس قدر تھی کہ میں شیرازی کے ملازم باقر کے سامنے ہاتھ پھیلا بیٹھا اور شرمندگی اُٹھانی پڑی۔ میرے دل میں اپنے محسن کے ہاں چوری کا بھی خیال آیا مگر ابھی میرا ضمیر اتنا مُردہ نہیں ہوا تھا۔ بانو بُری طرح دل و دماغ پر سوار تھی اور پیسے کی فراہمی کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ یکایک حالات نے میری مدد کی۔ یہ مدد بڑے شرم ناک انداز میں ہوئی تھی لیکن بہرحال میری مشکل حل ہو گئی۔ بدقسمتی سے ساجدہ، فیروز نامی ایک نوجوان کے ساتھ ملوث تھی۔ مجھے اس راز کا پتہ چل گیا۔ میرا منہ بند رکھنے کے لیے حسین ساجدہ نے اپنا آپ میری نذر کرنا چاہا لیکن یہ بے غیرتی میرے بس کی بات نہیں تھی۔ البتہ میں نے اُس سے روپے لینے شروع کر دیے اور میری گاڑی چلنے لگی۔ بانو اب مکمل بھول ہو چکی تھی اور میری طرح اُس نے بھی مجھے فراموش نہیں کیا تھا۔ ہمارا ربط ضبط بڑھتا رہا اور رات کی نشستوں کے علاوہ ہم دن کے وقت بھی ایک دوسرے سے راز و نیاز کرنے لگے۔ یہ سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ وہ میرے ساتھ بھاگنے پر آمادہ ہو گئی۔ ہم نے موقع و محل کی مناسبت سے فرار کا ایک جامع منصوبہ بنایا اور میں طے شدہ پروگرام کے تحت ایک روز اُسے لینے کے لیے بالاخانے پہنچ گیا۔ بنّو بیگم باہر گئی ہوئی تھی۔ صرف ایک بڑی بی وہاں موجود تھیں جنھیں بانو نے افیون کھلا کے مدہوش کر دیا تھا۔ بانو برقع پہنے، زیورات اور نقدی کی پوٹلی سنبھالے میری منتظر بیٹھی تھی۔ میں نے بے تابانہ اُسے سینے سے لگایا پھر ہم دونوں احتیاط سے دروازے کی طرف بڑھے۔ جاسج نیچے ٹیکسی لیے تیار کھڑا تھا۔ سب انتظام مکمل تھا لیکن قسمت کچھ اور چاہتی تھی۔ ہم جیسے ہی آگے بڑھے، اچانک دروازہ کھلا اور بنّو بیگم ہانپتی کانپتی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا لحیم شحیم سازندہ بجتا ور بھی اُس کے ساتھ تھا۔ انھوں نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو سخت مشتعل ہوئے۔ بجتا ور مرنے مارنے پر تُل گیا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ ہاتھ رنگے بغیر بانو کو اس جہنم سے نکال لے جاؤں لیکن ایسی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ ناچار مجھے بجتا ور کا چاقو اُسی کے اور بنّو بیگم کے سینے میں اُتارنا پڑا۔ بانو نے حواس باختگی سے مجھے مشورہ دیا کہ اتنا بھیانک واقعہ ہو چکا ہے اس لیے اب میرا تنہا بھاگنا ہی مناسب ہوگا۔ بات معقول تھی۔ میں نے اُسے مصلحتاً ایک کمرے میں قید کر دیا اور جاسج کے ساتھ راستے میں ٹیکسی بدل کے ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ جاسج نے میری ہمت بندھائی اور اشک باری سے مجھے گاڑی میں بٹھا دیا اور اس طرح میں کلکتے سے بمبئی آگیا۔ بمبئی بڑا قاتل شہر ہے۔ یہاں مجھے ناگفتہ بہ مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ شب و روز بڑی مشکل سے کٹ رہے تھے کہ ایک روز ایک نوجوان خانہ بدوش بھکارن ڈالی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور اپنے ننھے بچّے کے ساتھ مجھے بھی اپنی جھونپڑی میں رکھ لیا۔ میری آمد سے پہلے کچھ مرد اُس کے پاس آیا کرتے تھے لیکن اب یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تھا مگر کب تک منقطع رہتا؟ انھوں نے ڈالی کو پھر پریشان کرنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف مجھے بھی دُہرے قتل کے الزام میں گرفتاری کا دھڑکا لگا رہتا تھا لہٰذا ہم دونوں، بچّے کے ساتھ بمبئی سے ہجرت کر کے ریاست راجے پور آگئے۔ ڈالی کی جوانی اور خوب صورتی کام آئی۔ یہاں ہمیں ایک بڑے رئیس کنور پرکاش چندر کے محل میں گھریلو ملازم رکھ لیا گیا۔ محل کا ماحول نوابین و رؤسا کے شایانِ شان تھا۔ کنور صاحب مہاراج کہلاتے تھے، اُن کے بیٹے راج کمار کہلاتے تھے اور بیٹیاں راج کماری تھیں۔ الف سے یے تک قریب قریب سبھی رنگے ہوئے تھے۔ بیگمات، مردوں سے دو قدم آگے تھیں اور نوجوان نوکروں پر خاص توجّہ فرماتی تھیں البتہ مہاراج کی سب سے خوب صورت لڑکی شاردا کسی اور ماحول کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ ذوق کے ساتھ ساتھ اُس کا کردار بھی نفیس تھا۔ میں ویسے تو سب کی جی حضوری پر مجبور تھا لیکن خصوصاً شاردا کی خدمت بجا لا کے مجھے دلی خوشی ہوتی تھی۔ محل بھر میں میری تابع داری کے چرچے تھے۔ بڑے راج کمار مہیش چندر نے یہ چرچے سُنے تو مجھے اپنے لیے وقف فرما لیا۔ شاردا سے دُوری جان لیوا تھی مگر ایک غلام کر بھی کیا سکتا ہے؟ مہیش چندر کے مشاغل بڑے متضاد تھے۔ ایک طرف وہ نئی نئی رنگ برنگی تتلیوں کا رسیا تھا، دوسری طرف پنڈتوں اور پجاریوں کا عقیدت مند۔ ایک روز اُس کے کمرے میں کوئی سادھو آیا ہوا تھا اور نوکروں کو باری باری اندر طلب کیا جا رہا تھا۔ میں بھی اپنی باری آنے پر پیش ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی سادھو کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور اُس نے ہاتھ اُٹھا کے نہ معلوم کیا اشارہ کیا؟ میں باہر آگیا۔ اس واقعے کے بعد راج کمار کی مہربانیاں مجھ پر بہت بڑھ گئیں۔ وہ مجھے اپنے قریب رکھنے لگا جیسے میں کوئی بہت اہم آدمی ہوں۔

کنور مہیش چندر میرا بہت زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔ اُس کے حکم سے مجھے ایک بڑا کوارٹر دے دیا گیا۔ ڈالی اس ترقی پر بہت خوش تھی۔ مجھ پر کنور کا التفات دیکھ کے اس کے ملازم بھی مجھ سے مرعوب ہو گئے تھے خصوصاً اُس کے منہ چڑھے ڈرائیور اجیت نے مجھ سے باقاعدہ دوستی کر لی تھی۔ ایک رات کنور کسی نیم برہنہ انگریز حسینہ کے ساتھ دادِ عیش دے رہا تھا۔ اس نے اُسی عالم میں مجھے طلب کر لیا۔ حسینہ نے مجھے دیکھ کر انگریزی میں کنور سے میرے متعلق پسندیدگی کا اظہار کیا۔ کنور بگڑ گیا مگر اُس نے میری حوصلہ شکنی نہیں کی۔ بہرحال یہ انکشاف کر کے مجھے بُری طرح دہلا دیا کہ اُسے میرے ماضی کا علم ہے اور وہ یہ بات جانتا ہے کہ میرے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ اب میں پوری طرح اُس کی مٹھی میں تھا۔ وہاں سے لوٹا تو مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ میری دانست میں کنور پر میرا ماضی اُسی سادھو نے بے نقاب کیا تھا جس کے چناؤ کے بعد مجھ پر کنور کی نوازشیں بڑھی تھیں۔ چنانچہ میں ایک روز اجیت کے ساتھ کار کی ڈکی میں چھپ کے انتہائی اضطراب کے عالم میں سادھو کے پاس جا پہنچا۔ میں دراصل یہ ٹوہ لینا چاہتا تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا کیا جانتا ہے اور میں کس حد تک اُس کی ہمدردی حاصل کر سکتا ہوں؟ وہ میرے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آیا اور اُس نے مجھے کنور کا ہر حکم بے چون و چرا ماننے کی تلقین کی اور کہا کہ اسی میں تیری بھلائی ہے۔ میں نے سر جھکا دیا۔ کنور مجھ پر ہر طرح مہربان تھا مگر وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگوں کو میرے ساتھ اُس کی مہربانیوں کا پتہ چلے اس لیے اُس نے مجھے مستقلاً شاردا کی خدمت پر مامور کر دیا۔ شاردا روز بہ روز میرے قریب آتی جا رہی تھی اور بڑی حد تک مجھے سمجھ چکی تھی۔ ایک روز اُس نے اچانک مجھ سے ایک انگریزی لفظ کا مطلب پوچھ لیا۔ میں نے بے خیالی میں بتا دیا۔ اُس پر سنّاٹا چھا گیا کہ اب تک میں نے اُس سے اپنی اصلیت کیوں چھپائی تھی؟ میں بہت خفیف ہوا۔ وہ کرید کرید کے مجھ سے میرا ماضی پوچھتی رہی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ میں گریجویٹ ہوں تو وہ پھول کی طرح کھِل گئی اور پہلی بار اُس نے مجھ سے کہا کہ

میں اُسے صرف شاردا کہا کروں۔ میری خوب رُوئی اور وجاہت میرے حق میں عذاب ہوگئی تھی کیونکہ شاردا کے علاوہ اُس کی دلکش بہن شکنتلا بھی مجھ پر نظر رکھتی تھی۔ ایک رات اُس نے مجھے خلوت میں بلا کے خود کو جھکتا میری آغوش میں ڈے دیا۔ مجھے ایک وفادار کتے کی طرح اُس کے پاؤں چاٹنے پڑے اور اُس کی ہر خواہش پوری کرنی پڑی۔ مجھ سے پہلے وہ اجیت سے خفیہ رابطہ رکھتی تھی۔ مجھ سے تعلق پیدا ہوتے ہی اُس نے اجیت کو خاموشی کے ساتھ راستے سے ہٹا دیا۔ اجیت کی موت بڑی عبرت ناک ثابت ہوئی۔ ایک بار شوخ دوست مجھ سے بچھڑ گیا۔ اُس کا خلا پُر کرنے کے لیے مجھے مالتی کو اپنے قریب کرنا پڑتا۔ مالتی ایک شوخ و شنگ اور گداز بدن کی نوجوان ملازمہ تھی۔ راج کماروں اور راج کماریوں تک اُس کی رسائی تھی۔ میں نے اپنی حدت سے اُسے موم کی طرح پگھلا لیا تاکہ ضرورت پڑنے پر اُس سے کام لیا جا سکے۔ زندگی اسی ڈھب سے گزر رہی تھی کہ ایک رات کنور نے مجھے طلب کر کے انتہائی رازدارانہ گفتگو کی۔ اُسے یہ شک تھا کہ اُس کے خاص ملازم اجیت کو مہاراج نے مروایا ہے۔ چنانچہ اُس نے مجھے اعتماد میں لے کے یہ حکم دیا کہ میں مہاراج کو قتل کردوں۔ یہ لرزہ انگیز حکم سُن کے جب میں کوارٹر پہنچا تو میرے ہاتھ پاؤں اینٹھے ہوئے تھے۔

اُس روز اگر ڈالی میرے سرہانے نہ ہوتی اور اپنی دل گداز باتوں سے میری دلجوئی نہ کرتی تو شاید میرا دماغ خراب ہو جاتا۔ ڈالی کے سوا میرا اس دنیا میں کون تھا! پہلے تو اُس نے مجھ سے میری اُداسی کا سبب پوچھنا چاہا لیکن جب اُسے یہ اندازہ ہوا کہ میں اُسے کچھ بتانے سے گریز کر رہا ہوں تو وہ پھوٹ پڑی اور اُس دن میرے سامنے ڈالی کے رُوپ میں ایک ایسی عورت آئی جسے میں نے کبھی دیکھا تک نہ سوچا نہیں تھا۔ میں نے ڈالی کے درونِ خانہ جذبوں کا مطالعہ اس طرح نہیں کیا تھا۔ وہ خود اس زندگی سے تنگ تھی اور اُس کا خیال تھا کہ چند ماہ تک کچھ اور پیسے بٹور کے یہاں سے نکل بھاگیں گے۔ میں ڈالی کی رفاقت سے خوف زدہ ہوگیا کیونکہ میں اس کا جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اُس وقت میں نے ڈالی کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ سہم گئی مگر اچھی طرح جانتی تھی کہ اس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے چنانچہ اس ہولناک کام میں اُس نے مجھے اپنی معاونت کا یقین دلایا۔ اُس کی رسائی مہاراج پرکاش چند کی خلوت تک تھی۔ میں نے اُس کی مدد سے مہاراج کے محل کا نقشہ تیار کیا اور موقع کی تاک میں رہنے لگا۔ ہم نے قتل کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیا تھا۔ صرف سات دن ہمارے پاس تھے اُن دنوں شکار کھیلنے کے بہانے مہیش چندر راجے پور سے دُور جا چکا تھا۔ دُوسرے دن صبح مجھے شاردا نے طلب کر لیا۔ میں پہنچا تو وہ بہت ٹوٹی ہوئی تھی۔ میرا اور شکنتلا کا تاریک تعلق اُس پر روشن ہو چکا تھا۔ وہ پرکاش بھون میں کھیلے جانے والے ہر کھیل سے واقف تھی اور یہ بات جانتی تھی کہ میں اُس کی نظروں میں نہ سہی، پرکاش بھون کے دوسرے حاکموں کی نظر میں تو ایک نوکر ہی ہوں۔ وہ کُھل کے برس پڑی اور اُس نے پرکاش بھون کے ماحول سے شدید بیزاری کا اظہار کیا۔ وہ بھی یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اُس نے اپنے دل میں میرا ایک مجسمہ تیار کر لیا تھا جس کی وہ چپکے چپکے پُوجا کرنے لگی تھی۔ ——— وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور مہاراج پرکاش چندر کو قتل کرنے کے ہر منصوبے میں ناکامی ہو رہی تھی۔ دن بھر پرکاش چندر مصروف رہتا تھا۔ ڈالی وہاں کی مُن گُن لے کے آتی اور نتیجہ صفر رہتا۔ ہمیں ہاتھ صاف رکھ کے کام کرنا تھا۔ مہاراج کے فرعون صفت پرسنل اسسٹنٹ جیون داس کو جھکیا دینا آسان کام نہیں تھا۔ آخر ہمیں ایک تدبیر سُوجھی، ڈالی ایک رات مہاراج کی خلوت میں جا کے چپکے سے غسل خانے کے عقبی دروازے کی چٹخنی کھول آئی۔ طے یہ ہوا کہ مہاراج کی خلوت سے ڈالی کی واپسی اور کُھلے ہوئے دروازے سے میرے وہاں پہنچنے کے درمیان خاصا وقفہ ہوگا تاکہ ڈالی پر شبہ نہ کیا جائے۔ یہ ترکیب قابلِ عمل نظر آئی۔ ڈالی چٹخنی کھول کے کوارٹر میں آئی تو میں کوئی چاپ بجے گُھپ اندھیرے میں چھپتا چھپاتا مہاراج کے محل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا لیکن جب میں بجلی کا نظام منقطع کر کے اندر داخل ہوا تو شیشے کا ایک جار بدحواسی میں میرے پیر سے ٹوٹ گیا۔ فوراً دربان اندر آگیا۔ میں اتنا بدحواس ہوا کہ اُلٹے قدموں وہاں سے بھاگا اور کوارٹر میں آ کے دم لیا۔ یہ ترکیب بھی ناکام ہو چکی تھی اور اب صرف ایک رات باقی رہ گئی تھی۔ رات کو میں سکون کے لیے باغ میں چلا گیا اور ایک درخت کے نیچے لیٹ کر اپنی قسمت کو کوسنے لگا یکایک مجھے ایک سایہ سا نظر آیا۔ وہ کسی قدر فاصلے سے مجھ سے مخاطب تھا۔ میں نے دہشت سے اس پُراسرار وجود کا نام پوچھا تو اُس نے اپنا نام کیچو بتایا۔ کیچو کا نام سُن کے مجھے اپنے ماضی کے بہت سے خونیں واقعات یاد آگئے لیکن سائے نے مجھے اپنے بارے میں تفصیل جاننے کا موقع نہیں دیا۔ اُس نے مجھے تلقین کی کہ میں آرام سے گھر جا کے سو جاؤں اور پھر لمحوں میں وہ جس طرح نمودار ہوا تھا اُسی طرح غائب ہوگیا۔ میں دیکھتا رہ گیا اور اُمید و بیم کی حالت میں اپنے کوارٹر واپس آگیا۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ اس واقعے سے دو دن قبل اپنے خصوصی تعلق کی بنیاد پر جیون داس کے خلاف میں نے شکنتلا کے کان بھرے تھے اور اسی رات اُسے قتل کرانے میں کامیاب ہوگیا تھا لیکن جیون داس کی موت کے بعد مہاراج کے محل پر پہرا بڑھا دیا گیا تھا۔ اب کیچو کا سایہ مجھے آرام کا مشورہ دے رہا تھا۔ دوسری صبح ڈالی نے آ کے یہ مژدہ سُنایا کہ مہاراج کا دیہانت ہوگیا ہے۔ میں حیران رہ گیا۔ تھوڑی دیر میں پرکاش بھون پر غم و الم کے بادل چھا گئے اور مہیش شکار سے لوٹ کے اپنے باپ کی لاش پر دھاڑیں مارنے لگا۔ مہیش چندر کو حیرت ہوئی کہ میں نے مہاراج کو اس طرح کیسے قتل کر دیا کہ ڈاکٹر موت کا اصل سبب جاننے سے ناکام رہے ہیں۔ مہیش چندر نے پرکاش بھون پر قبضہ کر لیا اور مجھے طلب کر کے انعام و اکرام سے نوازا۔ جس وقت میں اُس کے پاس گیا تھا، وہاں مہاراج کی آخری حسین و جمیل بیوی پاروتی بھی بیٹھی تھی۔ اُس نے دلچسپ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ چند دن بعد میں مہیش چندر کے پاس سلامی کے لیے گیا تھا کہ میں نے سُنا "کلکتے" کا عابد شیرازی پرکاش چندر کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ اُس دُور افتادہ مقام پر عابد شیرازی کی موجودگی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہاں مجھے پاروتی مل گئی اور اُس نے فوراً مجھے اپنی خلوتِ خاص میں طلب کر لیا۔ وہاں اُس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا، وہ میرے قد و قامت اور وجیہہ شخصیت پر بے اندازہ ملتفت نظر آرہی تھی۔ اُس نے مجھے ایک ہار عطا کر کے رخصت کر دیا۔ اُسی رات ٹھاکر اور رام لال نامی دو اشخاص مجھے قتل کرنے کے لیے کوارٹر میں آئے۔ وہ مجھے آسانی سے ختم کر دیتے لیکن کیچو نے پُراسرار حالات میں خود انھیں زندگی کے عذاب سے نجات دلا دی۔ پھر باغ میں اُن کی لاشیں ملیں۔ ابھی میں سہمی ہوئی ڈالی کو عزم و ہمت کی تلقین کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈالی نے دروازہ کھولا۔ ایک پنڈت دروازے پر کھڑا تھا اور پوچھ رہا تھا "ناری! کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"



"تمھیں کس سے ملنا ہے مہاراج؟" اس سے پہلے کہ ڈالی پنڈت کے سوال کا جواب دیتی، میں نے آگے بڑھ کے کہا۔

اُس نے ایک قدم دروازے کے اندر رکھ دیا اور اپنی سُرخ انگارا آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ اس کے ہاتھ میں دَھرا ہوا کرچھا تیزی سے گردش کرنے لگا۔ ڈالی کواڑ کے ایک طرف سہم کے کھڑی ہوگئی۔ پے درپے سانحوں اور

خوں ریز واقعوں نے اس کا ذہن ماؤف کر رکھا تھا۔ گزشتہ رات بھر دو لاشیں باغ میں پائی گئی تھیں اور اب صبح ہی صبح یہ پنڈت میرے دروازے پر موجود تھا۔ پنڈت کی معنی خیز خاموشی مجھے زہر لگنے لگی، میں نے اس بار کسی قدر تلخی سے کہا "مہاراج! میرا خیال ہے تم نے غلط دروازے پر دستک دی ہے؟"

"اچھا!" پنڈت نے اچک کر تیز نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "پنڈت پجاری سوچ بچار کے بعد پگ اٹھاتے ہیں۔ کیا تیرا نام موہن داس نہیں ہے؟"

"ہے مہاراج!" میں نے گھبرا کے لجاجت سے کہا۔

"مجھے کنور مہیش چندر نے بھیجا ہے۔"

"اندر آجاؤ مہاراج!" کنور کا نام سن کے میں نے پنڈت کو راستہ دیتے اور رستہ ہٹاتے ہوئے کہا "میرے بڑے بھاگ کہ آپ جیسے مہان پجاری یہاں پدھارے۔ بتائیے میں آپ کی کیا سیوا کروں؟"

پنڈت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈالی تجسس اور تشویش کی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔ پنڈت کرچھے میں سلگتے انگاروں پر مزید لوبان ڈالتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ صحن عبور کر کے وہ کمرے کے باہر برآمدے کی ایک چوکی پر پنڈتوں کے مخصوص انداز میں بیٹھ گیا۔ اس کی یہ اچانک آمد بے وجہ نہیں تھی۔ اس کی زبانی کنور مہیش چندر کا نام سن کے میرے دل میں ہزار وسوسے بیدار ہو گئے تھے۔ آنے والے لمحے زندگی میں کیسا بھونچال لانے والے تھے، مجھے اس کا علم تھا لیکن یہ یقین ہو چلا تھا کہ اس بار کنور نے تھک کے کچھ اور طریقوں سے میری سرکوبی کی فکر کی ہے۔ میری دیکھا دیکھی ڈالی بھی پنڈت کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑی ہو گئی۔ پنڈت نے کرچھا بائیں جانب رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔

"کنور نے بتایا ہے کہ وہ تجھے اپنا خاص آدمی سمجھتے ہیں۔"

"میں ان کا سیوک ہوں مہاراج! کنور جی میرے مالک ہیں، ایشور کی کرپا ہے کہ کنور مجھ پر مہربان ہیں۔"

"ہاں۔" وہ ایک لمبا سانس لے کے گردن ہلاتے ہوئے بولا "یہ سب ایشور کی کرپا ہے۔" پھر اس نے ایک غیر متوقع سوال کر ڈالا "اس سندر ناری سے تیرا کیا سمبندھ ہے؟"

میں نے جلد ہی خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا "اس کا نام ڈالی ہے مہاراج! ہم دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہیں، یہ میری پتنی نہیں پر میری سب کچھ ہے۔"

پنڈت کی آنکھیں دفعتہً کھل گئیں اور اس نے ملامت اور قہر کی ایک نظر ڈالی کے سراپا پر ڈالی۔ وہ لرز کے رہ گئی "کیا تجھے اپنا جنم دن یاد ہے رے؟"

پنڈت کی نظریں پورے کوارٹر اور در و دیوار کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ پھر دوبارہ اس کی تیز نگاہیں مجھ پر ٹک گئیں۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ پنڈت میرے چہرے کے تاثرات پڑھنے اور دل کا حال جاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسے ہی ایک پنڈت سے میرا واسطہ کنور مہیش چندر سے خاص کر کے پڑا تھا۔ وہ میرے ماضی کے متعلق بہت کچھ جان گیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ڈالی کے سامنے پنڈت کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ دے جسے سن کے ڈالی گڑ بڑا جائے اس کی لڑکھڑاہٹ پنڈت کو مشکوک کر سکتی تھی۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ ہمارے عزائم کی سن گن لینے آیا ہے۔ مرحلہ سخت گزر گیا۔ اس سے قبل کہ میں پنڈت کے سوال کا جواب دیتا، اندر سے گڈے کے رونے کی آواز آئی وہ جاگ گیا تھا۔ ڈالی بھاگ کے اندر چلی گئی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"جنم دن چھوٹے آدمیوں کو کہاں یاد رہتا ہے مہاراج! اس کی چنتا تو بڑے لوگ کرتے ہیں۔"

اس نے چھت کی طرف انگلی اٹھائی اور مختلف سمتوں میں انگلی سے اشارہ کرنے لگا۔ پھر مجھ سے بولا "تو بہت دکھی دکھائی دیتا ہے۔ روگی! کیا تجھے کسی سہارے کی ضرورت ہے؟"

"میں بہت خوش ہوں مہاراج! کنور جی کی کرپا سے سارے دکھ دور ہو گئے ہیں۔ وہ بڑے دیالو ہیں۔" میں نے عقیدت سے کہا۔ پنڈت کا انداز اور لہجہ بہت پُراسرار تھا۔ نہ جانے وہ یہ اوٹ پٹانگ سوال اور اُلٹی سیدھی حرکتیں کیوں کر رہا تھا؟ معاً میں ایک خیال سے چونک گیا کہ کہیں اس نے گیجو کا راز تو نہیں پا لیا؟ کہیں اس نے اُس سائے کا سراغ تو نہیں لگا لیا جس نے ہر آڑے وقت میں میری مدد کی ہے؟ یہ یقیناً کوئی گیانی پنڈت ہوگا۔ مہیش چندر نے رات کے حملے میں ناکامی کے بعد اسے طلب کیا ہوگا۔ کنور ایک وہمی شخص ہے۔ اس کے دو آدمی جو مجھے مارنے کے ارادے سے آئے تھے، خود جہنم رسید ہو گئے۔ مہیش چندر نے معجزاتی طور پر میرے زندہ رہنے کے سبب پر ضرور سوچا ہوگا۔ پرکاش چندر کی موت کی نوعیت بھی مہیش چندر کے لیے حیرت انگیز کارنامہ ثابت ہوئی ہوگی۔ نہ کوئی خنجر نہ خون نہ کوئی نشان۔ اس کا باپ اس کی خواہش کے عین مطابق مقررہ وقت پر پرلوک سدھار گیا تھا۔

"جا ایک گلاس پانی لے آ۔" پنڈت نے لہراتے ہوئے کہا۔

میں وہاں سے ہٹنے کے لیے آمادہ نہیں تھا لیکن ڈالی کو آواز دے کے دوبارہ پنڈت کے پاس بلانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ چار و ناچار میں خود ہی لپک کے اندر گیا۔ ڈالی کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ اس نے اشارے سے پنڈت کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔ میرے پاس شانے اچکانے اور اپنی لاعلمی ظاہر کرنے کے سوا کون سی خبر تھی جو اسے مطمئن کرتا؟ پانی لے کے میں جلد از جلد باہر آ گیا۔ جب میں واپس آیا تو صحن اور برآمدے میں کوئی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ پنڈت نے گلاس میرے ہاتھ سے لے کے کچھ پڑھنا شروع کیا اور پھونک مار کے اسے کچے صحن میں اچھال دیا جو پانی گلاس میں باقی بچا، وہ اس نے دیواروں پر پھینک دیا۔ مجھے کوارٹر میں پھیلی ہوئی ناگوار بُو اور پنڈت کے پانی پھینکنے پر حیرت ہوئی۔ وہ میرے چہرے کے تاثرات بھانپ کے گمبھیر آواز میں بولا "اب تجھے چنتا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تیرا من شانت ہو جائے گا۔ میں نے جل پر منتر پھونک کے مکان پوتر کر دیا ہے۔ اب گندے سائے تیرا جیون بیاکل نہیں کریں گے۔"

"میں سمجھا نہیں مہاراج؟" میں نے ہاتھ جوڑ کے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"تم کن گندے سایوں کی بات کر رہے ہو؟ یہ کوارٹر تو بہت اچھا ہے یہاں

مجھے بڑا سکھ ہے، خوب نیند آتی ہے۔"

"اب تجھے اور اچھی نیند آئے گی۔" تیری آنکھیں سامنے کی چیزیں دیکھتی ہیں بالک!" وہ گرج دار آواز میں ٹھہر ٹھہر کے بولا "پر مجھے اپنی آنکھوں سے زمین کے اندر کا بھی نظر آجاتا ہے۔ سالے پاپی!" وہ بپھر کے بولا "نس نس کا خون کر رہا ہے تو کچھ نہیں جانتا پر میں دیکھ رہا ہوں کہ پرکاش بھون پر منحوس سائے منڈلا رہے ہیں۔ تو کنور جی کا خاص سیوک ہے۔ اس لیے تیری رکشا کرنا ضروری تھا سمجھا؟"

وہ ایک دم خاموش ہو گیا اور کرچھا سنبھال کے اُٹھنے لگا۔

"دھنیہ ہو مہاراج! کنور جی کو میرا کتنا خیال ہے کچھ دیر اور پدھارو گرودیو! مجھے اپنی سیوا کرنے کا موقع دو۔ کچھ جل بھوجن کرتے جاؤ۔" میں نے اس کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔

"پیچھے ہٹ۔" اس نے دھتکارتے ہوئے کہا "پاپی! ہاتھ لگاتا ہے؟" پھر وہ اچانک پلٹا اور میری آنکھوں میں جھانک کے بولا "تجھے کون سا پھول، کون سا رنگ پسند ہے؟"

میں نے کہیں سنا تھا کہ پنڈت پجاری پھول اور رنگ کی پسند سے بہت سے نتیجے نکال لیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے غلط بیانی سے کام لے کے چمپا کا نام لیا حالانکہ مجھے گلاب زیادہ پسند تھا۔ رنگوں میں میں نے دانستہ کالے رنگ کا نام لیا جب کہ کالا کسی کو بھی پسند نہیں ہوتا۔ پنڈت نے چمپا اور کالے رنگ کا دھیان کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس کے چہرے پر کھنچاؤ محسوس کر رہا تھا۔ چند ثانیے وہ اسی کشمکش میں کھڑا رہا، پھر اس کے ہونٹ متحرک ہو کے کھل گئے۔ وہ ناراضی سے کہہ رہا تھا۔

"پاگل! پنڈتوں پجاریوں کی شکتیاں مہان ہوتی ہیں۔ وہ من کا حال بھی جاننے کی شکتی رکھتے ہیں۔" پنڈت کے تیور خطرناک تھے۔ وہ من کا حال جاننے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ اگر اسے من کا حال معلوم ہوتا تو اتنے سوال کرنے کی اسے ضرورت پیش نہ آتی۔

"کیا سیوک سے کوئی بھول ہو گئی؟" میں نے اس کا غصہ دیکھ کے کہا۔

"موہن داس!" وہ بگڑ گیا تھا۔ دھمکی آمیز لہجے میں بولا "یاد رکھ جنگل میں اسی کا حکم چلتا ہے جو سب سے زیادہ بلوان ہوتا ہے۔"

ڈالی پنڈت کی کرخت آواز سن کے گدّے کو روتا چھوڑ کے باہر آگئی تھی۔ میں نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن پنڈت سرخ نظروں سے مجھے گھورتا ہوا کوارٹر سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈالی مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگی۔ میں نے اسے چند لمحے خاموش رہنے کی تلقین کی اور دروازہ بند کر کے اسی چوکی پر نڈھال ہو کے بیٹھ گیا جہاں پنڈت بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں ان گنت سوال، ان گنت اندیشے گردش کر رہے تھے اور پنڈت کا آخری جملہ؟ مہیش چند کے لیے اب میرا وجود ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ میری فنا کا خواہاں تھا مگر کیوں؟ جواب کوئی مشکل نہیں تھا۔ وہ اپنا ہر راز مٹا دینا چاہتا تھا۔ اگر کیپو ایک پراسرار طاقت میری مدد کر رہی تھی تو مہیش چند اپنے بے شمار سادھوؤں اور پنڈتوں کو میرے خلاف اکسا سکتا تھا۔ اسے یہ اندازہ تو ہو ہی گیا کہ کوئی سایہ میری پشت پناہی کر رہا ہے۔ پنڈت کے ذومعنی جملوں کی تشریح کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرا زندہ رہنا مشکل ہے، مجھے کبّا اور رنّو بیگم کے قتل پر اسی وقت اپنے آپ کو موت کے سپرد کر دینا چاہیے تھا۔ یہ زندگی جو میں نے زبردستی حاصل کی ہے، ہمیشہ مجھے پریشان کرتی رہے گی۔ اگر وہ کیپو کو میری مدد سے باز رکھنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر میرے لیے کیا رہ جائے گا؟ ممکن ہے کیپو کے لیے پنڈت نے کوئی ایسا منتر پھونک دیا ہو کہ وہ کبھی اس طرف کا رخ نہ کرے؟ جب ایک سادھو میرے ماضی کے بارے میں سب کچھ جان سکتا ہے تو دوسرا کیپو کو مجھ سے دور کرنے کی کوشش میں کامیاب کیوں نہیں ہو سکتا؟ پنڈت کے آنے سے پہلے میں ڈالی کے سامنے بڑی ہمت اور جواں مردی کی باتیں کر رہا تھا۔ پنڈت کے جانے کے بعد میرے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ میں نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ میری بگڑتی ہوئی حالت سے ڈالی گھبرا گئی اور میرے ہاتھ چہرے سے ہٹا کے بولی "شیرو! مجھے معلوم ہے کہ پنڈت کوئی اچھی بات کہہ کے نہیں گیا ہے۔ مجھے وہ کوئی اچھا آدمی نہیں لگا۔ شیرو! اگر تو بھاگ نہیں سکتا تو روز روز کے ان جھگڑوں سے نجات حاصل کر لے۔ تو پہلے میری گردن پر چھری پھیر دے، پھر گدّے کو ختم کر دے اور جی کڑا کر کے اپنے سینے میں بھی چھرا گھونپ لے۔"

"پگلی!" میں نے ایک سانس لی اور ایسی آواز میں کہا جس میں اعتماد نہیں تھا۔ "خوف زدہ کیوں ہوتی ہے؟ ہمارے مرنے کا وقت آئے گا تو کون روک سکتا ہے؟ اب تک ہم بچتے رہے ہیں تو آگے بھی امید رکھ۔ پرکاش بھون سے بھاگنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ ہمیں یہاں اپنی موت کا انتظار کرنا پڑے گا لیکن میں ایسے نہیں مروں گا، کچھ انتظام کر کے مروں گا۔" میں نے اشتعال میں کہا۔

"تو مہیش چند پر وشواس کر رہا ہے۔ وہ ایک نمبر کا حرامی ہے شیرو! جو اپنے باپ کا نہ ہوا، وہ اپنے ملازموں کا کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسے میں سب جانتی ہوں کہ مہیش اور اس کے گرگے تیری جان کے لاگو کیوں ہو گئے ہیں؟ میں نے ان کی کرتوتیں قریب سے دیکھی ہیں۔ ان سب کے دل پتھر کے ہیں۔"

"مایوس مت ہو میری ڈالی!" میں نے پہلی بار اسے کھینچ کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا "اتنا انتظار اور کر لے کہ میں حساب کتاب صاف کر لوں۔ میری ہمت بڑھانے کے بجائے تو تو اسے اور پست کر رہی ہے۔ حوصلہ رکھ ڈالی! جا دیکھ، گدّے کو سنبھال، وہ رو رہا ہے۔" میں نے اسے اپنے سینے سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

لفظ ادا کرنے میں کیا خرچ ہوتا ہے مگر لفظ ہر زخم کا مداوا ہوتے تو زندگی میں ہر لمحے ناکامیاں، یہ محرومیاں کیوں ہوتیں؟ میں نے وہ لفظ ڈالی کے سامنے ادا کر دیے تھے جن پر مجھے خود بھروسا نہیں تھا۔ میں چوکی پر بیٹھا سوچتا رہا۔ کیا میں ایک ناکارہ شخص ہوں؟ کیا میرے بازو مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور میرے دماغ میں کسی جانور کا مغز ہے؟ حوصلے کی ایک لہر میرے رگ و پے میں ایک تازیانے کی طرح دوڑی لیکن جسم پر خوف اور دہشت کا ایسا غلبہ تھا کہ وہ شعلہ ایک دم ماند پڑ گیا اور میں نے اپنے اردگرد لوہے کا ایک پنجرا دیکھا جس میں ایک گدھا بند تھا۔ جس کا اتفاق سے کوئی انسانی نام پڑ گیا تھا۔ میر جمشید عالم، شیر باز خاں، شیرو، موہن داس۔ صرف یہی نہیں کہ پنڈت کی آمد کا مقصد کیا تھا۔ رات کے واقعات پر غور کرنے کی تو مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ تشار دانے جو پستول دیا تھا وہ بھی غائب تھا۔ میں اسے

رات ہی ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا تھا۔ رات کیچو کے پُراسرار سائے نے جس وقت میرے ہوش و حواس سلب کر رکھے تھے، پستول اسی دوران میں کہیں گم ہوا۔ اُسے ٹھاکر اور رام لال میں سے کوئی لے گیا؟ یا کوئی اور؟ میں اپنی طلبی کا منتظر تھا۔ اب پرکاش بھون کے سنگ دل جلاد میری پیٹھ پر کوڑے لگائیں گے اور میرے منہ پر تھوکیں گے۔

اسی ادھیڑ بن میں عابد شیرازی کا چہرہ یاد آ گیا جو کل کنور مہیش چندر سے ملنے آیا تھا۔ کیا میرے ماضی کے متعلق جو باتیں سادھو مہیش چندر کو نہیں بتا سکا تھا وہ عابد شیرازی نے بتا دیں؟ اگر اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں مسلمان ہوں تو مہیش چندر کے غیظ و غضب کا کیا عالم ہو گا؟ اگر عابد شیرازی پرکاش بھون میں موجود ہے تو کسی وقت بھی میرا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ ممکن ہے جے پال نے مہیش چندر کو یہ اطلاع بھی دے دی ہو کہ مجھے پارو نے اپنی خواب گاہ میں طلب کیا تھا؟ اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ مجھ پر شاردا کے التفات کا پتہ مہیش چندر کو چل گیا ہو؟ اور اس نے مجھ جیسے خطرناک آدمی کو فوراً راستے سے ہٹانے کے لیے ٹھاکر اور رام لال کو مامور کیا ہو؟ ٹھاکر اور رام لال کا انجام عبرت ناک ہوا تو کیا ہوا، مہیش چندر کے پاس جاں نثاروں کی کوئی کمی ہے؟ دن چڑھ آیا تھا۔ نہ میں نے ناشتہ کیا تھا اور نہ کچھ کھانے کو جی چاہتا تھا۔ ڈالی نے چیڑ کے گدّے کو میری گود میں ڈال دیا اور گدّے نے اتنا کام ضرور کیا کہ مجھے ان عذاب ناک فکروں سے نجات دلا دی۔ وہ کھل کھلانے لگا۔ جیسے میرا مذاق اڑا رہا ہو۔

شاردا کی طرف جاتے ہوئے میں بے حد پُرسکون تھا میری نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ڈر تھا کہ کہیں عابد شیرازی سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے؟ شاردا کے پاس جانے کا ارادہ میں نے سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ ایک تو یہ کہ رات شاردا ہی میرے خلاف سازش کا انکشاف کرنے آئی تھی۔ اس نے اپنے عہد و پیمان نباہے تھے۔ دوسرے یہ کہ آیندہ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں مجھے بہترین مشورے شاردا ہی سے مل سکتے تھے۔ کل کی طرح آج بھی میں عابد شیرازی کے خوف سے گھر بیٹھ جاتا تو یہ مصائب کم نہ ہوتے بلکہ دماغ خراب ہو جاتا۔ پرکاش بھون میں میرے ساتھ کیسا مضحکہ خیز تماشا ہو رہا تھا؟ ایک طرف اسی خاندان کا ایک فرد میرے خون کا پیاسا تھا۔ دوسری طرف بہن کی ایک با اثر لڑکی میری زندگی کے لیے رسوائی کے خوف سے بے پروا، جدوجہد کر رہی تھی۔ میں یہاں کی کئی عورتوں کا محبوب تھا۔ میں یہاں کے کئی مردوں کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔

ملازموں کے چہرے زرد پڑے تھے۔ راستے میں کئی سہمے ہوئے ملازم نے میرا راستہ روک کے رات کے واقعے پر رازدارانہ انداز میں گفتگو کرنی چاہی۔ "میں بھگوان بہتر جانتا ہے، اپنی جان کی خیر مناؤ بھائی!" کہتا ہوا آگے بڑھ گیا جس تواتر سے خونیں واقعات رونما ہو رہے تھے۔ اُس سے غریب ملازموں میں بے چینی پیدا ہونی لازمی تھی۔ میرا خیال تھا، بہت سے نوکر پرکاش بھون کے مقتل سے نکلنے کے لیے پر تول رہے ہوں گے۔ نہ معلوم اور کتنے لوگ میری طرح عذاب سے دوچار ہوں گے۔ ان کے پیروں میں نادیدہ زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ رام لال اور ٹھاکر کی موت کا سبب سانپ کا ڈسنا بتایا گیا تھا۔ کنور مہیش چندر کے خاص ملازموں نے دونوں لاشیں ٹھکانے لگانے میں بہت جلد بازی کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ اندازہ ہوتا تھا کہ مہیش کچھ عرصے تک خاموش رہے گا کیونکہ اگر ملازموں میں بے چینی عام ہو گئی تو پرکاش بھون کے آقاؤں کی زندگی جہنم بن جائے گی۔ یہ محکوم ہی نہ ہوں گے تو حاکم کس پر حکومت کریں گے۔ حکومت کے لیے محکوموں کی موجودگی شرط ہے۔ میں شاردا سے مل کے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اُسے اس سازش کا علم کس طرح ہوا؟ میں شاردا کے کمرے میں خاموشی سے داخل ہوا تو وہاں پرکاش چندر کی اور لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ تسکنتلا بھی تھی۔ میری آمد پر تسکنتلا نے ایک خاص انداز سے مجھے دیکھا اور ہم دونوں کی یہ کیفیت شاردا نے خاص طور پر محسوس کی۔ اس کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ چھا گئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئی۔ مجھے زندہ و سلامت دیکھ کے امتنان و تشکر کے جذبات اس کی آنکھوں میں اُبھر آئے۔ میں لڑکیوں کے ہجوم کو باری باری سلام کرتا ہوا شاردا کے کمرے سے ملحق کمرے میں گھس گیا۔ وہاں مالتی پہلے سے موجود تھی۔ خلافِ معمول وہ خاصی سنجیدہ تھی۔ "کیوں رے موہن! رات کی کتھا بھی سنی تو نے؟" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

وہ فرنیچر سے گرد صاف کر رہی تھی۔ میں اس کی مدد کرنے لگا۔ میرے منہ سے نکل گیا۔ "ابھی کیا ہے، آگے دیکھ کیا ہوتا ہے۔"

"یار موہن!" مالتی کبھی کبھی قربت کا ایسا ہی اظہار کرتی تھی۔ "اب یہاں سے دل اُچاٹ ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں کل کس کا نمبر آ جائے؟ تُو تو مجھے یہاں سے بھگا کے لے چل پیارے!" وہ میرے قریب کولھے مٹکاتے ہوئے بولی۔

"سب جانا چاہتے ہیں میری بھولی گڑیا! میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک دن یہ محل خالی ہو جائے گا۔ پھر یہاں کُتّے لوٹیں گے۔"

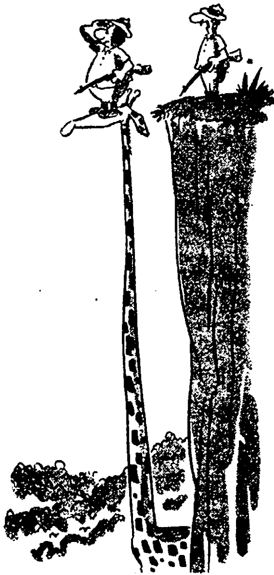
"میں آج رات تیری طرف آؤں گی۔" وہ رازداری سے بولی۔ "پھر باتیں ہوں گی۔ ذرا اِدھر اُدھر دیکھ کے چلا کر۔"

"ڈالی اب گھر ہی میں موجود رہتی ہے، تو کیسے آئے گی؟ دن میں کسی سمے آ جانا۔" میں مالتی کی بات رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے وقت میں مجھے ہر شخص کے تعاون کی ضرورت تھی۔

ہم دونوں صفائی کرنے اور بستر کی چادر بدلنے میں مصروف تھے کہ شاردا کی آواز آئی۔ میں کام چھوڑ کے باہر لپکا۔ مالتی چونکہ موجود تھی۔ اس لیے میرے چہرے پر ملازموں کی سی کیفیت طاری تھی۔ شاردا نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مالتی کو ایک حکم دے کے باہر بھیج دیا۔ مالتی نے چلتے وقت مجھے آنکھ ماری۔ جیسے کہہ رہی ہو "بچ کے رہنا۔ اس کی نظر بھی ہے تجھ پر۔" مالتی چلی گئی تو شاردا تیزی سے میرے قریب آئی۔ اس کا انداز سپردگی کا تھا لیکن میرے قریب آ کے رُک گئی۔ اس کے چہرے پر روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ "بزرگوں نے سچ کہا ہے موہن! جسے بھگوان رکھے اُسے کون چکھے۔"

"یہ خوشی عارضی ہے۔" میں نے قصداً بے تکلفی اختیار کی۔ "رام لال اور ٹھاکر کی موت سے ایک خطرہ ٹل گیا ہے لیکن ہزاروں خطرے اور پیدا ہو گئے ہیں۔"

"تم چنتا مت کرو موہن!" شاردا نے بڑے اعتماد اور وقار سے کہا۔



"کیا آپ نے کنور صاحب بہادر سے میری سفارش کر دی ہے؟" میرا لہجہ معنی خیز تھا۔ شاردا مہیش چندر کی سگی بہن تھی۔ مہاراج کے دیہانت کے بعد اس کی اہمیت مہیش چندر کی وجہ سے بڑھ گئی تھی لیکن میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ پرکاش چندر بھی مہیش چندر کا سگا باپ تھا۔ مجھے یقین تھا شاردا اس حقیقت سے لاعلم ہو گی کہ میرے قتل کی سازش میں خود اس کے بھائی کا ہاتھ ہے۔ ورنہ وہ اس قدر ہشاش بشاش نظر نہ آتی۔

"ابھی اس کی نوبت نہیں آئی ہے موہن!" اس نے سر جھٹک کے کہا۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال شانوں پر بکھر گئے۔ "فی الحال میں نے تمہاری حفاظت کا بندوبست اپنے طور پر کر دیا ہے لیکن اگر خطرہ بڑھا تو میں مہیش سے بھی بات کر لوں گی۔"

"شاردا!" میں نے ایک قدم اور بڑھایا۔ اس کا نرم ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "میں اس وقت آپ سے کچھ اور دریافت کرنے آیا ہوں۔"

"ارے موہن! تمہارے لہجے سے پھر تکلف کی بُو آ رہی ہے؟ اس سے مجھے شدید تکلیف ہوتی ہے کیا تم مجھ پر ابھی تک اعتماد نہیں کرتے؟ کیا میں پرکاش بھون کی دوسری عورتوں کی طرح تمہیں فریبی دکھائی دیتی ہوں؟" وہ شکایت کے انداز میں بولی۔

"شاردا! مجھے اپنی اوقات کا خیال آ جاتا ہے۔" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"ایسی باتیں کر کے تم مجھے دُکھ پہنچاتے ہو۔"

"آپ مجھے یوں ہی قتل کر دیں گی۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

وہ میرے اس اچانک جملے پر شرما گئی اور اپنی ساڑھی دیکھنے لگی۔ اسے خیال نہیں تھا کہ اس کی ساڑھی کا پلو زمین پر گر پڑا ہے اور اس کا نازک اندام سراپا تجلیاں بکھیر رہا ہے۔ میں سب کچھ بھول کے اس میں گم ہو گیا تھا۔ "اوہ!" وہ خجل ہو کے بولی۔ اس نے اپنا پلو درست کیا۔ "تم کیا پوچھنا چاہتے تھے؟" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"ہاں" میں نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں شاردا کہ میرے قتل کی سازش میں کس کا ہاتھ تھا؟" میں شاردا کی پیشانی پر ایک آوارہ لٹ چھیڑنے لگا۔

"تم سے" وہ سرگوشی میں بولی۔ اور میری قمیص کا اوپر کا بٹن بند کرنے لگی۔ "میں تم سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتی۔" میں نے کہا تھا "یہاں ہر راز کی قیمت مقرر ہے۔ پرکاش بھون سے میرا تعلق ہی کیا ہے؟ مجھے زندگی بھر یہاں نہیں رہنا ہے۔ چنانچہ مجھے یہاں کی دولت کی بھی پروا نہیں ہے۔ میں نے راز خریدنے کے لیے سب سے بڑی بولی لگانی شروع کر دی ہے۔ مالتی میری بہترین رازدار ہے۔ اس کے کئی آدمی ادھر اُدھر پھیلے ہوئے ہیں۔ اُسے ٹھاکر اور رام لال کی بدنیتی کا علم کسی اور ذریعے سے ہو گیا تھا۔"

"آپ کے خیال میں میرا دشمن کون ہو سکتا ہے؟"

"میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ہو سکتا ہے شکنتلا کو تم ناپسند ہونے لگے ہو۔" شاردا سنجیدہ ہو گئی۔

"اجیت کے ساتھ بھی اسی قسم کا ناٹک کھیلا گیا تھا۔ مجھے مالتی کے ذریعے پتہ چلا ہے کہ اب وہ جے پال سے قریب ہو رہی ہے۔"

میں نے اپنا شبہ اور یقین شاردا پر ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ مجھ سے رات کو کوارٹر میں تالا بند کرنے اور زیادہ سے زیادہ اپنے پاس رہنے کی تاکید کرتی رہی اور پرکاش بھون کی سازشوں کے پرانے طور طریق بتاتی رہی۔ پھر اس نے اچانک چونکتے ہوئے کہا۔ "موہن! میں ایک بات تو بھول ہی گئی۔ رات تم کس وقت اِدھر آئے تھے؟ مجھے تم جیسے عقل مند اور پڑھے لکھے آدمی سے ایسی توقع نہیں تھی کہ تم اس حماقت کا ثبوت دو گے۔ تمہیں اب پہلے سے زیادہ محتاط رہنا ہو گا۔ تمہیں کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ شکنتلا تو ناگن ہے۔ اس کے شریر کا زہر پرکاش بھون میں سب سے زیادہ خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ وقت بے وقت باہر مت نکلا کرو۔"

"میں آپ کا اشارہ نہیں سمجھا شاردا!" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "آپ کو یہ شبہ کیسے ہوا کہ میں رات اِدھر آیا تھا؟"

"اگر تم نہیں آئے تھے تو میرا پستول کیا جن بھوت یہاں چھوڑ گئے ہیں؟"

"کیچو" میرے ذہن میں کیچو کا سایہ ابھر آیا۔ پستول کی گم شدگی کا معمہ خود بخود حل ہو گیا۔ مجھے جو تشویش لاحق تھی، وہ ختم ہو گئی۔ میں نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ "آپ کا پستول زیادہ دیر تک میں نے اپنے پاس رکھنا مناسب نہیں سمجھا تھا، اس لیے رات ہی خاموشی سے اسے واپس چھوڑ گیا تھا۔"

"کیوں؟ کیا تمہارا خیال تھا کہ پستول تمہارے پاس سے برآمد ہوتا تو میں آنکھیں بدل لیتی؟" شاردا نے مجھے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ایک ایک انداز سے بے پناہ محبت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اب آپ مجھے ناراض کرنے کے موڈ میں ہیں، آپ بدلے لے رہی ہیں۔ ٹھیک ہے، ہم پہ ستم کیجیے۔ ہمیں سزائیں دیجیے۔ شاردا۔" میں نے والہانہ کہا۔ میں نے

بہت سوچ سمجھ کے یہ قدم اُٹھایا تھا۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ پرکاش بھون کی ایک حسین ترین لڑکی۔ ایک راج کماری میرا خیال رکھتی ہے۔"

"پھر وہی راج کماری۔" الفاظ واپس لوٹ۔ ثناردا کی آواز کپکپا رہی تھی اور آنکھوں میں موتی جھلملا رہے تھے۔ اس کے یاقوتی ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ میں ایک آدمی بن گیا کیونکہ میں بہرحال ایک آدمی ہی تھا۔ میں نے آگے بڑھ کے اس کے لب چوم لیے اور مجھے ایسا لگا جیسے میرے ہونٹ سُن ہو گئے ہوں۔ جیسے انھیں کرنٹ لگ گیا ہو جیسے وہ میرے ہونٹ نہ ہوں۔ ہمارے درمیان ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں یکلخت پیچھے ہٹ گیا۔ ثناردا کی نظریں زمین میں گڑ گئی تھیں۔ میرا خیال تھا وہ میری جسارت پر برہمی کا اظہار کرے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

"موہن! اب آیندہ ایسا نہ کرنا۔" وہ دبی زبان سے بولی۔ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسکنتلا ہو گئی ہوں۔ جیسے میں ایک مجرم ہوں اور میرے چہرے پر داغ پڑ گئے ہیں۔ ہم یہاں نہیں رہیں گے موہن! پھر میرا تمھارا یہ فرق بھی ختم ہو جائے گا۔ تم مجھے یہاں سے لے جاؤ گے۔ پھر تم جو چاہو کرنا۔" وہ سسکنے لگی۔

"ارے ارے۔ آپ تو رونے لگیں۔" میں نے خفت سے کہا۔ "میں بہت شرمندہ ہوں۔ بس یوں ہی جی چاہا کہ آپ ......"

ایک خادمہ کے آ جانے سے میں نے ہونٹ سی لیے۔ ثناردا نے بڑی سُرعت سے اپنا لہجہ بدل لیا۔ پرکاش بھون میں گا ہے گاہے ہی ثناردا سے خلوت کے یہ موقعے ملتے تھے اور جب ملتے تھے تو کوئی نہ کوئی آ دھمکتا تھا اور سارا شیرازہ منتشر کر دیتا تھا۔



ثناردا نے مجھے سرِ شام ہی رخصت کر دیا۔ وہ اوروں کے سامنے مجھ پر حکم چلاتی تھی مگر خلوت میں میری حکومت اُس پر چلتی تھی۔ میں اُس سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ اُس دن میں وہاں سے آیا تو میرے دل و دماغ کا تکدر خاصا دُور ہو چکا تھا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اس تنہائی میں پھر طرح طرح کے خیالات نے مجھے گھیر لیا اور جیسے جیسے اندھیرا گہرا ہوتا گیا، میرا دل ڈوبنے لگا۔ ثناردا نے آج اپنی والہانہ گفتگو سے میری دُنیا بدل دی تھی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اُسے لے کے کہیں دُور چلا جاؤں گا۔ اتنے ستم جھیلنے کا انعام اگر ثناردا کی صورت میں ملتے تو یہ ستم کچھ بھی نہیں تھے۔ جب میں نے یہ عزم کیا تھا، مجھے بانو یاد نہیں رہی تھی اور میں ڈالی کو بھی فراموش کر بیٹھا تھا۔ بانو میرے فراق میں کیسی کٹ رہی ہو گی؟ مگر وہ کیا بات تھی کہ ثناردا میری نظر میں پیش پیش تھی؟ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں پرکاش بھون کے کھائے ہوئے زخموں سے چُور چُور ہو چکا تھا اور مہیش سے اپنے انتقام کی آگ اسی صورت میں بجھا سکتا تھا کہ اس کی بہن کو یہاں سے لے جاؤں اور پھر ثناردا تو ایسی لڑکی تھی جس پر زندگیاں قربان کر دی جائیں، جسے خون سے خط لکھے جائیں، جس کے لیے عمر بھر انتظار میں گزار دی جائے۔ جس کے لیے راتوں کو دن سمجھا جائے اور دن جہنم سمجھے جائیں۔ اور بانو؟

کسی نے میرے کانوں میں سرگوشی کی، کسی نے مجھے ٹہوکا مارا۔ میں جھنجلا کے اُٹھ بیٹھا اور کوارٹر میں ٹہلنے لگا۔ تمام خواب اُس وقت تک بے کار ہیں۔ جب تک میں اس قید خانے سے رہائی حاصل نہیں کر لیتا اور قید خانے سے رہائی اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک مہیش چندر کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ میں ہمیشہ اس کے لیے بے ضرر رہوں گا یا وہ یہ سمجھ لے کہ میری پسپائی میری موت اُس کی زندگی میں محال ہے یا پھر یہ کہ مہیش چندر خود ختم ہو جائے؟ ہاں میرے ذہن میں کوئی شعلہ سا لپکا۔ مہیش چندر کیوں زندہ ہے؟ میری تمام مصیبتوں کی جڑ وہی ہے میرے تمام رازوں سے وہی واقف ہے۔ وہ زندہ ہے تو میں مُردہ ہوں۔ مجھے صرف ایک شخص سے نمٹنا پڑے گا اور پرکاش بھون کے تمام راستے میرے لیے کھل جائیں گے۔ میں آزاد ہواؤں میں سانس لے سکوں گا۔ پھر سے نئی زندگی شروع کر سکوں گا مگر میں نے اپنے جذبات کی خود ہی نفی کی۔ کیا میں دوبارہ شہروں میں جا سکتا ہوں اور نئے سرے سے زندگی شروع کر سکتا ہوں؟ بنو بیگم اور مختار کے قتل کے معاملے پر اوس نہیں پڑے گی۔ میں گنجان آبادیوں سے بھاگتا ہی رہوں گا مگر سنسان بستیوں میں تو ایسی وحشت نہ ہو گی۔ میں کہیں بھی منہ چھپا لوں گا۔ میں اپنا چہرہ مسخ کر لوں گا۔ میں اندھا ہو جاؤں گا۔ میں اپنی ایک ٹانگ کاٹ لوں گا تاکہ کوئی میری شناخت نہ کر سکے۔ اتنے بڑے ہندوستان میں مجھے کہیں تو اپنے آپ کو چھپانے کے لیے کوئی جھونپڑی کوئی سائبان، کوئی غار مل سکتا ہے؟ میں نے جتنا سوچا، مہیش چندر کی زندگی کے دن کم ہوتے گئے۔ اب میرے سامنے ایک ہی مسئلہ تھا کہ میں کس طرح مہیش چندر کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکتا ہوں؟ کاش کیچو یہ کام کرنے کے لیے راضی ہو جائے۔ کیچو۔ ورنہ پھر ایک طویل انتظار۔ کسی مناسب موقع کے لیے طویل انتظار اور اس دوران میں ممکن ہے مہیش چندر میری موت کا فرمان دوبارہ جاری کر دے۔ فرمان تو جاری ہو گیا تھا، نہ معلوم کب اس کی تعمیل ہو جائے۔ میں کیچو کو یاد کرنے لگا۔ کیچو کون ہے؟ کیا ہے؟ ان سوالوں کا کوئی اطمینان بخش جواب میرے پاس نہیں تھا۔ کیچو کوئی سایہ ہے جو مجھ پر مائل ہے۔ بس یہی بات اُس وقت غنیمت تھی۔ چراغ جلتے ہی ڈالی کمرے میں آ گئی۔ وہ رام لال اور ٹھاکر کی موت کے بارے میں ملازموں کی چہ میگوئیاں اور افواہیں سنانے لگی۔

ڈالی کے چہرے کی زردی اور اس کی حوصلہ شکن گفتگو سن کے میرے ذہن میں یہ اندیشہ بھی کھٹکنے لگا تھا کہ ڈالی جیسی عورت کو حالات نے بزدل بنا دیا ہے اگر اُس پر سختی کی گئی اور اس کے بچے کو نشانہ بنایا گیا تو کیا عجب ہے، وہ اپنی زبان کھول دے؟ اُس کی زبان کھل گئی تو قیامت آ جائے گی۔ اس خدشے کو اُس وقت اور تقویت ملی جب جے پال کا ایک ماتحت ڈالی کو بلانے آیا۔ میں نے اُٹھ کے صحن میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ ہر لحظے میرا کرب بڑھتا جاتا تھا۔ ہر آہٹ پر میری نظریں دروازے کی سمت اُٹھ رہی تھیں۔ شاید ڈالی واپس آ گئی ہو؟ رات بھیگنے لگی تھی۔ اندر بے چارہ گڈا تنہا پڑا رو رہا تھا۔ کوارٹر گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے گڈے کو کھلونے دے کے اسے کسی نہ کسی طرح خاموش کیا۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے کیچو کا نام کئی بار لیا اور بار بار اِدھر اُدھر ہڑبڑا کے دیکھا کہ کہیں اُس

کا سایہ قریب ہی نہ ہو؟ پھر مجھے صبح آنے والا پنڈت یاد آگیا۔ اُس کم بخت نے کیچو کے آنے کے راستے ہی بند نہ کر دیے ہوں؟ اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ میں آج رات باغ میں ضرور جاؤں گا خصوصاً رات کی رانی کے اُس پودے کے پاس جہاں کیچو کا سایہ غائب ہو گیا تھا۔ حالاں کہ ایسے مشکوک حالات میں باغ میں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا مگر کیچو سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی خطرہ تو ضرور مول لینا تھا۔

اُسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اپنی جگہ سے اُچھل گیا اور لپک کے دروازے کی طرف بڑھا لیکن دروازے پر ہری داس کو دیکھ کے یوں ٹھٹک گیا



جیسے ہری داس کے روپ میں پھانسی کا پھندا میرے سامنے موجود ہو۔ "تم ہری داس!" میں نے مشکل سے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کنور جی نے تمھیں یاد کیا ہے۔" ہری داس سپاٹ لہجے میں بولا۔

"کیوں چاچا! کوئی خاص کام؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"یہ تو انھی سے جا کے پوچھنا۔" ہری داس نے برہمی سے جواب دیا۔

"بگڑتے کیوں ہو چاچا؟ چلتا ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "ڈالی گھر پر نہیں ہے۔ میں گڈّے کو ساتھ والے کوارٹر میں چھوڑ کے آتا ہوں۔"

"کنور جی کا حکم ہے کہ میں تمھیں ساتھ لے کے آؤں۔" ہری داس کا انداز بدلا ہوا تھا۔ میں نے حجت مناسب نہیں سمجھی، گڈّے کو ساتھ والے کوارٹر میں چھوڑ کے ہری داس کے ساتھ چل دیا۔ پہلے ڈالی کو جے پال نے بلایا تھا اور اب کنور مہیش چندر کی جانب سے میری طلبی کا حکم آیا تھا۔ ہری داس کی خاموشی خلافِ توقع تھی۔

کچھ دُور چلنے کے بعد میں نے ہری داس کو چھیڑا۔ "کیوں چاچا! یہ کیسی کھچڑیاں پک رہی ہیں؟ اپنا دماغ تو اُلٹا ہو گیا ہے۔"

"بھگوان جانے۔" ہری داس کا جواب جذبے اور تاثر سے یکسر عاری تھا۔

"مجھے تو اب ڈر لگنے لگا۔" میں نے اسے ٹٹولنے کے لیے گفتگو جاری رکھی۔ "تلے اُوپر چار موتیں ہو چکی ہیں، کون جانے یہاں کیا ہونے والا ہے۔"

"اپنے کام سے کام رکھ موہن داس!" ہری داس سہمے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ "یہاں زبان کھولنے کی سزا بھی موت سے کم نہیں۔"

میں نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ جے پال کے کمرے سے گزرتے وقت میں نے اندر جھانک کے دیکھا۔ اُس کے دو نائب ڈیوٹی پر چوکس موجود تھے، جے پال نہیں تھا۔ ہمیں باہر ہی روک لیا گیا۔ معلوم ہوا کنور مہیش چندر اپنے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ کسی اہم معاملے پر گفتگو کر رہا ہے۔ خاصی دیر بعد جب دونوں راج کمار تمکنت سے باہر نکلے تو میری باری آنے کی اُمید ہوئی۔ دونوں راج کماروں نے سرسری انداز سے مجھے اور جے پال کے نائبوں کو دیکھا۔ ہم سب ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے تھے۔ راج کمار چلے گئے تو ہری داس نے اندر جا کے میرے آنے کی اطلاع دی۔ مہیش چندر نے مجھے فوراً طلب کر لیا۔ کمرے میں وہ اب بھی تنہا نہیں تھا۔ پارو بھی موجود تھی۔ مہیش چندر مجھے دیکھ کے اچانک کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک تیز چمک پیدا ہوئی گلاس ہاتھ میں لیے وہ لڑکھڑاتا ہوا میرے پاس آیا۔ مجھے اس کے تیور اچھے نہیں لگ رہے تھے لیکن آج میں نے بھی جی میں ٹھان لی تھی کہ اگر وہ بدتمیزی کرے گا تو یہیں کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔ روز روز کی ذلت سے ایک دن کی عزت کی موت اچھی ہے۔ کنور نے میرے گرد دو چار چکر لگائے، میں بُت کی طرح جما ہوا کھڑا رہا۔ کنور چند لمحوں کے لیے میرے روبرو ٹھیر گیا اور اُس نے اپنی بڑی بڑی نشیلی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ میں کوشش کے باوجود اس سے نظریں نہیں ملا سکا۔ میری نظریں خود بخود جھک گئیں۔ کنور مسکراتا ہوا صوفے پر واپس چلا گیا اور اس نے ایک سگریٹ ہونٹوں سے لگا لیا۔ پارو نے پیش قدمی کی اور اس کا سگریٹ سلگایا۔ "شکریہ۔" مہیش چندر نے کہا اور کھنکھار کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "موہن داس!" اس کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

"جانتے ہو، ہم نے تمھیں کیوں بلایا ہے؟" وہ ہم کا صیغہ پوری دھمک سے استعمال کر رہا تھا۔

"غلام کی گردن چاہیے؟" میں نے سر جھکا کے کہا۔

"خوب۔" اس نے افتخار سے پارو کی طرف دیکھا۔ "ہم نے تمھیں ایک ضروری کام سے بلایا ہے۔"

"حکم دیجیے سرکار!" میں نے مؤدب جواب دیا۔

"تم جانتے ہو، دوسروں کے مقابلے میں ہمیں تم پر کتنا وشواس ہے۔"

"آپ کی کرپا ہے سرکار! سیوک آپ کے وشواس کو دھوکا نہیں دے گا۔"

"ہم تمھیں کچھ دن کے لیے اپنے سے دُور کر رہے ہیں۔"

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ "کیا غلام سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

"نہیں، غلطی کرنے والے یہاں صرف ایک بار غلطی کرتے ہیں۔"

"پھر سرکار مجھے خود سے جُدا کیوں کر رہے ہیں؟"

وہ گرج کے بولا۔ "سنو — موہن داس! ہم نے پہلے بھی تمھیں کئی بار آزمایا ہے (حالاں کہ ایک ہی بار آزمایا گیا تھا) اب پھر شاید تمھاری ضرورت پڑ جائے۔ اب کے تمھارا کام پہلے سے زیادہ اہم ہے۔ اس وقت ہم کچھ نہیں بتا سکتے۔ مہاراج امرناتھ کے محل میں نجی ملازموں کی ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مہاراج کی سیوا کرنے کے لیے تم راج محل میں ملازمت اختیار کر لو۔"

آخری جملہ انتہائی معنی خیز انداز میں ادا کیا گیا تھا۔ میں کانپ کر رہ گیا۔ ایک لمحے میں بہت سی باتیں میرے ذہن میں در آئی تھیں۔ مجھے راج محل میں ملازمت کا مشورہ یا حکم دینے کا مقصد صاف تھا۔ کنور کی پرواز اس بار پہلے سے زیادہ بلند تھی۔ کنور کی انگریزوں سے دوستی کا سلسلہ بھی اس حکم سے مل رہا تھا۔

میں نے محتاط انداز میں تیزی سے کہا۔ "کیا راج محل میں مجھے ملازمت مل جائے گی سرکار؟"

"شٹ اپ۔" مہیش نے مجھے حقارت سے جھڑکا۔ "یہ سوچنا ہمارا کام ہے۔"

"سرکار کے حکم پر سیوک اپنا جیون بھی بلی دان کر سکتا ہے۔" میں نے باقاعدہ جھک کے کنور کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"مگر — مگر —" کنور کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "یوں تو ہم تم پر پورا وشواس کرتے



کی رائے تھی کہ چھ سو برس کی وسیع مُدّت میں ہندوستان نے صرف دو فارسی شاعر پیدا کیے۔ اہلِ زبان کو چارو ناچار انھیں ماننا پڑا۔ خسروؔ اور فیضیؔ۔

ہیں مگر ہم تمھارے ساتھ اپنے چند اور ملازم بھی بھیجیں گے تاکہ تمھارے قدم بہکنے نہ پائیں۔ تمھارے گھر والے یہیں رہیں گے۔ اگر کام ہماری مرضی کے مطابق نہ ہوا تو تمھارے حق میں بہت خراب نتائج نکل سکتے ہیں۔ سمجھے، ہم کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم کہہ رہے ہیں کہ ہم تمھارے بارے میں کیا نہیں جانتے؟ تم اپنی اوقات سے نہیں بڑھوگے اور ہمارے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ جانتے ہو کہ تم چاہے کہیں رہو، ہماری دسترس سے دُور نہیں رہو گے۔ ہم پہلے سے تمھیں سیاہ و سفید سمجھا رہے ہیں، باقی سوچنا تمھارا کام ہے۔ یوں ہمیں تم پر پورا اعتماد ہے تم ایک بہادر اور جیتر آدمی ہو۔“ کنور نشے میں بہکتا ہوا میرے منہ پر طمانچے لگا رہا تھا۔

”سرکار کو اتنی باتیں کہنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”ضرورت ہے۔“ وہ دہاڑتا ہوا بولا۔ ”ضرورت ہے۔“

پارو خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ میں نے اپنی اطاعت اور وفاداری کا عہد کیا تو وہ مہیش سے انگریزی میں بولی۔ ”کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم ایک ہی آدمی پر بار بار بھروسا کریں؟“

”میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں ڈارلنگ! تم فکر نہ کرو۔“ مہیش چندر نے پارو کی ساری کا پلّو سونگھتے ہوئے کہا۔

”یہ شخص ایک پالتو جانور سے کم وفادار نہیں ہے۔“

”میرا خیال ہے اس کا پرکاش بھون سے باہر جانا مناسب نہیں ہوگا۔“ پارو سنجیدگی سے بولی۔ ”ہم جے پال کو خدمت کا موقع کیوں نہ دیں؟ وہ مجھے ذہنی طور پر اس سے زیادہ برتر معلوم ہوتا ہے۔“

”تم ابھی نادان ہو۔ ابھی کمسن ہو۔“ کنور اس کی زُلفیں اُڑاتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنے پالتو جانوروں کی خصوصیات تم سے زیادہ جانتا ہوں۔“ مہیش نے دوبارہ گلاس بھر لیا اور رُوکھے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”راج محل میں تمھیں یہاں کے مقابلے میں زیادہ محتاط ہو کے کام کرنا ہوگا۔“

”جو سرکار چاہیں گے، وہی ہوگا۔“ میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ مجھے حیرت تھی کہ ابھی تک کنور مہیش چندر نے رام لال یا ٹھاکر کی موت کے سلسلے میں مجھ سے کوئی بات کیوں نہیں کی؟ اگر وہ دونوں مہیش چندر ہی کے اشارے پر مجھے ٹھکانے لگانا چاہتے تھے تو مہیش کا رویّہ میرے ساتھ کچھ اور ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو مجھے مزید فتنے داریاں سونپ رہا تھا۔ اُسے مجھے پرکاش بھون سے باہر جانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔ تو کیا تارا کا خیال درست تھا کہ میرے قتل کی سازش میں شکنتلا اور جے پال کا ہاتھ ہے؟ میں نے کنکھیوں سے مہیش کی طرف دیکھا، وہ دوسرا گلاس ہونٹوں سے لگائے چسکیاں لے رہا تھا۔ پارو عجیب سی نظروں سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ ہماری نظروں کا تصادم کئی بار ہوا۔ میں نے بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

”تم اب جا سکتے ہو موہن داس! خیال رکھنا کہ تمھیں کسی وقت بھی راج محل جانے کا حکم مل سکتا ہے۔“ مہیش چندر نے نوٹوں کی ایک گڈی میری طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ عیش کرو۔“

”سرکار سلامت رہیں۔“ میں نے ہاتھ باندھ کے بار بار مہیش چندر اور پارو کو پرنام کیا اور اُلٹے قدموں واپس آگیا۔ جے پال ابھی تک اپنے کمرے میں نہیں آیا تھا۔ میں نے ہری داس کو دیکھنا چاہا لیکن ہری داس بھی اُس وقت غائب تھا۔ جے پال کے کمرے میں اس کے دونوں نائبین اونگھ رہے تھے۔ میں دھڑکتے دل سے مہیش چندر کے محل سے واپس ہونے لگا۔ میری رفتار خاصی سُست تھی۔



مہیش چندر نے مجھے پھر تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔ رات اُس نے میری ہلاکت کا اہتمام کیا تھا اور اب اُسے میری زندگی کی ضرورت تھی۔ گویا مہیش چندر نے میری زندگی کے آگے سپر ڈال دی تھی کیونکہ میری موت ناممکن ہوگئی تھی؟ یا یہ بھی کوئی تماشا تھا؟ کوئی چلتّر تھا؟ کیا وہ مجھے سانس لینے کا موقع دے کر لطف حاصل کرنا چاہتا تھا؟ اب راج دربار میں مجھے راجہ امر ناتھ کے ہاں اپنی بہادری اور ذہانت کا جادو جگانا تھا۔ مجھے ان راستوں سے تمام رکاوٹیں دُور کرنی تھیں۔ جو صاحب بہادر کنور مہیش چندر کے لیے منزل تک پہنچنے میں تاخیر کا باعث ہوتیں اور میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔ مہیش چندر نے میرے پَر قینچ کر لیے تھے۔ وہ میرے ماضی سے واقف تھا اور اُس نے دبے لفظوں میں میری بغاوت یا سرکشی پر ڈالی اور اس کے نتیجے کو تہہ تیغ کرنے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔ راستہ انھی خیالوں میں نہ جانے کتنا کٹ گیا۔ میں اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کون میرے پیچھے آرہا ہے؟ آج ہر حالت میں باغ جا کے کیچو کا سراغ لگانا چاہتا تھا۔ صرف کیچو ہی میری دادرسی کر سکتی تھی یا وہ ایک لمحہ کر سکتا تھا، وحشت کا ایک لمحہ۔ جو طوفان کی طرح آتا اور گزر جاتا تھا۔ وہ لمحہ جب خنجر کسی پر قبضہ کر لیتا ہے اور پستول حاوی آجاتا ہے اور انگلیوں میں سارے جسم کی توانائی آجاتی ہے۔ وہ لمحہ کسی وقت بھی آسکتا تھا۔ نہ اُس کے لیے کسی سازگار ماحول، کسی موافق فضا کی ضرورت تھی، نہ کسی منصوبے کی۔ بس انگلیوں کو زحمت دینی پڑتی۔

میں نے اپنا رُخ باغ کی طرف کر دیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میرے عقب میں کوئی موجود ہو۔ اصطبل کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ کچھ دُور اور بڑھا تو مجھے اپنے تعاقب میں کسی کے قدموں کی آواز صاف سُنائی دی۔ اس خیال سے کہ یہ آہٹ کہیں میرے پریشان اور وہمی ذہن کی بازگشت نہ ہو، میں نے دوبارہ پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔ وہ میرا وہم نہیں تھا۔ آہٹ واضح طور پر میرے کانوں کو ایذا پہنچانے لگی تھی۔ ممکن ہے پہلی بار میرے پلٹتے ہی وہ شخص اصطبل کی آڑ میں چھپ گیا ہو؟ اس وقت میں باغ کے سامنے والے میدان میں تھا۔ وہاں روپوش ہونے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ میں نے باغ میں جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور خود کو خطرے سے نمٹنے کے لیے پوری طرح آمادہ کر لیا۔ میں اپنی جگہ جم کے کھڑا ہوگیا اور میں نے دیکھا، کیچو کا ہیولا نمودار ہو کے مجھ سے کچھ فاصلے پر رُک گیا۔ اُسے دیکھ کر میرا دل اُچھل کے حلق میں آگیا۔ ”تم؟“ میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"ہاں ہیں، جمشید!" اس کے ہیولے نے مترنم آواز میں کہا۔ "رکو مت، قدم بڑھاتے رہو۔"

"میرے قریب آؤ کیچو!" میں نے بے تابی سے کہا۔ "میں پریشان ہوں، میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو اور مجھ سے اتنی مہربانی سے کیوں پیش آ رہی ہو؟ میری بہن یاسمن سے تمہارا کیا تعلق تھا؟ تم کیا ہو؟ مجھے صاف صاف بتاؤ میں تمہیں کیا سمجھوں؟"

"کسی دن بادل پھٹ جائیں گے۔" وہ نرم لہجے میں بولی۔

"میں تمہیں کیا سمجھوں؟" میں نے پھر کرب سے پوچھا۔

"اپنا دوست۔" اس کی آواز کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

"دشمن گھات لگائے بیٹھا ہے اور تم بادل پھٹنے کی بات کر رہی ہو؟ کسی دن میرا دماغ پھٹ جائے گا یا میں اپنا گلا خود گھونٹ لوں گا۔"

وہ تسلی کرتے ہوئے بولی۔ "خاموشی سے دیکھتے جاؤ۔"

"میں کیا کروں؟" میں بے قراری سے اس کے ہیولے کی طرف لپکا۔ ہیولا مجھ سے اور پیچھے ہو گیا۔

"آگے پیچھے دیکھ کے چلو۔" اس نے مختصراً کہا۔

"اور کیا کر رہا ہوں؟" میں جز بز ہو کے بولا۔ "میں بہت بدنصیب ہوں۔" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آواز بھرا گئی۔

"سنو۔ گھر جا کے آرام سے سو جاؤ، صبح کا انتظار کرو۔"

"صبح کا انتظار، شام کا انتظار، اچھے وقت کے انتظار میں کتنی ہی صبحیں اور شامیں گزر گئیں۔ ہر صبح اور ہر شام دہشت کا کوئی نہ کوئی پیغام لے کے آتی ہے" میں نے رقت انگیز آواز میں کہا۔ "تم میرا ایک کام کرو گی؟"

"کہو۔" وہ حلاوت سے بولی۔

"تم نے مجھ پر بڑے احسانات کیے ہیں، مجھے کئی بار موت کے منہ سے بچایا ہے، صرف ایک شخص میرا دشمن ہے۔ بس اسے میرے راستے سے ہٹانے میں میری مدد کر دو۔ اس کے بعد میں تم سے کوئی کام نہیں کہوں گا۔" میں نے اس کی منت کی۔

"ابھی نہیں جمشید۔ اس محل میں بہت سے سادھو اور پنڈت پجاری آتے رہتے ہیں۔ ابھی وقت نہیں آیا۔"

"صبح بھی ایک پنڈت گھر میں آیا تھا۔" میں نے الجھ کر کہا۔

"آشرم میں اور بھون کے باہر کئی پنڈت موجود ہیں۔"

"اور وہ سب مہیش چند کے قبضے میں ہیں۔ مہیش چند اُن کا بڑا مان کرتا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"چپ رہو اور آہستہ بولو۔" وہ سرگوشی میں بولی۔ "سنو صبح اگر کوئی بات ہو تو گھبرانا نہیں۔ سر جیت کی طرف اشارہ کر دینا۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں کیچو؟" میں تمام باتیں بھول گیا اور کیچو کے اس جملے سے حواس باختہ ہو گیا۔ "کھل کر بتاؤ تم کن پُراسرار باتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہو؟"

"کرچھے والا پنڈت بہت کچھ جان چکا ہے لیکن تم اپنی زبان بند رکھنا۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ تم اور پریشان کر رہی ہو۔"

"باقی باتیں خود سمجھنے کی کوشش کرو۔"

میں مضطرب ہو گیا۔ "کیا سمجھوں کیا نہ سمجھوں۔" میں نے اپنا ماتھا سکیڑ کے کہا۔ "بتا دو یہ پریشانیاں کب ختم ہوں گی۔ میں موت و زیست کی اس کشمکش میں کب تک اُلجھا رہوں گا۔ مجھے میرا انجام بتا دو۔ تاریکی میں مت رکھو۔"

"جو وقت گزر رہا ہے اسے گزرنا چاہیے۔ مرد بنو۔ جو کہا ہے اسے یاد رکھنا۔" کیچو نے نصیحت کی اور اس کا پُراسرار سایہ مجھ سے دُور ہونے لگا۔ میں نے جست لگانے کی کوشش کی کہ کیچو کے وجود کا راز بے نقاب کر دوں لیکن میں ارادے کے سوا کچھ نہیں کر سکا۔ میں اضطراب کے ساتھ اس کا ہیولا تاریکی میں مدغم ہوتے دیکھتا رہا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی پھر بھی میں دیر تک کھڑا رہا کہ شاید وہ دوبارہ نمودار ہو جائے؟ کیچو کے ہیولے سے بات کرنے کے بعد میرے ذہن کا غبار بڑی حد تک چھٹ چکا تھا۔ مجھے اپنا سینہ اور شانے بہت ہلکے محسوس ہوئے حالاں کہ کیچو کچھ اور خطروں کچھ اور فسادوں کی نشان دہی کر گئی تھی۔



کچھ ہونے والا ہے۔ یہ کچھ ہونے کا ادراک حساس آدمیوں کو مختلف کیفیات میں لے جاتا ہے۔ دل بولنے سا لگتا ہے۔ آنکھیں تڑپنے لگتی ہیں اور دماغ میں پرچھائیں تیرنے لگتی ہیں۔ یہ خواب ہی کی کوئی کیفیت ہے مگر خواب کی ایک کچی خام شکل— اور جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں اس مرض کا مریض تھا۔ لفظوں اور آنکھوں کی ایک ذرا سی تبدیلی مجھے محسوس ہو جاتی تھی اور میں بہت کچھ اخذ کرنے اور قیاس کرنے، عمارتیں بنانے اور عمارتیں ڈھانے کا کام کچھ زیادہ مستعدی سے کرتا تھا۔ ایسے شخص کے فیصلے بھی لمحوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ڈالی کواڑ میں میری راہ دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی دمک اٹھی۔ میں اس سے کوئی بات کر کے رات کی نیند حرام کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ کیچو نے کہا تھا کہ میں گھر جا کے آرام سے سو جاؤں۔ غلط کہا تھا یا صحیح کہا تھا لیکن میں آرام کی نیند لینے کے لیے بے قرار تھا۔ ڈالی کی حالت مجھ سے مختلف تھی۔ اُس بے چاری کو کوئی کیچو راستے میں نہیں ملی تھی۔ "کہاں سے آ رہا ہے شیرو؟"

"یوں ہی۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "ذرا کنور جی نے بُلایا تھا۔"

"کیا بولتا تھا مال زادہ؟" ڈالی تیوری چڑھا کر بولی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "کہتا تھا کہ اب مجھے خدمت کے لیے راج دربار میں بھیج دیا جائے گا۔"

"راج دربار میں؟ راجے پور کے راجہ کے ہاں؟" ڈالی حیرت سے بولی۔ "اور تو چلا جائے گا؟"

"اور میں کیا کروں گا؟"

ڈالی کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ "ارے شیرو!" کچھ توقف کے بعد وہ بولی۔ "اُس کے ارادے مجھے نیک معلوم نہیں ہوتے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہے۔ اس کے ارادے مجھے نیک معلوم نہیں ہوتے۔" میں نے منہ چڑا کر دُہرایا۔

"تو سچ کہتا ہے۔" وہ تاسف سے بولی۔ "بعض اوقات میرا دماغ بالکل کام نہیں کرتا۔"

"یہ گووا کھوپڑی سے نکال پھینک۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "اور سُن۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی جو تجھ سے کہہ دیا۔ ابھی حکم نہیں ملا ہے کسی وقت بھی مل جائے گا۔"

"اس سے پہلے ہی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کر۔"

"دیکھتی رہ کیا ہوتا ہے۔" میں نے بے فکری سے کہا۔ "یہ بتا تو گئی کہاں تھی؟"

"جاتی کہاں؟ جے پال نے منہ کالا کرنے کے لیے بُلایا تھا۔"

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرے گال پر زنّاٹے کا تھپڑ رسید کر دیا ہو۔ میں نے تڑپ کے ڈالی کا چہرہ دیکھا! اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ڈالی میری کیفیت سمجھ گئی۔ "دوسروں کی پیاس بجھانے کے سوا میرے پاس کیا دھرا ہے؟"

"اب اتنا ذلیل نہ کر ڈالی!" میں نے چیختے ہوئے کہا۔

"پھر تو یہ کیوں پوچھ رہا تھا کہ میں کہاں گئی تھی؟ کوئی مرد کسی عورت اور مجھ جیسی عورت کو بلائے گا تو اُس کا کیا کام ہوگا؟" وہ رو دینے والی آواز میں بولی۔

میں نے گھٹنوں میں سر دے لیا۔ مجھ میں ڈالی سے نگاہیں ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ زہر لولتی رہی۔ میں نے کچھ کھایا نہیں تھا۔ چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈالی میرے پاس روٹی لے کے آئی اور مجھ سے اصرار کرنے لگی کہ میں کچھ کھانا کھا لوں۔ میں نے انکار کیا تو اُس نے نوالے بنا بنا کے میرے منہ میں دینے شروع کر دیے۔ بھوک ہی مٹ چکی تھی۔ ڈالی نے جتنے لقمے منہ میں دیے، میں نے زہر مار کر لیے۔ میں نے اُس سے کچھ نہیں کہا۔ پانی پی کے میں نے مہش چندر کے نوٹوں کی گڈّی اس کی طرف پھینک دی۔ وہ اشتیاق سے انھیں گننے لگی اور کہنے لگی۔ "میں جانتی ہوں یہ ڈھیر سی رقم تجھے کس نے دی ہے۔ اب ہمارے پاس اچھا پیسہ ہو گیا ہے؟ تو سمجھتا ہوگا یہ حرام کی کمائی ہے مگر شیرو! اس سے زیادہ محنت کا پیسہ کسے نصیب ہوگا؟"

میں اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ نیند اب کوسوں دُور تھی۔ ڈالی اپنی چارپائی پر بیٹھی مجھے عجیب سی نظروں سے تکے جا رہی تھی۔ میں نے جماہی لیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا رات بھر میری چوکیداری کرے گی؟ سو جا بھاگیہ وان! کوئی دروازہ توڑنے کی کوشش کرے تو جاگ اُٹھنا۔ آج کی رات بھاری معلوم ہوتی ہے۔"

"شیرو! میں آج تیرے پاس سوؤں گی۔" ڈالی نے یہ جملہ اتنی برجستگی سے کہا کہ میں حیرت سے اُچھل پڑا۔ اس کے چہرے پر حسرت چھائی ہوئی تھی۔ آنکھیں گیلی تھیں۔

"دماغ چل گیا ہے تیرا۔" میں نے قدرے سخت لہجہ اختیار کیا۔ "چپ چاپ پڑی رہ گدّے کے پاس۔"

"تجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یہ ڈولے دیکھ کے مجھے اور ڈر لگنے لگا ہے۔" ڈالی نے سادگی سے کہا۔ "کیا میں تجھ سے کوئی جُدا چیز ہوں اور کیا ساتھ سونے کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے؟ گڈّا بھی تو سوتا ہے میرے ساتھ۔"

"چارپائی قریب کھینچ لے۔" میں نے اسے ٹالنے کی خاطر کہا۔ میں اُس کی گرمی برداشت کرنے کے مشکل امتحان میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔

ڈالی خاموشی سے اٹھی اور اپنی چارپائی کھینچ کے اس نے میری چارپائی سے ملالی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں ڈالی کے سر پر میرے پاس لیٹنے کا بھوت نہ سوار ہو جائے؟ مگر پھر مجھے بہت دیر تک اس کی آواز سنائی نہیں دی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ ڈالی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ میری پیٹھ کی طرف منہ کیے ہوئے تک رہی تھی۔ قریب ہی گڈّا بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے دونوں کے چہرے غور سے دیکھے۔ ان کی معصومیت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میں پلکیں جھپکائے بغیر ڈالی کو دیکھتا رہا اور وہ مجھے دیکھتی رہی۔ "نیند نہیں آ رہی ہے؟" میں نے سرگوشی سے پوچھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ڈالی!" میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "ایک ہی صورت نظر آتی ہے۔" وہ میری طرف متوجہ ہو گئی کہ "تو تیرے لیے بے عزتی کا ایک کھیل اور کھیل — تو کنور پرکاش چند کے ہاں اپنا رسوخ بڑھا لے۔" وہ کسمسانے لگی۔ "سنتی ہے" میں نے جھجک کر کہا۔ "اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں — پھر ہم آسانی سے باہر جا سکیں گے۔"

ڈالی کروٹیں بدلنے لگی۔



میں اور ڈالی رات دیر سے سوئے تھے۔ شاید کچھ دیر اور سوتے رہتے اگر دروازے پر پُرشور دستکوں کی آوازیں نہ ابھرتیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آنے والا دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھ سے پہلے ڈالی کی آنکھ کھلی۔ پھر اس نے گھبرا کے مجھے جھنجوڑا۔ آنکھوں میں نیند کا خمار باقی تھا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا صحن عبور کر کے دروازے پر پہنچا۔ پھر جیسے ہی دروازہ کھولا میری نظر سب سے پہلے جس شخص پر پڑی وہ جے پال تھا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کرچھے والا پنڈت بھی تھا۔ پنڈت کے علاوہ دو سنگین بردار سنتری بھی نظر آ رہے تھے۔ میرے ذہن کا بوجھل پن لمحوں میں دور ہو گیا۔ جے پال کے انداز سے تشدد عیاں تھا۔ اس کی بے رحم نگاہوں نے پُرتپاک انداز میں مجھے دیکھا۔ سنتریوں کی موجودگی اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ اب کے کچھ زیادہ ہی خطرناک اور اہم معاملہ ہے۔ میں ابھی صورتِ حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جے پال مجھے دھکا دیتا ہوا صحن میں آ گیا۔ اس کے پیچھے پنڈت اور سنتری بھی کواڑ میں آ گئے تھے۔ سنتریوں کے بعد دو مزدور کدال لیے اندر آئے۔ انھیں میں پہلے نہیں دیکھ سکا تھا۔ "موہن داس!" جے پال نے مجھے سخت نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "رات تم ہری داس سے آخری بار کب ملے تھے؟"

"ہری داس؟ چاچا ہری داس؟" میری زبان لڑکھڑا گئی۔ "کنور جی بہادر نے مجھے بلانے کے لیے اسے بھیجا تھا۔"

"اس کے بعد تمھاری مڈبھیڑ اس سے کب ہوئی تھی؟"

"دوبارہ وہ مجھے نہیں ملا۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ "کیا ہوا چاچا کو؟ کیا معاملہ ہے سرکار؟"

"سچ سچ بتا دے بالک!" پنڈت نے سرد لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

"میں سمجھ نہیں سکا مہاراج! آپ کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں کیا کہہ رہا ہوں یہ تو تجھے ابھی معلوم ہو جائے گا۔" پنڈت نے اپنا کرچھا گھماتے ہوئے کہا "سنبھل رہیے۔"

"بکواس بند کر۔ مہاراج کے منہ لگتا ہے نیچ! ابھی تیری معصومیت کا بھرم کھل جائے گا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟ میں تو تجھے دیکھ کے پہلی ہی نظر میں تاڑ گیا تھا۔" جے پال گرج کے بولا۔ پھر اس نے مزدوروں کو مخاطب کر کے کہا "چلو آگے بڑھو اور درخت کے چاروں طرف کا صحن کھود ڈالو۔"

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں جی؟" میں نے خفا ہو کے کہا۔ "میں کنور جی بہادر کا خاص سیوک ہوں۔"

"ہم کنور جی کو ان کے خاص سیوک کے کرتوت بتانے کی تیاری کر رہے ہیں۔" جے پال نخوت سے بولا۔

معاً میری نگاہ نیم کے درخت کی جانب اٹھی۔ وہاں کی زمین بھُربھُری نظر آ رہی تھی۔ مجھے پسینہ آ گیا۔ اب ہر بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس بار مجھے ختم کرنے کے لیے بہت طاقت ور دلیل ایجاد کی گئی تھی۔ نیم کے درخت کے اطراف زمین پر اُدھڑی ہوئی مٹی بکھری پڑی تھی۔ حالاں کہ رات گئے تک وہ زمین سپاٹ اور ہموار تھی۔ میں نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ جے پال مجھے خون خوار نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ ڈالی بھی گُنگ کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ پنڈت جے پال کے قریب کھڑا لکڑی کے دانوں کی مالا جپ رہا تھا۔ سنتری مجھ پر نظر رکھے ہوئے میرے دائیں بائیں زمین پر کسی ستون کی طرح نصب تھے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے سرکار؟" میں نے پھر ہمت کر کے جے پال سے پوچھا۔

"پاپی!" پنڈت درمیان میں بول پڑا۔ "مکتی چاہتا ہے تو سب کچھ صاف صاف بتا دے۔"

"کون سا پاپ؟ کچھ پتہ تو چلے"۔ میں نے عاجزی کے کہا۔

"موہن داس! ہمیں معتبر ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ تو نے رات ہری داس کا خون کیا ہے۔ اس کی لاش اصطبل کے قریب ملی ہے لاش کا سر غائب ہے لیکن ہم اسے تلاش کر لیں گے"۔

"کیا مالک"؟ جے پال کا الزام سن کے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا

"مالک ایسا انیائے؟" میں نے کانپتے ہوئے کہا میرے لہجے میں احتجاج تھا پھر میں خود ہی خاموش ہو گیا کہ کس کے آگے فریاد کر رہا ہوں۔ مجھے پھانسنے کے لیے دشمنوں نے بڑا گھناؤنا اور سنگدلانہ قدم اٹھایا ہے میں پھٹی پھٹی نظروں سے نیم کے درخت کی جانب دیکھنے لگا جہاں مزدور بڑے جوش وخروش سے کدالیں مار مار کے زمین کھودنے میں مصروف تھے۔ ہری داس کا سر برآمد ہو جانے کی صورت میں میرا بچنا ناممکن تھا میں خود کو زمین میں دھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اگر اس وقت مجھے کیچو کا خیال نہ آ گیا ہوتا تو میں بے ہوش ہو کے گر جاتا۔ گزشتہ رات کا ایک ایک واقعہ میری نظروں کی سطح پر گردش کرنے لگا۔

رات کیچو نے کیا کہا تھا؟ اس نے اشاروں میں کچھ کہا تھا اب اس کے مبہم اشارے میرے ذہن میں واضح ہو رہے تھے۔ کیچو نے کہا تھا صبح اگر کوئی بات ہو جائے تو گھبرانا نہیں سرجیت کی طرف اشارہ کر دینا اس نے یہ بھی کہا تھا کہ پچھے والا پنڈت بہت کچھ جان چکا ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کیچو کا اشارہ اس خونیں واقعے کی طرف ہے۔ کیچو کا دھیان آیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرا بازو پکڑ لیا ہو اور مجھے گرنے سے سنبھال لیا ہو، جیسے کسی نے میرے سر کے نیچے تکیہ رکھ دیا ہو، جیسے ہوا کا ایک تازہ جھونکا آ گیا ہو یا شدید پیاس میں مجھے دو گھونٹ پانی مل گیا ہو۔ میں نے اعتماد سے زمین پر دوبارہ قدم رکھے اور سوچا کیچو کے مشورے کے مطابق کیوں نہ جے پال کی توجہ سرجیت کی جانب مبذول کرا دوں اور جے پال سے جھوٹ بولوں کہ مجھے یاد آیا، مجھے یاد آیا کہ میں نے واپسی کے وقت ہری داس کو سرجیت کے ساتھ اس کے کوارٹر میں جاتے دیکھا تھا لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔ پھر ابھی میں اپنا اعتماد بحال کر رہا تھا کہ ڈالی کی آواز میرے کانوں میں گونجی "رحم کرو! رحم کرو!! یہ جھوٹ ہے بہتان ہے موہن داس کسی کو قتل نہیں کر سکتا"۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ڈالی جے پال کے پاؤں پکڑے ہوئے زار و قطار رو رہی تھی اور فریاد کر رہی تھی "تم سے کسی نے جھوٹ بولا ہے جے پال بابو! کچھ تو لحاظ کرو میری مانو، کسی دشمن نے موہن داس کو پھنسانے کی کوشش کی ہے"۔

"کنجری!" جے پال اسے حقارت سے دھتکارتے ہوئے بولا۔ "دور ہٹ کر بات کر، میں تجھے بھی خوب سمجھتا ہوں"۔

"دیا کرو بابو! ہم نردوش ہیں، کچھ اوپر کی طرف بھی دیکھا کرو"۔

"ڈالی!" اچانک میں نے ڈالی کو جھڑکتے ہوئے کہا "جب ہم نے کوئی پاپ نہیں کیا تو پھر تو بنتی کس کارن کر رہی ہے؟ جا اندر جا کے گڈے کے پاس بیٹھ، شور مت مچا"۔

"ساپراددھی!" پنڈت میرا رنگ بدلتے دیکھ کر مشتعل لہجے میں بولا۔ "تو منش کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے پر تو ایشوری لال کو چھل نہیں دے سکتا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونے میں دیر نہیں لگے گی"۔

جے پال اور پنڈت ایشوری لال جو منہ میں آیا، کہتے رہے۔ میں نے زبان بند کر لی تھی۔ مزدوروں نے صحن میں اچھا خاصا گڑھا کھود ڈالا، لیکن وہاں سے ہری داس کا سر برآمد نہیں ہو سکا جے پال بار بار وضاحت طلب نظروں سے کبھی پنڈت کو اور کبھی سنتریوں کو دیکھتا تھا۔ پنڈت اب کسمسانے لگا تھا اور سنتریوں کے چہرے زرد پڑنے لگے تھے میرے کوارٹر کے باہر دوسرے ملازم بھی جمع تھے، ہری داس کے قتل کو اچھی خاصی شہرت دی گئی تھی اب مجھے کیچو کے وجود پر اعتبار آ چلا تھا اور یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ کیچو کی پراسرار قوت مجھے ضرور بچا لے گی جے پال کے انداز و اطوار میں رفتہ رفتہ جھلاہٹ آتی جا رہی تھی۔ سارا صحن کھود کے تباہ کر دیا گیا تھا۔ اچانک اس نے سنتریوں کو قہر آلود آواز میں کھدائی بند کرنے کا حکم دیا۔ پنڈت ایشوری لال کی نظروں میں میرے لیے حیرت ہویدا تھی۔ میرا دل چاہا کہ جے پال سے کچھ تلخ و تند مکالموں کا تبادلہ کروں اور اس سے پوچھوں کہ اس کے مخبر کون تھے؟ لیکن میری حیثیت ایک چھوٹے ملازم کی تھی اور جے پال ایک بڑا ملازم تھا مجھے خاموشی ہی میں عافیت نظر آئی۔ چھوٹے ملازموں کا یہی وتیرہ سب سے مناسب ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان کم سے کم استعمال کرتے ہیں اور کان ہمیشہ مستعد رکھتے ہیں محکومی اور حاکمیت کا ایک یہی فرق سب سے نمایاں ہے میں پریشان تھا کہ کس طرح کیچو کے مشورے کے مطابق جے پال کی توجہ ڈرائیور سرجیت کی طرف مبذول کراؤں۔ میں خود کہہ چکا ہوں کہ میں نے ہری داس کو واپسی کے راستے میں نہیں دیکھا تھا۔ پھر میں نے ہمت کر ہی لی۔ میں نے جے پال سے کہا۔

"سرکار! میں آپ سے ایک خاص بات کرنا چاہتا ہوں"۔

"کہو"۔ جے پال نے تحکمیہ انداز میں کہا۔

"صرف آپ سے سرکار، شما کیجیے، آپ کو تکلیف ہو گی"۔

جے پال نے جز بز ہو کے پنڈت ایشوری لال کی طرف دیکھا "سب کے سامنے کیوں نہیں کہتے؟" وہ سختی سے بولا

"آپ ہی سے کہنے کی بات ہے"۔ میں نے عاجزی سے کہا۔

"بکو"۔ جے پال ایک طرف آتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "جے پال بابو! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں، پر آپ کو میرا نام چھپانا ہو گا، ورنہ میں مفت میں مارا جاؤں گا"۔

جے پال کا تجسس بڑھ گیا تھا۔ "بکتے کیوں نہیں؟ ہم تمہارا نام کہیں نہیں لیں گے، تم نے کچھ دیکھا ہے تو صاف صاف بیان کرو"۔

"سرکار! میں نے سرجیت کے ڈر سے اس کا نام نہیں لیا تھا۔ میں کسی جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا"۔ میں نے بہت آہستگی سے کہا۔ "رات میں نے ہری داس کو سرجیت کے ساتھ دیکھا تھا۔ میں کنور بہادر کے سامنے ہی یہ بات بتا دینا چاہتا تھا مگر میرے لیے آپ ان سے کم نہیں ہیں۔ میں تو آپ کو بھی اپنا کنور ہی سمجھتا ہوں"۔ کنور کا نام میں نے دانستہ لیا تھا۔ جے پال کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔ کہنے کو تو یہ بات میں نے رازداری سے







ڈنیا کی مشہور ترین گھڑی
جسے باوقار اور صاحبِ حیثیت
لوگ پہنتے ہیں اور فخر کرتے ہیں

اورینٹ

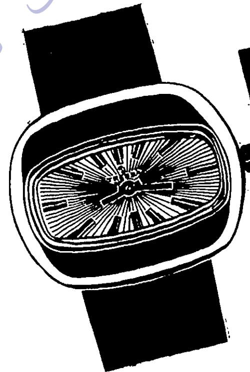
قیمتی وقت کے ۲ قیمتی ساتھی ـ اورینٹ اور ٹریسا

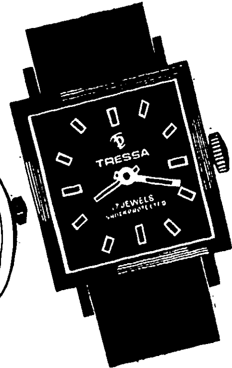


TRESSA

سوئٹزرلینڈ میں لیڈیز گھڑیوں
کے اسپیشلسٹ
ہر سال نئے موڈرن ماڈل

ٹریسا





ہر سال نئے فیشن کے نت نئے ماڈل

جے پال کے گوش گزار کر دی لیکن مجھے اپنی حماقت کا فوراً احساس ہو گیا کہ جے پال یا پنڈت ہی نے میرے خلاف یہ سازش مرتّب کی ہے۔ ایسی صورت میں وہ بھلا سرجیت کو کیوں اس معاملے میں گھسیٹیں گے؟ مجھے سب کے سامنے سرجیت کا نام لینا چاہیے تھا' اتنی زور سے کہ باہر کھڑے ہوئے دوسرے ملازمین بھی سن لیں۔

میری بات سن کے جے پال پنڈت الیشوری لال کے پاس گیا اور اسے الگ لے جا کے آہستگی سے باتیں کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پنڈت کو میرے ہی بارے میں بتا رہا ہے کہ میں نے اس سے کیا کہا ہے ــــــــ چنانچہ میں نے کسی قدر تیز آواز میں پنڈت کو مخاطب کیا۔ "مہاراج! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے سرجیت کو دیکھا تھا۔ میری ان گنہگار آنکھوں نے۔ آپ ان سے پوچھیے تو سہی۔ ہری داس سے تو مجھے بہت محبّت تھی۔ میں اُسے چاچا کہتا تھا اور وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ اور گڈّے کے لیے اکثر مٹھائیاں لاتا تھا۔ میں اُس بوڑھے کو مار کر کون سی جائداد حاصل کرتا۔"

میری تیز آواز پر جے پال نے ناراضی سے منہ بنایا۔ ابھی ابھی میں اس سے رازداری کی درخواست کر رہا تھا اور اب میں نے سرجیت کا نام برسرِ عام لے دیا تھا مگر اس نے اسے میری وحشت سمجھ کے نظر انداز کر دیا۔ میں نے دیکھے بھی اس موقع پر ہزاروں بے سروپا جملے کہے تھے۔ ان دونوں نے کوئی مشورہ کیا۔ پنڈت نفی میں سر ہلا رہا تھا اور جے پال اسے سمجھا رہا تھا' ان دونوں میں کیا طے ہوا؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ البتّہ وہ دھمکیاں دیتے ہوئے کوارٹر سے چلے گئے۔ میں نے بھی ان کے پیچھے جانا چاہا۔ مگر ڈالی نے میرا کرتا پکڑ لیا۔ "مجھے جانے دے ڈالی! مت روک۔ کسی بات کی فکر مت کر۔" میں اپنا کرتا چھڑا کر باہر نکل گیا۔ جیسے ہی میں باہر آیا۔ دوسرے ملازم مجھ پر سوالوں کی بوچھار کرنے لگے۔ میں نے ان سب کی توجّہ سرجیت کے کوارٹر کی طرف مبذول کر دی۔ یہ سارا قافلہ کوارٹروں کی تیسری لائن کے درمیانی کوارٹر تک پہنچ کے رک گیا۔ سرجیت کے کوارٹر میں جے پال' دونوں سنتری' پنڈت اور مزدور چلے گئے۔ میں نے اور دوسرے ملازموں نے اندر جانے کے لیے ہاتھ پیر مارے مگر ہمیں باہر ہی روک دیا گیا۔ ہم سب جھریوں سے اندر جھانکنے اور دروازے سے کان لگائے اندر کی سن گن لینے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے کدال چلنے کی آواز آنے لگی اور پھر اچانک سرجیت کی چیخیں سنائی دیں۔ دوبارہ دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔ ایک مزدور کے ہاتھ میں ہری داس کا خاک و خون میں لتھڑا سر تھا۔ دونوں سنتریوں نے سرجیت کے ہاتھ میں زنجیر ڈال دی تھی اور وہ اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ وہ وحشت زدہ انداز میں سر جھٹک رہا تھا۔ ہری داس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں' یہ منظر ایسا لرزہ خیز تھا کہ جے پال نے اشارے سے ہری داس کے کٹے ہوئے سر پر کپڑا ڈالنے کا حکم دیا۔ جے پال کی حالت بڑی ابتر تھی۔ پنڈت الیشوری لال کا سر بھی جھکا ہوا تھا۔ وہ اتمامِ حجّت کے لیے سرجیت کے کوارٹر میں گئے ہوں گے' صرف خانہ پُری کے لیے' ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ ہری داس کا سر وہاں سے برآمد ہو جائے گا۔ اسی لیے تو وہ بے جھجک اس طرف چلے گئے تھے۔

میں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھا کہ ابھی مطلع صاف نہیں ہوا ہے' سرجیت بے قصور ہے' قتل تو کسی اور نے کیا ہو گا۔ یا ممکن ہے سرجیت ہی نے قتل کیا ہو اور کچھو نے اسی لیے اس کا نام لیا ہو مگر میرے مخالفین بہت سی دلیلیں میرے خلاف تراش سکتے ہیں۔ اب کچھ بھی ہو' میں نے اپنے دل کو تسلی دی کہ کم از کم پنڈت الیشوری لال' جے پال اور کنور مہیش یا میرے کسی اور مخالف کو اس حقیقت کا علم تو ہو ہی گیا ہو گا کہ مجھے مارنا آسان کام نہیں ہے۔ میں اگر سرجیت کا ذکر نہ کرتا تو کیا کرتا؟ کیا میں اپنی گردن پر چھری رکھی رہنے دیتا؟

بہر حال اب ملازموں کے سامنے سرجیت کو زد و کوب کیا جا رہا تھا۔ دونوں سنتری شکاری کتّوں کی طرح سرجیت پر پل پڑے تھے اور انھوں نے پل بھر میں اسے لہولہان کر دیا تھا۔ تمام ملازمین خاموش تماشائیوں کی حیثیت سے یہ کھیل دیکھ رہے تھے۔ راستے میں بھی سرجیت کو ٹھوکروں اور لاتوں سے مارا جا رہا تھا۔ اس سے میرے اس شبہے کو تقویت پہنچی کہ سرجیت کی زبان بند رکھنے کے لیے اُسے کوئی مہلت نہیں دی جا رہی ہے۔ حالانکہ اُسے اپنی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ ویران آنکھوں سے اپنے اردگرد کے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس موقع پر میں جان بوجھ کر جے پال کے قریب پہنچا اور میں نے ہمّت کر کے دبی زبان میں اُس سے پوچھا۔ "میرے لیے اب کیا حکم ہے سرکار؟"

اس نے نفرت سے منہ بنایا۔ "تم اپنی ڈیوٹی پر جا سکتے ہو۔"

"بھگوان بابو کو خوش رکھے۔" میں نے چپکے سے وہاں سے چلے آنے ہی میں عافیت سمجھی اور جے پال کا حکم سن کے دل ہی دل میں کچھو کا شکریہ ادا کرتا ہوا اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ اس حادثے کے صرف ایک گھنٹے بعد مجھے ایک نئی اطّلاع ملی۔ مہیش چندر نے سرجیت کو ہری داس کا قاتل قرار دیتے ہوئے اُس پر گولی چلوا دی تھی۔ ہری داس کے ساتھ سرجیت کی موت بھی آ گئی تھی۔ گویا دوسرے ہی دن دو اور آدمی قتل ہو گئے تھے۔

ڈالی کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کر کے میں شاردا کے پاس اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے پہنچا۔ شاردا کے چہرے کے تاثرات غمازی کر رہے تھے کہ وہ کسی شدید ذہنی الجھن میں مبتلا ہے۔ میں جس وقت اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ پائیں باغ کی سمت کھلنے والی کھڑکی کے قریب خلا میں گم شدہ ستارے ڈھونڈ رہی تھی۔ اس نے گلابی رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ساڑی کا رنگ کیا ہے اور خود اس کا رنگ کیا ہے۔ اُس وقت مجھے اپنا وزن کچھ کم محسوس ہو رہا تھا اور طبیعت میں ہلکی ہواؤں جیسی نرمی اور سبک خرامی تھی۔ میری آہٹ پر وہ اس طرح چونکی جیسے کسی

خواب سے اچانک بیدار ہوگئی ہو۔ وہ درد و کرب کی تصویر بنی ہوئی تھی آنکھوں میں شبنم، چہرے پر دھوپ اور انداز میں خزاں۔ میری آمد پر اس کے ہونٹوں پہ ایک بے جان سی مسکراہٹ اُبھری۔ کھڑکی سے ہٹ کے وہ آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے شگفتگی سے پوچھا۔ "شاردا! آپ کچھ پریشان نظر آرہی ہیں۔"

"موہن! وہ گہری آواز میں بولی۔" وہ تمھیں مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ تمھیں جلد ہی کچھ سوچنا ہوگا۔"

"لیکن کیا ایسی آسانی سے وہ مجھے آپ سے چھین لیں گے؟"

"یہ خونی لوگ ہیں، ان کے دل پتھر کے ہیں۔"

"کوئی نئی بات کیجیے۔"

"تم نے کیا سوچا ہے؟ مجھے بتاؤ، کیا تم میری باتوں کی بس یوں ہی تائید کردیتے ہو کیونکہ تم ایسا کرنے پر مجبور ہو۔" شاردا کبیدگی سے بولی۔

"آپ کیا سمجھتی ہیں؟"

"یہ تم مجھے آپ کیوں کہتے ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے بہت دور سے بول رہے ہو اور میرے تمھارے درمیان کوئی بہت بڑی دیوار ہے۔"

"آپ کو آپ سے مخاطب کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔"

"لیکن مجھے قطعاً اچھا نہیں لگتا۔"

"چلیے آپ کی خاطر میں تم کہنے لگوں گا۔ یہ بتایئے آج آپ۔" مجھے خیال آگیا اور میں نے مسکراتے ہوئے ترمیم کی "آج تم اتنی اداس کیوں ہو؟"

"تم اداسی کی وجہ پوچھ رہے ہو جیسے تمھیں خود کچھ نہیں معلوم۔ بس آج ہی یہاں سے باہر نکلنے کا پروگرام بنالو ورنہ اس حبس میں کسی دن تم میرے متعلق کوئی ایسی خبر سن لوگے جو یہاں عام ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"ارے شاردا! تم تو بالکل بچی بن گئی ہو۔ یہاں سے نکلنا بہت آسان ہے جس دن بھی میں مناسب سمجھوں گا تمھیں ایک لمحے کے لیے بھی یہاں نہیں ٹھیرنے دوں گا۔" میں نے بزرگ لہجے میں کہا۔

"اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس وقت تک وہ تمھیں....."

اس نے اپنی زبان سی لی۔

"میں تمھیں اپنی زندگی کی ضمانت دیتا ہوں۔" میں نے شوخی سے کہا

"نہیں، تم مجھ سے خوف زدہ ہو کہ کہیں میں تمھارے لیے عذاب نہ بن جاؤں۔ تم سوچتے ہوگے کہ میں ایک بڑے گھر کی لڑکی ہی رہوں گی، بدل نہیں سکتی اور یہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں، صرف جذبات کا عارضی ابال ہے۔" وہ جذبات سے پُر آواز میں بولی۔ "تم کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ تم ایک شریف اور سادہ آدمی ہو مگر تم مجھے یہاں سے لے چل کے تو دیکھو، میں تمھارے ساتھ جھونپڑی میں رہ لوں گی، اُف تک نہ کروں گی۔"

میں اُس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ جس پر ہر جگہ میرا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں صرف میری تصویر تھی۔ میں اپنی تصویر دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا۔ میری شوخی سنجیدگی میں بدل گئی۔ میرے سامنے ایک حسین و جمیل لڑکی بیٹھی تھی اور اس

کے سامنے کون شخص کھڑا تھا؟ جس کے لیے زمین تنگ تھی۔ میں تمھیں کس طرح بتاؤں شاردا کہ میں خود یہاں ایک پل رُکنا نہیں چاہتا لیکن جانے کے لیے یہ وقت موزوں نہیں ہے۔ قتل و خون کے اس موقع پر ہم یہاں سے فرار ہوگئے تو تمام الزامات ہم پر عائد ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ہیں ــــ تم نہیں سمجھتیں ــــ جس دن کنور صاحب نہیں ہوں گے، یا یہاں کوئی تقریب ہوگی اور باہر ہمارے لیے تیزی سے آگے بڑھنے کا کوئی معقول ذریعہ ہوگا تو ہم فوراً ان کی رسائی سے دور چلے جائیں گے۔ سمجھ رہی ہو؟ بہت سی باتیں سوچنا پڑیں گی۔ میں تمھاری انگلی پکڑ کے بڑے دروازے سے گزر کے اور سنتریوں کے سامنے سینہ پُھلا کے نہیں جاسکتا ـ تمھاری قربت میری زندگی کا حاصل ہے۔ مجھے اپنی اس خوش بختی پر یقین نہیں آتا۔"

"اور مجھے اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آتا کہ کوئی شخص کبھی پرکاش بھون میں آئے گا جو میرے خوابوں اور خیالوں جیسا ہوگا۔ غریب، پڑھا لکھا، باہمت، حوصلہ مند۔" وہ جوش سے بولی۔ "اگر تم نہ آتے تو میں بھی یہیں کی غلاظت میں کہیں گر جاتی۔"



کی بکریاں ایک کسان کے کھیت میں گھس گئیں کسان اس وقت موجود نہیں تھا۔ بکریوں نے مطلع صاف دیکھ کر کھیت کا کچھ حصّہ چر لیا۔ ابھی وہ چر ہی رہی تھیں کہ کسان واپس آگیا۔ اسے بے حد غصّہ آیا کیونکہ اس کی گزر بسر کا دار و مدار اسی کھیت پر تھا۔ اس نے زمیں دار کے پاس پہنچ کے فریاد کی کہ "آپ کی بکریوں نے میرا نقصان کر دیا ہے۔ بتایئے اب میں کیا کروں؟"

"کرنا کیا ہے؟" زمیں دار نے تحمل سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نقصان کا معاوضہ لے لو۔ کتنا نقصان ہوا ہے تمھارا؟"

"پچاس رُپے سے کم تو کیا ہوا ہوگا۔" کسان نے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔

زمیندار نے فوراً پچاس رُوپے اس کی نذر کردیے۔ کسان شکریہ ادا کرکے لوٹ آیا۔

چند روز بعد جب کھیت پک گیا اور فصل کٹ کے بکنے کے لیے منڈی پہنچی تو اتفاق سے اس کی بہت اچھی قیمت مل گئی۔ نہ صرف یہ کہ محنتانہ وصول ہو گیا اور لاگت پوری ہوگئی بلکہ معقول منافع بھی حاصل ہوا۔ کسان ایک ایمان دار آدمی تھا۔ وہ زمیں دار کے پاس گیا اور اس کے پچاس رُوپے لوٹاتے ہوئے کہنے لگا۔ "اپنی رقم واپس لے لیجیے کیونکہ مجھے توقع سے زیادہ فائدہ ہوگیا ہے۔"

زمیں دار نے پچاس رُوپے لیے پھر اس میں مزید پچاس رُوپے ملائے اور کسان کو سو رُوپے دیتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ نقصان کا معاوضہ نہیں ہے تمھاری دیانت داری کا انعام ہے۔ لے لو، انعام لینے سے انکار نہیں کرتے۔"



سفر کے دوران میں کشتی بُری طرح ہچکولے کھانے لگی۔ مسافر خوف زدہ ہو گئے۔
ایک شخص نے ملّاح سے کہا "کشتی بہت ڈگمگا رہی ہے، میرے اوسان خطا ہوتے جا رہے ہیں۔ کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟"
"نہیں جناب!" ملّاح نے اطمینان کے ساتھ چپّو چلاتے ہوئے بے پروائی سے کہا "کوئی خطرہ نہیں ہے، میری کشتی بیمہ شدہ ہے۔"

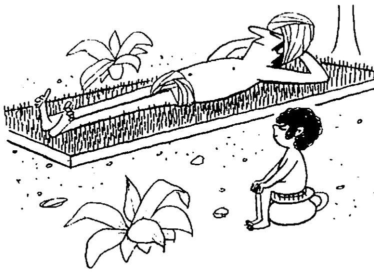
"مگر اب میں آ گیا ہوں۔"
"دیکھو موہن! یہاں کے حالات روز بروز خراب ہو رہے ہیں ـــ کل ہری داس اور سرجیت، آج کوئی اور..... یہ کاش بھون میں ہر طرف سازشیں اُگ رہی ہیں۔ کسی وقت بھی، کوئی بھی اندھیرے میں چلنے والی کسی گولی کا نشانہ بن سکتا ہے۔" شاردا نے آج طے کر لیا تھا کہ وہ مجھ سے ہر معاملے پر کھل کر گفتگو کرے گی۔
"کیا سرجیت اور ہری داس کا انجام بھی کسی سازش کا نتیجہ تھا؟" میں نے اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لیے پوچھا۔
شاردا تڑپ کے کھڑی ہو گئی۔ "میری دل جوئی کے لیے جھوٹ سے کام نہ لو موہن! مجھے اطلاع مل چکی ہے کہ جے پال اور اس کے آدمیوں نے تمھارے کوارٹر کا رخ کیا تھا۔ وہ تمھیں ہر قیمت پر راستے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔"
"تمھارا کیا خیال ہے شاردا!" میں نے زہرخند سے کہا "کیا میں اتنا اہم شخص ہوں کہ مجھے مارنے کے لیے سر جوڑ کر مشورے کیے جائیں؟ سازشوں کا جال بُنا جائے؟ تم میرے بارے میں پریشان ہونا چھوڑ دو۔ تمھاری صحت ان غیر متعلق باتوں سے متاثر نہیں ہونی چاہیے۔"
"کیا میں ان باتوں سے علیحدہ رہ سکتی ہوں؟" شاردا میرا جواب سُن کے جذباتی ہو گئی "جب کہ تمھاری ذات بھی اس میں ملوّث ہے، جواب دو موہن! میرا تمھارا کیا تعلق ہے؟"
"ہری داس کی موت کا مجھے بے حد دکھ ہے، وہ بے چارہ مفت میں مارا گیا۔" میں نے دیدہ و دانستہ شاردا کا اضطراب نظر انداز کیا اور کہا "وہ بڑا ملنسار اور نیک شخص تھا۔"
"موہن!" شاردا جھنجلا گئی۔ "کیا میں تم سے کوئی بات نہ کروں؟"
"تم بھی بات کرنا چھوڑ دو گی تو پھر میں کہاں رہوں گا؟ تم ہی نے تو زندہ رکھا ہے۔"
"میرے دل پر جو بیت رہی ہے، اسے شاید تم محسوس نہیں کر رہے ہو۔"
"شکنتلا اس حد تک میری جان کی لاگو ہو جائیں گی، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" میں نے لو اسی سے کہا، پھر جوش میں بولا "شاردا تمھیں کس بات کی فکر ہے؟ کنور مہیش چندر تمھارے سگے بھائی ہیں۔ تمھارا ایک اشارہ تمھارے دشمنوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر سکتا ہے۔" میں نے دانستہ دوبارہ یہ ذکر چھیڑا۔
"نہیں موہن!" وہ چیختی ہوئی بولی "بات اگر صرف شکنتلا کی ہوتی تو مجھے کوئی دکھ نہ ہوتا لیکن......"
"لیکن کیا شاردا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔ شاردا کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اُسے مہیش کے عزائم کا علم ہو گیا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ مہیش کے بے نقاب ہو جانے کے بعد اس کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے؟ مہیش چندر یا میں؟ یہ شاردا کی آزمائش کا لمحہ تھا۔ میں امید و بیم کی کیفیتوں سے دوچار ہو گیا۔ شاردا ابھی پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اس نے میرے سوال کے جواب سے گریز کرنے کی کوشش کی۔ کچھ دیر اپنی پریشان سوچوں میں ڈوبی رہی پھر جب اُس نے سوچوں سے سر ابھارا تو حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "موہن! کچھ نہ پوچھو، بس مجھ پر وشواس کرو۔ میں تم سے کوئی بات پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کروں گی یہاں سے کہیں دور چلو۔ پہاڑوں میں، گپھاؤں میں، جنگلوں میں یا کہیں اور....."
"تم کچھ چھپا رہی ہو، اپنے موہن سے چھپا رہی ہو؟"
"میں بہت مجبور ہوں۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔"
"ٹھیک ہے مجھے روشنی نہ دکھانے میں کوئی مصلحت ہے تو یوں ہی سہی، میں تمھیں مجبور نہیں کروں گا۔" میں نے بے بسی سے کہا۔
"میں اس وقت مجبور ہوں تمھیں کچھ نہیں بتا سکتی۔"
"تمھاری مجبوری کسی کی موت کا سبب بن سکتی ہے، ورنہ میں اندھیرے میں مارا جاؤں گا۔" میں نے برجستہ کہا۔
"موہن!" شاردا تیزی سے اٹھ کے میرے سینے سے چمٹ گئی۔ "میں تمھیں اس کا نام بتا سکتی ہوں لیکن وچن دو کہ تم وہ نام کبھی اپنی زبان پر نہیں لاؤ گے اور انتقام کی کسی بھی کارروائی سے پہلے مجھ سے مشورہ کرو گے۔"
"میں کیا وعدہ کروں۔ کیا وہ دشمن تمھیں مجھ سے زیادہ عزیز ہے؟" میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔
"آہ موہن! تم کیوں کچوکے لگاتے ہو۔ میرا اندازہ صحیح ہے، تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے اور میری بدنصیبی اپنی جگہ قائم ہے۔ میں اس دشمن کا نام بتائے دیتی ہوں تاکہ تم کبھی مجھ سے شکوہ نہ کر سکو۔ تمھارا دشمن میرا بھائی مہیش ہے۔" شاردا جذباتی انداز میں یہ کہہ کے دھڑام سے کرسی پر گر گئی اور تھکے ہوئے لہجے میں کہنے لگی "رام لال اور ٹھاکر کو بھی شکنتلا نے نہیں، مہیش نے تمھارے پیچھے لگایا تھا۔ ہری داس کو سرجیت کے ذریعے قتل کرا کے تمھیں پھانسنے کی سازش کی گئی تھی۔ مجھے اب سب کچھ معلوم ہو گیا ہے موہن! میں بنتی کرتی ہوں کہ ان دیواروں سے جلد از جلد پھلانگ جاؤ۔ یہاں خون، خون کا دشمن ہو گیا ہے۔"
میں نے یہ نہیں پوچھا کہ کنور مہیش چندر خصوصی طور پر میرا دشمن کیوں ہو

گیا ہے؟ میں شاردا کو مزید الجھن میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سسکتی روتی ہوئی شاردا کے نزدیک جا کے اس کا سر اٹھایا اور اس کے بھیگے ہوئے رخسار اپنے میلے کرتے سے پونچھے، اس نے میرا کرتا چوم لیا۔ اسے آنکھوں سے لگایا۔ اس نے میرے ہاتھوں پر بے تحاشا بوسے دیے۔

اس وقت میرے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔



یکے بعد دیگرے میں خطرناک حملوں کا نشانہ بنتا اور صاف بچتا رہا۔ پھر کچھ سکون طاری ہو گیا۔ مہیش چندر کے ایک اشارے پر اس کے غلام دن کی روشنی میں بھی مجھے کوارٹر سے گھسیٹ کر قتل کر سکتے تھے، وہ مجھے زندہ گاڑ سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایسا اس لیے نہیں ہوا کہ کہ مہیش چندر پے در پے ناکامیوں کے بعد میرے بارے میں محتاط ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ پنڈت ایشوری لال بھی مجھے پھر پرکاش بھون میں نظر نہیں آیا۔ ممکن ہے اس نے مہیش کو معتدل رویّہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہو۔ یہ ستم ظریفی بھی خوب تھی کہ ادھر مہیش چندر مجھے مہاراج دربار میں ملازم ہونے کا حکم دے رہا تھا، ادھر مجھے کسی طور ختم کرانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ ان سانحوں سے مجھ پر جو گزری سو گزری مگر اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ملازموں میں مہیش چندر سے ایک عام بیزاری پائی جانے لگی — عابد شیرازی کا چہرہ بھی میں نے دوبارہ پرکاش بھون میں نہیں دیکھا۔ اس کی عدم موجودگی میں ساجدہ اور فیروز کا ربط ضبط کس شباب پر ہو گا؟ میں بیداری میں بیٹھے بیٹھے کبھی یوں ہی خواب دیکھا کرتا تھا، کبھی کلکتے، کبھی اپنے گھر، کبھی اپنے چچا جان کے ہاں، کبھی جارج کے ساتھ کلکتے کی گلیوں میں آوارہ گھوما کرتا، کبھی بانو کے کوٹھے پر چلا جاتا اور اس کی روتی آنکھیں دیکھتا رہتا۔ کبھی مجھے اپنے چچا زاد بھائی اور بہنیں یاد آتیں اور میرے ہاتھ پاؤں میں تشنّج کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ باہر کی دنیا ایک خواب تھی۔ چند دن خاموشی طاری رہی مجھے اندازہ تھا کہ یہ سکون لمحاتی ہے اور کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اس عرصے میں اتنا ضرور ہوا کہ مجھے سنجیدگی سے اپنے آیندہ دنوں کے متعلق سوچنے کا موقع مل گیا۔ آیندہ دن جو مہیش چندر کی زندگی اور موت سے مشروط تھے۔ میں نے اور ڈالی نے مہیش چندر کی موت کے کئی منصوبے بنائے لیکن مہیش کو ختم کرنا اس کے باپ کو راستے سے ہٹانے سے زیادہ دشوار تھا۔ ڈالی نے بھی مہیش چندر کے ہاں نتے نئے کپڑے پہن کے اور بن سنور کے رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مہیش چندر نے صرف ایک بار اسے توجّہ سے دیکھا، پاس بلایا، شراب کی بوتل منگوائی اس کے چٹکیاں بھریں، مذاق کیا، اس کا لباس اترو ایا اُسے ہر پہلو سے جانچا، اپنے پہلو میں بٹھایا مگر انگریز مہمانوں کی آمد نے ڈالی کو اس کے قریب نہیں ہونے دیا۔ ڈالی سے اس نے کہا کہ وہ پھر کسی وقت اُسے



بُلائے گا۔ مہیش چندر تک ڈالی بہت مشکل سے پہنچی تھی۔ مہاراج پرکاش چندر کی بات اور تھی۔ وہ شخص تو زندہ ہی عورتوں کے سبب سے تھا۔ مہیش چندر بہت مصروف آدمی تھا۔ ہر وقت اس کے ہاں مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا۔ راج دربار میں بھی اب اس کی آمدورفت زیادہ ہو گئی تھی۔ عموماً پارواتی اُس کے ساتھ ہوتی تھی، ڈالی کو وہاں زیادہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

مہیش چندر کو تنہائی کے موقعے کم ملتے تھے چنانچہ اُسے ختم کرنا بھی آسان نہیں تھا، بھائیوں اور بہنوں کے خوف سے اس نے اپنے نجی ملازموں کی تعداد بڑھا دی تھی، دروازے پر مسلّح سنتری اس طرح پہرا دیتے تھے جیسے کسی مہاراجہ کے سنتری ہوں۔ میں نے ادھر سے مایوس ہو کے اس کے چھوٹے بھائیوں سے رسم و راہ بڑھانی چاہی لیکن یہ ایک طویل مرحلہ تھا۔ میں اس درمیان میں شکنتلا سے بھی ملا اور میں نے باتوں باتوں میں مہیش چندر کے متعلق اس کے جذبات اُبھارے۔ وہ بھی اس سے برہم تھی اور اس نے بھی دوسرے بھائیوں سے روابط بڑھا لیے تھے۔ مہیش چندر کے خلاف ایک لاوا پک رہا تھا مگر اس میں اتنی شدت نہیں تھی کہ اُسے اُٹھا کر پرکاش بھون سے باہر پھینک دیا جاتا۔ پرکاش چندر کے باقی صاحب زادے شاید ناپختہ قسم کے تھے۔ انھیں رنگ رلیوں ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ مہیش چندر جب سے اس بھون کا سربراہ بنا تھا، روز نئی نئی خوب صورت عورتیں بھون میں نظر آنے لگی تھیں اور رقص و موسیقی کے جشنِ عام منائے جانے لگے تھے۔ میں نے شکنتلا کے علاوہ دوسری لڑکیوں اور رانیوں کی نظر میں بھی آنا چاہا مگر یہ سب کام ایک طویل اور شعوری عمل کے متقاضی تھے۔ ادھر ڈالی کی صحّت روز بہ روز گر رہی تھی اور شاردا کا اصرار بڑھ گیا تھا کہ میں یہاں سے بھاگ چلوں۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں مہیش چندر سے انتقام لینے کی ایک ہی صورت تھی کہ جزا و سزا کی پروا کیے بغیر اُسے شوٹ کر دوں، یا زہر دے دوں یا پھر مجھے کیچو کی طرف سے ——— کوئی امّید تھی کہ پرکاش چندر کی طرح وہ اس معاملے میں بھی میرا ساتھ دے گی۔ کیچو کا عتاب مہیش چندر پر کب نازل ہو گا اور میری خواہش کے باوجود ابھی کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ کاش میں یہ باتیں جان سکتا۔ میں تو ابھی کیچو کے پُراسرار سائے کے متعلق بھی کچھ نہیں

جانتا تھا۔ شاردا کے اصرار پر میں نے اس کا پستول اپنی حفاظت کے لیے پاس رکھ لیا تھا۔ پستول اپنی تحویل میں آنے کے بعد اسے استعمال کرنے کے لیے میرے ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگی تھی۔ بیک وقت کئی افراد کو گولی مارنے کے لیے طبیعت مچلنے لگی تھی۔ اگر بانو کا خیال نہ ہوتا اور شاردا کی بات نہ ہوتی ۔۔ ڈالی اور اس کا معصوم بچہ درمیان میں نہ ہوتا تو اتنی دیر نہ لگتی۔ ان سب نے مجھے بزدل اور نکما بنا دیا تھا۔ جتنے دن گزرتے جاتے تھے، مجھے اپنے طیش سے خود کو باز رکھنے میں مشکل پیش آنے لگی تھی۔



کئی روز گزر گئے۔ حیرت تھی کہ یہ دن کسی ہنگامے کے بغیر کیسے گزر گئے؟

دن گزر رہے تھے کہ ایک روز میرے دل کی مراد بر آئی۔ ایک خادمہ نے رات گئے مجھے اطلاع دی کہ پارو رانی نے طلب کیا ہے۔ پارو رانی کا نام سن کے میرے دل میں چراغ سے جل اٹھے۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی تھی کہ پارو سے کوئی رابطہ قائم کیا جاتے مگر ایسا ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ وہ ہمیشہ کی رازدار بھی تھی اور اس کی حیثیت پرکاش بھون میں ایک خوب صورت زہریلی ناگن سے کم نہیں تھی۔ اگر میں اس حسین ناگن کا زہر نکال کے اسے قابو میں کر لیتا تو میری مشکلات آسان ہو سکتی تھیں۔ میں نے احتیاطاً شاردا کا پستول اپنی داہنی پنڈلی پر ایک تسمے سے کس کر باندھ لیا اور قریب کا راستہ چھوڑ کے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ طویل راستہ اختیار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کم سے کم لوگ مجھے پارو کے محل تک جاتا دیکھ سکیں۔ قسمت مجھ پر مہربان تھی۔ راستے میں میرا ٹکراؤ کسی سے نہیں ہوا اور میں بآسانی اندھیرے میں تحلیل ہوتا ہوا پارو کے کمرے تک پہنچ گیا۔

اس وقت رات کے تقریباً ایک کا عمل تھا۔ شب خوابی کے باریک لباس سے پارو کا چاندنی بدن تھرکتی چکاچوند کر رہا تھا۔ پارو اپنے تمام عنفوانِ شباب سمیت، اپنی تمام امتیازی خصوصیات کے ساتھ، اپنے حسن کی تمام ہنر شناختوں کے ساتھ کمرے میں موجود تھی۔ اس کا ہلکا لباس ہولے سے اڑتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زمین پر نہ ہو، ہواؤں میں رقصاں ہو۔ کمرے میں خوابیدہ انگریزی موسیقی رچی ہوئی تھی۔ ہلکی نیلی روشنی کا بلب رنگ برنگے پردوں پر روشنی بکھیرتا شاعری کر رہا تھا اور پارو کا شباب نغمہ سرا تھا۔ میرے جسم میں کوئی گدگدی کرنے لگا۔ اس لمحے مجھے ایسا لگا جیسے میں ایک تار ہوں جس میں بجلی دوڑ رہی ہو اور میرا سوئچ دبا دیا گیا ہو۔۔ پارو کا سنہرا بدن اور کمرے کا لطیف و نازک ماحول۔ پہلی بار، زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے کہ اسے یوں ہی گنوا دیا جائے۔ میں نے ایک بھرپور نظر سے اسے دیکھا، اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس نے لپک کر دروازہ بند کر لیا۔ پھر کوئی بات کہے بغیر میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچ کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔ یہ اس کی خواب گاہ تھی۔ خواب گاہ کا ماحول پہلے کمرے سے زیادہ مسحور کن تھا۔ وہاں زندگی کی ہر خوب صورت چیز موجود تھی اور سب سے نایاب چیز تو خود پارو تھی۔ کم سن۔ الھڑ، حسین، تیز و طرار، شوخ اور نپے تلے بدن کی۔ میں نے آج یہ جبر خود پر سرشاری مسلط کر لی تھی۔ شاید یہ ہمیشہ چند سے انتقام ہی کی ایک کیفیت تھی۔ پارو نے خواب گاہ میں داخل ہو کے وہاں کا دروازہ بھی بند کر لیا۔ پھر تمام کھڑکیوں اور دروازوں کے دبیز پردے اس طرح کھینچ دیے کہ ایک معمولی سی جھری بھی باقی نہیں رہ گئی۔ وہ بڑے زور و شور سے اہتمام کر رہی تھی۔ میں خاموش کھڑا پارو کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لیتا رہا۔ اتنی کم سنی میں وہ اتنی چھریلی اور تیز تھی۔ اس نے پہلی نظر میں مجھے پسند کر لیا تھا اور میرے گال پر طمانچہ مارتے ہوئے اس نے جو کچھ کہا تھا وہ مجھے اب تک یاد تھا، اس نے کہا تھا۔ ”ہم نے تمھیں پسند کر لیا ہے۔ ہم تمھیں اپنی مرضی کے مطابق سدھائیں گے، تمھیں سرکشی کا درس دیں گے، تمھیں اچھے اور قیمتی لباس پہنا کے اپنے استعمال کے قابل بنائیں گے۔“ آج اس کا جانور اس کے سامنے تھا اور اس کی تربیت حاصل کرنے، سرکشی کرنے اور اس کے ہاتھوں سے لباس پہننے کے لیے تیار تھا۔ سرکشی کا ہر محرک موجود تھا۔ یہ رات، یہ خواب گاہ، یہ ہلکی روشنی، موسیقی، نرم و گداز بستر اور خود پارو، جو ایک حسین لڑکی تھی اور اس کے بدن پر باریک لباس تھا اور میں تھا جس کے دل میں مختلف قسم کے جذبے بیدار تھے۔ میں خود پر مشکل سے قابو پا رہا تھا۔ پردے ٹھیک کرنے اور ایک نظر کمرے پر ڈالنے کے بعد پارو نے شیلی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”موہن داس! ہم کئی دن سے سوچ رہے تھے کہ تمھیں بلایا جائے۔“

”میں سمجھا تھا سرکار شاید نوکر کو بھول گئیں۔“

”نہیں۔ تم بھولنے کی چیز نہیں ہو۔ تم ہمیں خوب یاد تھے۔“

”میری خوش قسمتی ہے۔“ میں نے احتیاطاً ادب سے کہا۔

”موہن داس! اتنی رات گئے ہم نے تمھیں اپنی خواب گاہ میں بلایا ہے، بتا سکتے ہو کیوں؟“

”سرکار! میرا کام سوچنا نہیں تعمیل کرنا ہے۔“ میں نے اپنا خشک حلق تر کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی کام ہوگا۔“

”کام کاج کے لیے یہاں ملازموں کی کوئی کمی ہے؟“ پارو نے ایک خاص ادا سے کہا۔ ”ہم نے تمھیں اپنے لیے منتخب کر لیا ہے۔ تمھیں اس روپ میں دیکھ کر ہمیں دکھ ہوتا ہے۔ ہم تمھیں جب بھی دیکھتے ہیں، تمھارے جسم پر کچھ چیزوں کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ ہم تمھارے گرد ایک فریم لگا دیتے ہیں۔ اس چوکھٹے میں تم کوئی شہزادے، کوئی راج کمار لگتے ہو، اس لیے ہم نے تمھیں پسند کر لیا ہے۔“

میں خاموشی سے سنتا رہا اور میں نے نیاز مندی سے گردن جھکا لی۔

”سنا تم نے۔ ہم کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم نے مستقل طور پر تمھیں اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کاش تم تعلیم یافتہ ہوتے۔“

”تو کیا ہوتا سرکار؟“ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

”تم دیکھتے کیا ہوتا۔ ہمیں بناؤ اور بگاڑ کے ڈراموں سے بڑی دل چسپی

ہے۔ ہم تمھیں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیتے۔"
"میں اب پڑھنا شروع کردوں گا۔" میں نے کسی بچے کی طرح کہا۔
"اوہ نہیں۔" وہ کھلکھلائی۔ "تم ہمارے لیے اب بھی ایک کلچرڈ، مکمل اور موزوں آدمی ہو، اچھا بتاؤ کیا ہم تمھیں پسند آئے ہیں؟" وہ اچانک بولی۔
"آپ۔ آپ؟" میں نے جھجک کر کہا۔ "آپ تو بہت سندر ہیں۔"
"صرف سندر؟" وہ استعجاب کے لہجے میں بولی۔ پھر اس نے بے باکی سے پوچھا۔ "موہن داس، تم کسی اتنی سندر عورت سے پہلے بھی ملے ہو؟"
"جی۔ جی۔ نہیں، کبھی نہیں۔" میں نے گھگھیا کے کہا۔ "میں عورتوں سے دور ہی رہا۔"
"کیا کسی کی نظر تم پر نہیں گئی؟" وہ حیرت سے بولی۔ "اوہ یہ سب جاہل ہیں ایڈیٹ۔ انھوں نے تمھیں نہیں بلایا؟"
"کسی نے بھی نہیں۔" میں نے معصومیت سے جواب دیا۔
"بہرحال ہم نے تمھیں بلایا ہے اور ہمارے بلانے کا کیا مطلب ہوتا ہے جانتے ہو؟" وہ وقار سے بولی۔
"نہیں۔ جی۔ بس۔ میں کیا کہوں؟" میں نے شرما کے کہا۔
"ہمارا مطلب ہے۔" وہ ایک جست میں قریب آگئی اور اس کی مہکتی زلفیں میرے شانوں پہ لہرانے لگیں۔ اس نے میری کمر کے گرد ہاتھ ڈال دیا۔ صرف ایک لمحے کو اس کے سرخ لب میرے چہرے کے سامنے نظر آئے پھر وہ تیورا کر مجھ سے دور ہوگئی۔ "ہم نے تمھیں اپنے من مندر کا راجہ بنا لیا ہے۔" اس نے دور بیٹھ کے اعلان کیا۔
"جی۔" میں نے کچھ سمجھنے نہ سمجھنے کے انداز میں کہا۔
"اب ہم تمھاری دنیا بدل دیں گے۔"
"آپ کیا چاہتی ہیں؟" میں نے سہم کر کہا۔
"ہم تمھیں اپنی ایڑیاں چاٹنے کا حکم دینا چاہتے ہیں۔" وہ سختی سے بولی۔ "ہم تمھیں سینے سے لگانا چاہتے ہیں اور ہم تمھیں وہ چیزیں دینا چاہتے ہیں جو تم نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔ وعدہ کرو کہ تم ہم سے وفادار رہوگے۔"
"مگر۔ مگر آپ؟" میں نے جلد سے جلد مطلب پر آنے کے لیے آگے کی باتیں پہلے کہنی شروع کردیں۔ پارو کے اطوار سے مجھے کم از کم کسی خطرے کا احساس ضرور ہوگیا تھا۔ شکنتلا نے اتنا وقت نہیں لیا تھا۔ اتنی طویل باتیں کرنے کا کوئی مقصد ضرور تھا۔ مجھے اب وہ مقصد جاننے کی جستجو تھی۔ چنانچہ میں نے ہر طرح کی رازداری، وفاداری کا عہد کرلیا کیونکہ میں اسی لیے یہاں آیا تھا۔
"سنو۔" پارو پھر تیزی سے میرے نزدیک آگئی۔ "لیکن ہم تمھاری وفاداری کا عملی امتحان لینا چاہتے ہیں۔" اس نے بے خیالی میں اپنے لباس کی ڈوری ڈھیلی کی اور میرے قدم ڈگمگانے لگے۔ میری خیرہ نگاہیں دیکھ کے وہ فوراً لباس درست کرنے لگی۔ ایک لمحے میں کوئی بجلی چمکی تھی، وہ معدوم ہوگئی۔ "اب پرکاش بھون میں تمھی سب سے زیادہ ہم سے قریب ہو۔"
"کیا مہیش چندر بہادر سے بھی زیادہ؟" میں نے جان بوجھ کر اس کا نام درمیان میں لیا۔
"ہاں اس سے بھی زیادہ۔" وہ تندی سے بولی۔ مجھے یہاں ایک نشیب نظر آیا اور میں پوری طرح مستعد ہوگیا۔
"یہ پاپ ہے سرکار پارو رانی!" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اگر کنور جی بہادر کو علم ہوگیا تو وہ مجھے زندہ جلا دیں گے میں نے ان کا نمک کھایا ہے۔"
"ہم تمھیں نمک حرام بننے پر مجبور کریں گے؟" پارو اچانک ناگن کی طرح پھنکارتے ہوئے بولی۔ "مہیش چندر نے بھی کسی کا نمک کھانے کے بعد نمک حرامی کی تھی اور تم نے بھی پرکاش چندر کا نمک کھایا تھا۔"
مجھے اپنا وجود ریت کے ٹیلے کے مانند کھسکتا ہوا محسوس ہوا۔ بہ مشکل تمام میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "آپ کچھ اور کہنا چاہتی ہیں؟"
"تم ذہین بھی ہو اور چالاک بھی۔ ہمیں یہ دیکھ کے خوشی ہوئی کہ اب تم نے ٹھیک انداز میں بات شروع کی ہے۔" پارو معنی خیز لہجے میں بولی "مہاراج کو ٹھکانے لگوانے کا منصوبہ ہم نے اور مہیش نے مل کر بنایا تھا۔ تم ایک مہرے کے طور پر استعمال کیے گئے تھے۔"
"میں مہیش چندر جی کے حکم سے انکار کرتا تو میرا انجام خطرناک ہوتا۔"
"یہی صورت پھر پیدا ہوچکی ہے موہن داس؟" پارو اچانک سنجیدہ ہوگئی۔ "اب اس بار ہم تمھیں براہ راست کوئی حکم دینا چاہتے ہیں۔ تم نے انکار کیا تو تمھاری لاش کا نشان تک مٹا دیا جائے گا۔ ہمارے اشاروں پر چلنے کی صورت میں تم ساری زندگی عیش کرسکتے ہو۔ ہمارے پاس حسن بھی ہے، دولت بھی۔"
میں مبہوت ہو کے اس کی صورت دیکھنے لگا۔ پارو تواتر سے مجھے دھمکیاں دے رہی تھی اور خوش آئند مستقبل کا یقین دلا رہی تھی۔ میں نے

اپنا لہجہ مضبوط کرنے کی ناکام کوشش کی۔ "مجھے کیا کرنا ہوگا؟" میرا دل دھڑک رہا تھا، قدرت نے مجھے جو موقع فراہم کیا تھا، میں اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے بے تاب تھا۔ حالات از خود مجھ پر مہربان ہو گئے تھے۔ جو راستہ میں اختیار کرنا چاہتا تھا، اس کی نشان دہی پارو کر رہی تھی چنانچہ میں نے بے معنی گفتگو سے پرہیز کیا۔

"میں فیصلوں میں دیر نہیں کرتی۔ میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ ہم ابھی فون کر کے مہیش کو خواب گاہ میں بلاتے ہیں۔ اس وقت وہ نشے میں دھت ہوگا۔ تم ہماری خواب گاہ میں چھپے رہو گے۔ جیسے ہی مہیش اندر داخل ہو، تمہیں اسے ٹھکانے لگا دینا ہوگا۔ سمجھے؟ اس کے بعد ہمارے بازو تمہارے ہوں گے، ہمارا بدن تمہارا ہوگا اور تم دیکھو گے کہ کیا کیا تمہارا ہوگا۔" پارو وارفتگی سے بولی۔

"مگر میرا انجام بہت برا بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "مہیش چندر جی کی لاش کا کیا بنے گا؟ جس خادمہ نے مجھے آنے کا حکم دیا تھا، وہ زبان کھول دے گی تو ہم دونوں پھانسی کے تختے پر ہوں گے۔"

"شش" وہ بے پروائی سے بولی۔ "تم کوئی چنتا مت کرو میری جان! ہم نے سارا بندوبست کر کے ہی تمہیں بلایا ہے۔ ہمارے زرخرید غلام کنور مہیش چندر کی ارتھی اٹھانے میں حیرت انگیز پھرتی کا ثبوت دیں گے اور وہ تمام نشانات فوراً مٹا دیے جائیں گے جو ہمیں پھانسی کے پھندے تک لے جا سکتے ہیں۔" پارو نے "کچی گولیاں نہیں کھیلیں موہن داس!"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"یہاں کیا ممکن نہیں ہے؟" وہ گمبھیر لہجے میں بولی۔ "یہاں سونا چلتا ہے صرف سونا۔"

"کنور جی کی موت کا ذمے دار کسے ٹھہرایا جائے گا؟" میں نے کچھ سوچ کے پوچھا۔

"جے پال کو۔" پارو نے ایک سگریٹ جلا کے دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے کہا۔ "ہم نے جے پال کے خلاف سینکڑوں ایسے ثبوت فراہم کرنے کا بندوبست کر لیا ہے جو اسے کنور مہیش چندر کا قاتل ثابت کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔"

"کیا جے پال چپ چاپ پھانسی کے تختے پر چلا جائے گا؟"

"تم بہت بھولے ہو موہن داس!" پارو نے اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "ادھر تم کنور کو موت کے گھاٹ اتارو گے، ادھر چند لمحوں بعد ہمارے آدمی جے پال کو ٹھکانے لگا دیں گے جو اس وقت اس کے ارد گرد ہی بیٹھے ہیں۔ قتل کا ثبوت حالات فراہم کریں گے۔ بولو۔ کیا تمہیں منظور نہیں ہے؟ اقرار کی صورت میں تم ہمارے بلکہ میرے بدن کے مالک ہو گے، انکار کی صورت میں تمہیں ٹھکانے لگاتے ہوئے ہمیں دکھ ہوگا لیکن ہم ایسا کرنے پر مجبور ہیں، اب ہم تمہیں کھلا نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ تمہیں سب معلوم ہو گیا ہے اور کنور مہیش چندر تمہاری موت اسی طرح بھول جائے گا جس طرح اپنے باپ کی اور ملازموں کی اموات بھول گیا ہے۔ تمہارے پاس ایک ہی چارہ ہے کہ ہماری بات مان لو۔ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ ہمیں افسوس ہے پیارے موہن! بس یہی ایک صورت ہے۔"

"مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیجیے۔"

"وقت بالکل نہیں ہے۔ تمام انتظام آج ہی رات کے لیے کیا گیا ہے۔" وہ پراسرار انداز میں بولی اور مجھے دوبارہ میرے دفاع اور قتل کے بعد کے واقعات کا منصوبہ سمجھانے لگی۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی یہ سب ممکن ہونے لگے گا، پارو بھی مہیش چندر کی دشمن ہو جائے گی؟ اس وقت پارو پر اعتماد کرنے کے سوا واقعی کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں اس کی خواب گاہ میں بند تھا اور اس کے اشارے پر کئی ملازم اندر آ سکتے تھے، اس کے زرخرید غلام۔ بھاگنے کی بھی کوئی صورت نہیں تھی، نہ سوچنے کا کوئی موقع تھا۔ اگر اس وقت میں بھاگنے کی کوشش بھی کرتا تو پارو کے غلام مجھے پاتال سے تلاش کر کے اسی وقت میرا کام تمام کر دیتے۔ کنور مہیش چندر کو اطلاع دے کے اس کا اعتماد حاصل کرنے کا موقع بھی میرے پاس نہیں تھا۔ پارو اتنی مہلت ہی کیوں دیتی؟ لمحوں میں، میں نے بہت کچھ سوچا، اتنا، جو میں برسوں میں سوچتا۔ تمام اندیشوں اور پارو کی یقین دہانیوں کے سوا، کہیں میرے دل میں یہ طمانیت بھی جاگزیں تھی کہ میرے ہاتھوں مہیش چندر کا قتل ہو رہا ہے، کوئی اور یہ اعزاز حاصل نہیں کر رہا ہے۔ میں نے سوچا، جب ہر دروازہ بند ہو چکا ہے تو پھر آج دھوم دھام سے دل کے ارمان کیوں نہ نکالے جائیں؟ یہ موقع نکل گیا تو نہ جانے پھر کب آئے گا؟ کچھ توقف کے بعد میں پارو کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ پارو میرا جواب سن کے فاتحانہ انداز میں مسکرائی، میرے ہاتھ کا بوسہ لیا پھر اس نے ضروری ہدایتیں دیں اور کسی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی خواب گاہ سے باہر چلی گئی۔

باہر سے قدموں کی آہٹ خواب گاہ کی جانب آتی محسوس ہوئی تو میں نے اپنی سانسیں سینے کے اندر دفن کر لیں۔ میں پارو کی خواب گاہ کی آڑ میں دیوار سے لگا، دم سادھے کھڑا تھا۔ میری گرفت رومال میں پکڑے ہوئے خنجر پر مضبوط تھی۔ وہ خنجر مجھے پارو ہی نے فراہم کیا تھا۔ خنجر کے دستے پر جے پال کا نام کندہ تھا۔ قدموں کی آہٹ ہر لمحے خواب گاہ سے نزدیک ہوتی جا رہی تھی میں پسینے میں تر تھا۔ یہ لمحہ جاں کنی کا لمحہ تھا۔ مجھے مہیش چندر کی آواز سنائی دی اس کی آواز سن کے خنجر پر میری گرفت اور سخت ہو گئی۔ کاش میں اسے للکار کے اور اس کی زبان سے عاجزی کی درخواستیں سن کے اسے ختم کرتا۔ میں اس کے گڑگڑانے کا منظر بھی دیکھتا۔ مہیش چندر نشے میں پارو سے کہہ رہا تھا۔ "تم ہمیں تباہ کر دو گی۔"

"بھونرا چالاک ہو تو اپنا من پسند پھول تلاش کر لیتا ہے۔" پارو نے شوخی سے کہا۔

"تمھارا بدن کندن ہے پارو! تم پارس ہو۔"

"مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔" پارو نے غمزے سے کہا۔

"اب بھی میں تمھیں سونے نہیں دوں گا۔"

ساتھ ہی پارو کی ہلکی چیخیں سنائی دیں۔ "ارے۔ اتنی بے چینی کس لیے مہیش؟ ہم یہ رات پوری طرح مدہوش ہو کے گزاریں گے۔"

میری سانسیں رکی ہوئی تھیں۔ قدموں کی آہٹ دوبارہ ابھر کے مجھ سے قریب ہو رہی تھی۔ میں پوری طرح محتاط تھا۔ پارو کے بدن پر اس کا لباس ڈھلکا ہوا تھا۔ پارو مہیش کی گرفت سے نکل کے بھاگ رہی تھی، وہ ادھر اُدھر چکر لگاتی ہوئی میری جانب آ گئی پارو جیسے ہی اس طرف آئی مہیش چندر بھی لہراتا ہوا یہیں آ گیا۔ اس کی پشت میری جانب تھی، پارو نے مہیش کو وہیں روکے رکھا اور اشارے سے مجھے عمل کی دعوت دی۔ میں بجلی کی طرح تیزی سے لپکا۔ "کنور جی! سنبھلو!" میں نے نفرت سے کہا۔

کنور مہیش چندر کی آنکھیں میری آواز پر پھٹ گئیں، مجھے یہ لمحہ اپنی زندگی کا حاصل معلوم ہوا۔ اس سے قبل کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی اور بات ہوتی، برق رفتاری سے میں نے مہیش چندر کے حلقے پر ایک ٹھوکر لگائی۔ وہ لڑکھڑا کے گرا، میرا سیدھا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور میں نے زقند بھر کے خنجر اس کے دل میں اُتار دیا۔ پارو اچھل کے دو قدم پیچھے ہو گئی۔ مہیش چندر کی مدافعت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی، خون فوارے کی صورت میں اس کے سینے سے اُبل رہا تھا، میں اس کے اُبلتے ہوئے خون سے ذرا ہٹ کے اس کی تڑپتی ہوئی لاش دیکھتا رہا اور جب تک مجھے یہ یقین نہیں ہو گیا کہ وہ اب دوبارہ سانس نہیں لے سکے گا، مجھے ہوش نہیں آیا۔ اسی وقت تمام بتیاں بجھ گئیں۔

گھُپ اندھیرا ہوا تو مجھے ایک نئے خطرے کا احساس ہوا کہ شاید میں نے پارو پر اعتماد کر کے غلطی کی ہے۔ میں نے بہ عجلت تمام شاردا کا پستول نکالا اور اٹھ کے اس دروازے کی جانب بڑھا جو خواب گاہ کی پشت پر مہاراجہ کے خاص باغ کی جانب کھلتا تھا۔ میری رفتار کسی چیتے کی طرح تھی۔ تاریکی کی وجہ سے ایک دو رکاوٹوں سے ٹکرایا لیکن دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اندھیرے کے باوجود میں نے ٹٹول کے چٹخنی دریافت کر لی۔ ابھی میں اسے کھولنے کی سعی کر ہی رہا تھا کہ خطرے کا تیز الارم پرکاش بھون کے محافظوں کو محتاط کرنے کے لیے چیخنے لگا، پارو نے مجھے رنگے ہاتھوں گرفتار کرانے کی بڑی مکمل سازش کی تھی۔ ایک ایک لمحہ میری جان پر عذاب بنا ہوا تھا۔ میں دروازہ کھول کے باہر نکلا اور دوڑتا ہوا باغ میں پہنچ گیا۔ باہر تمام روشنیاں جلا دی گئی تھیں اور سنگین بردار محافظ اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے، میں جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا آہستہ آہستہ صدر دروازے کی سمت جا رہا تھا۔ اپنے کوارٹر جانے کا ارادہ ترک کر کے پرکاش بھون سے جیسے تیسے فرار ہونے ہی میں مجھے عافیت نظر آئی صدر دروازے کے قریب پہنچ کے میرا دم گھٹنے لگا۔ میں اب شاردا کے محل کی طرف بھی نہیں جا سکتا تھا۔ قریب تھا کہ میں چکرا کے گر پڑتا لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا، اُس وقت پستول نے میری بڑی ہمت بندھائی۔ میں نے ایک آخری خطرہ اور مول لینے کی ٹھان لی۔ شاردا کے پستول میں چھ گولیاں تھیں۔ میرے لیے ایک ایک پل قیمتی تھا۔ میں نے ایک درخت کی آڑ لے کے یکے بعد دیگرے دو گولیاں داغ دیں۔ دو پہرے دار چیختے ہوئے گرے لیکن تیسرا پہرے دار اچھل کر زمین پر لیٹ گیا۔ میں نے دو گولیاں اور داغ دیں۔ تیسرے پہرے دار کی چیخ سنائی دی تو میں درخت کی آڑ سے نکل کے صدر دروازے کی طرف بھاگا۔ میرا سانس بری طرح پھول رہا تھا، ہاتھ میں شاردا کا پستول لرز رہا تھا جس میں ابھی دو گولیاں باقی تھیں۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر قسمت نے ساتھ نہیں دیا تو میں پکڑا جانے کے بجائے ایک گولی سے اپنا خاتمہ کر لوں گا۔ زخمی پہرے داروں کے قریب سے دوڑتا ہوا میں صدر دروازے تک پہنچ گیا لیکن دروازہ مقفل دیکھ کے میری نگاہوں میں اندھیرا پھیل گیا۔ دور سے چار محافظ دوڑتے ہوئے دروازے کی طرف آ رہے تھے۔ میں نے پھرتی سے پستول پنڈلی میں بندھے ہوئے تسمے میں ٹھونس لیا اور دونوں ہاتھوں سے دروازے کی سلاخیں تھام کے اوپر چڑھنے لگا، پھاٹک کی اونچائی پندرہ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ میرے تعاقب میں آنے والے ابھی دور تھے اور انھوں نے صدر دروازے پر مجھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بار بار منتشر ہو جاتے تھے۔ اگر میں پھاٹک کی اونچائی عبور کر کے دوسری طرف کود جاتا تو میری زندگی کے امکانات پیدا ہو سکتے تھے۔ میرے ذہن میں اُس وقت نہ ڈالی کا خیال آیا تھا، نہ گنگھسے کا، نہ شاردا کا۔ مجھے اپنی زندگی بچانے کی فکر لاحق تھی۔ میں ہوشیاری اور انتہائی تیزی سے پھاٹک کی سلاخوں سے اوپر کی جانب چڑھ رہا تھا۔ چند فٹ اوپر پہنچ کے میں نے مردہ محافظوں کی سنگینیں دیکھیں اور میرا ارادہ متزلزل ہونے لگا ادھر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔



امبر بیل ایک نوجوان کی زندگی کے حیرت انگیز واقعات۔ اس سرگزشت میں بہت سوں کے لیے عبرت کا سامان موجود ہے۔ آیندہ شمارہ ملاحظہ فرمایئے

اس شخص کی کہانی جسے اپنی موت کا وقت معلوم ہو گیا تھا

ایک بھائی ایک بہن اور ایک محبوب کا افسانہ

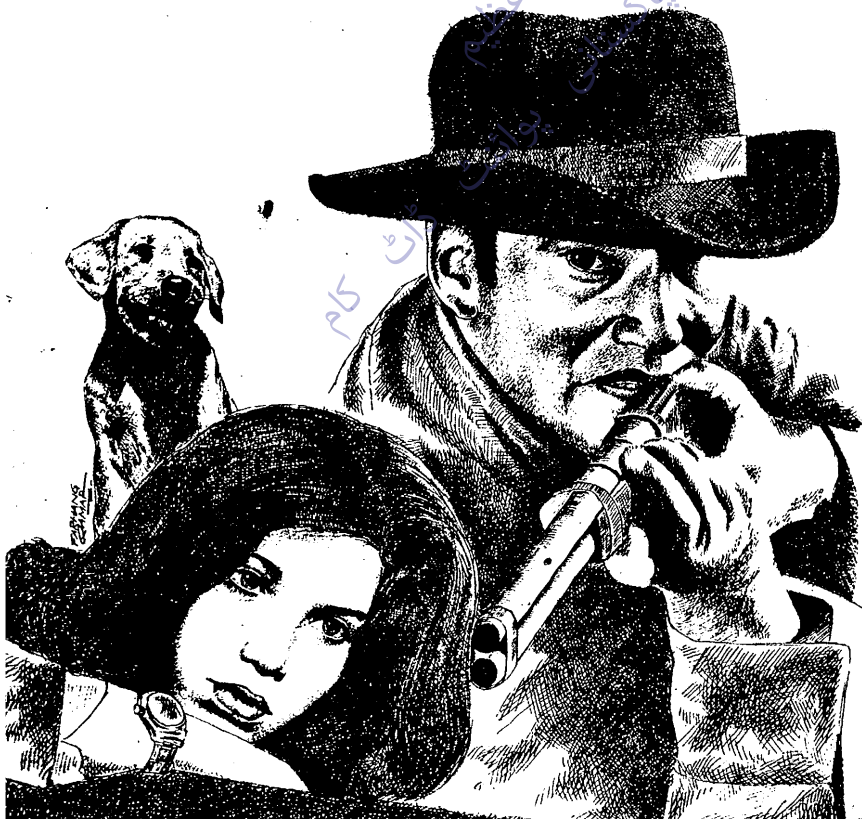
رچرڈ ڈیمنگ ★ ش م جمیل

انکشافات

اگر آپ کا ڈاکٹر آپ کو یہ اطلاع دے کہ آپ دو ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہیں گے اور آپ کی موت شدید کرب و اذیت میں واقع ہو گی تو آپ کیا کریں گے؟

ظاہر ہے آپ سب سے پہلے خودکشی کے متعلق غور کریں گے، پھر آپ کو یہ خیال آئے گا کہ آپ کی موت کے بعد آپ کے ان متعلقین کا کیا ہو گا جن کی تمام ذمے داری آپ پر ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میری صرف ایک بہن ہے، مارگریٹ اس کی عمر سترہ سال ہے۔ جب میں نے اپنے بیمے کی شرطوں میں یہ پڑھا کہ خودکشی کی صورت میں میری وارث مارگریٹ کو ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا تو میں نے اذیت ناک موت سے خوف زدہ ہونے کے باوجود خودکشی کے خیال پر فوراً لعنت بھیج دی۔ مجھے اپنی چھوٹی بہن سے بے پناہ محبت ہے اور میری محبت یک طرفہ نہیں ہے، مارگریٹ بھی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔

مجھے اپنے ڈاکٹر سے یہ ہول ناک خبر کرسمس کے دو روز بعد پیر کی صبح ملی تھی۔ کرسمس کی وجہ سے بازار بند تھے لیکن جب میں گھر واپس آیا تو مارگریٹ گھر پر نہیں تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ خرگوشوں کے شکار پر گئی ہو گی۔ وہ اپنے ساتھ پالتو کتے ٹامی کو بھی لے گئی تھی۔ میں نے کرسمس کی



خوشی میں اسے سولہ گیج کی شاٹ گن تحفے میں دی تھی اور پچھلی رات تھوڑی سی برف باری بھی ہوئی تھی اتنی کہ خرگوشوں کے پیروں کے نشانات اُس پر آسانی سے واضح ہو جائیں۔ میں نے بیمے کے کاغذات ایک طرف رکھ دیئے اور سنجیدگی سے اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔

مارگریٹ کی عمر سترہ سال تھی۔ گریجویشن میں اس کا ایک سال باقی تھا۔ وہ اتنی کم عمر تھی کہ خود کھیتوں کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ ہمارا کھیت بھی بینک میں رہن رکھا ہوا تھا کیونکہ کھیتی باڑی کے لیے میں نے بینک سے کچھ قرض لیا تھا۔ قرض کی مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ اُسے ادا کرنے کے لیے میں نے ایک اور بیمہ پالیسی لے لی تھی۔ میری موت واقع ہونے پر بیمہ کمپنی بینک کو سارا قرض واپس کر دے گی اور میری دوسری بیمہ پالیسی کے دس ہزار ڈالر مارگریٹ کو مل جائیں گے اور وہ اُس کے اخراجات کے لیے کافی ہوں گے۔ وہ کھیت کی دیکھ بھال کے لیے کسی کو ملازم رکھ لے گی۔ اگر میں خودکشی کر لیتا ہوں تو زمین پر بینک قبضہ کر لے گا اور بیمہ کمپنی مارگریٹ کو ایک پیسہ نہیں دے گی۔ اس لیے خودکشی کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنی بہن کو زندہ درگور کر جاؤں گا۔ ہاں اگر میری موت خودکشی کے علاوہ کسی اور طریقے سے واقع ہو تو مالی طور پر مارگریٹ فائدے میں رہے گی زمین سے قرض بھی ختم ہو جائے گا اور اُسے دس ہزار ڈالر نقد بھی مل جائیں گے۔

مکان کے باہر ٹامی کے بھونکنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے جلدی سے دونوں پالیسیوں کے کاغذات دراز میں ڈال دیئے چند لمحوں بعد مارگریٹ اندر داخل ہوئی۔ شاٹ گن اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس نے فاتحانہ انداز سے ایک خرگوش اٹھا رکھا تھا۔ میری بہن بہت خوب صورت اور پرکشش تو نہیں ہے لیکن بدصورت اور سپاٹ بھی نہیں ہے۔ وہ شکاری لباس میں بھی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ ویسے تو وہ میری بہن ہے لیکن میرے لیے وہ ہمیشہ اولاد کی طرح رہی ہے کیونکہ ہم دونوں کی عمروں میں بیس سال کا فرق ہے۔ جب مارگریٹ کی عمر دو سال تھی تو ہمارے والدین فوت ہو گئے تھے۔ میں پندرہ سال سے اولاد کی طرح اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس دنیا میں ہم دونوں کا ایک دوسرے کے سوا کوئی نہیں تھا۔

"آج قسمت تم پر مہربان رہی مارگریٹ؟" میں نے خرگوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"قسمت؟" مارگریٹ نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔ "یہ پچاس گز کے فاصلے پر دوڑ رہا تھا جناب! میں نے اسے اسی حالت میں ایک گولی سے شکار کیا ہے۔"

پھر وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی اور اس نے تشویش سے پوچھا۔ "تمہاری ایکسرے رپورٹ مل گئی ہوگی سام! سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

خوشی سے اس کا چہرہ دمکنے لگا۔ "شکر ہے، میں بہت فکر مند تھی۔"

مارگریٹ خرگوش باورچی خانے کی میز پر رکھ کے اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں خرگوش کی کھال اتارتے ہوئے اپنے نئے مسئلے پر غور کرنے لگا اور جلد ہی ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ موجودہ صورتِ حال میں اس مسئلے کا اس سے بہتر اور کوئی حل نہیں ہو سکتا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد میں نے جوتے پہنے اوور کوٹ پہنا اور مارگریٹ سے کہا۔ "میں ذرا قصبے تک جا رہا ہوں۔ تم جلدی سو جانا۔ صبح چھ بجے سے جاگی ہوئی ہو۔"

"ٹیڈیوں کی طرح باتیں نہ کیا کرو سام!" مارگریٹ نے منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے گیراج سے پک اپ ٹرک نکالا اور قصبے کی طرف چل دیا۔ گیراج میں جیپ بھی کھڑی تھی لیکن میں نے اسے استعمال کرنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ مارگریٹ جیپ چلانا پسند کرتی تھی۔ مجھے پک اپ استعمال کرنے کی ایسی عادت ہو گئی تھی کہ اب سیر و تفریح کے لیے بھی اسی کو استعمال کرتا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرا ٹرک مارگریٹ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہوگا تو میں نے گاڑی کا رُخ قصبے کی مخالف سمت میں موڑ دیا۔ اب میں ٹونی سے ملنے اس کے کھیت کی طرف جا رہا تھا۔ ٹونی نے یہ کھیت کرائے پر لے رکھا تھا۔

قصبے کے دوسرے کسانوں کی طرح ٹونی بھی غریب تھا۔ اس کی پرانی پک اپ، زراعتی اوزار اور بیل باندھنے کا باڑا اس کے مکان سے بدرجہا بہتر تھا۔ اس کا مکان صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ اور اس کا فرش کچی زمین کا تھا لیکن دوسرے کسانوں کی طرح وہ اپنی قسمت اور حالات پر قانع ہو کر نہیں بیٹھ گیا تھا۔ اس کی عمر صرف چوبیس سال تھی۔ اس کا جسم بہت مضبوط تھا۔ وہ بہت خوش اخلاق اور قصبے کی لڑکیوں کے نقطۂ نظر سے خوبرو نوجوان تھا۔ اس میں کام کرنے کا جذبہ تھا، جوش تھا، لگن تھی مگر حالات اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

میرا خیال ہے، مارگریٹ بھی ٹونی کو پسند کرتی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ اگر میں فوراً مداخلت نہ کرتا تو وہ اس معاملے میں بہت آگے نکل جاتی میں نے اسے بڑی خوب صورتی کے ساتھ ٹونی سے ملنے جلنے سے روکا تھا۔ میں نے مارگریٹ سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ ٹونی سے میل جول ترک کر دے میں اس قسم کا کوئی قانون اپنے گھر میں نافذ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی بہن کی فطرت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اس کے علاوہ اب وہ کوئی چھوٹی سی بچی نہیں تھی جسے اس کے بڑے انگلی پکڑ کے چلاتے۔ وہ سمجھدار ہو گئی تھی اور اس قسم کی آمریت اُسے بغاوت پر اُکسا سکتی تھی۔ میں اس کا بڑا بھائی تھا۔ وہ مجھ سے شدید محبت کرتی تھی مگر وہ یہ بات کبھی پسند نہ کرتی کہ اُس کے دوستوں کا انتخاب بھی میں کروں۔ میں نے بڑے نرم لہجے میں مارگریٹ سے صرف اتنا کہا کہ نوجوانی کا دور عمر کا بے حد جذباتی دور ہوتا ہے۔ اس دور میں جب دو نوجوان مسلسل ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر

آپس میں محبت بھی کرنے لگتے ہیں۔ محبت اچھی چیز ہے لیکن جب اس سے اچھا مستقبل وابستہ نہ ہو تو اس قسم کا میل جول گہرا ہونے سے پہلے ہی ختم کر دینا چاہیے۔ میں نے اس کے سامنے ٹونی کے حالات رکھے اور اسے بتایا کہ اگر اسے مفلس ٹونی کے ساتھ ایک جھونپڑی میں زندگی گزارنی پڑی تو مجھے شدید تکلیف ہوگی کیونکہ کرائے پر کھیت حاصل کرنے والا کوئی شخص آج تک اس قصبے میں معاشی طور پر خوش حال نہیں ہو سکا۔ میں نے اس سے کہا کہ ٹونی اگر اس کی ذات کے لیے ابھی اہم نہیں ہوا ہے تو اسے ابھی سے اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ آیندہ بھی کبھی اہمیت اختیار نہ کرنے پائے۔ مارگریٹ سمجھ دار تھی۔ اس نے میرے دلائل تسلیم کرتے ہوئے ٹونی سے قطع تعلق کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر ٹونی کو پسند کرتا تھا۔ وہ ایک خوش مزاج اور محنتی لڑکا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ آج سے تیس سال بعد بھی ٹونی کی معاشی حالت یہی ہوگی۔ یہ درست ہے کہ اسے کام کرنے اور آگے بڑھنے کی لگن تھی لیکن صرف لگن سے کیا ہوتا ہے۔ ترقی کرنے کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی ہے، اپنی ذاتی زمین کی ضرورت ہوتی ہے کرائے کی زمین پر ہل چلانے سے دو وقت کی روٹی تو ضرور مل جاتی ہے لیکن اس کا کرایہ ادا کرنے کے بعد علاج وغیرہ کے لیے پیسے نہیں بچتے۔ ٹونی کے والدین ساری زندگی کام کرتے کرتے اسی زمین میں دفن ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی خوش حالی نہیں دیکھی تھی اور اب ٹونی نے ان کی جگہ سنبھال لی تھی۔ اس لیے یہ توقع رکھنا فضول تھا کہ ٹونی اس زمین سے سونا اگا لے گا۔

میری غیر متوقع آمد پر ٹونی حیران رہ گیا۔ "اوہ مسٹر سام!" اس نے کہا۔ "تشریف لائیے، تشریف لائیے۔" پھر وہ اپنے کمرے کی حالت دیکھ کر شرمندہ ہو گیا۔

کمرے میں دو ٹوٹی پھوٹی کرسیوں کے علاوہ ایک چارپائی تھی اور میز پر گیس کی ایک لالٹین جل رہی تھی۔ ایک طرف مٹی کے تیل کا چولھا جل رہا تھا۔ قریب ہی دو پلیٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ میز کے نیچے پانی کی ایک بالٹی رکھی تھی اور اس کے قریب گندا پانی جمع کرنے کی ایک بالٹی رکھی تھی۔ اس کمرے میں صرف ایک قیمتی چیز تھی، رائفل۔ میں چولھے کے پاس جا کر ہاتھ تاپنے لگا۔ پھر میں نے کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ "یہاں مجھے زیادہ فرنیچر نظر نہیں آتا ٹونی! جب تمھارے والدین زندہ تھے تو تم کہاں سوتے تھے؟"

اس کا چہرہ ذرا سرخ ہوا۔ "میں۔۔۔ میں شیڈ میں سوتا تھا مسٹر سام!"

میں نے اپنا اوور کوٹ اتار کر ایک کرسی پر ڈال دیا اور خود میز کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد ٹونی میرے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ "آپ کافی پینا پسند کریں گے مسٹر سام؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "شکریہ ٹونی! کافی پینے کے بعد مجھے نیند نہیں آتی۔ ہاں ٹونی، ایک بات بتاؤ، کیا تم میری بہن مارگریٹ میں اب بھی دلچسپی رکھتے ہو؟"

اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ "میں آج کل اس کے قریب بھی نہیں جاتا مسٹر سام! مجھے اعتراف ہے کہ کچھ مدت قبل میں نے مارگریٹ کے ساتھ رقص کرتے ہوئے بے حد مسرت محسوس کی تھی اور جب بھی کسی تقریب میں ہماری ملاقات ہوتی تھی، میں رقص کے لیے دوسری لڑکیوں پر مارگریٹ کو ترجیح دیتا تھا لیکن جب اس نے مجھے یہ بتایا کہ آپ کو ہمارا ملنا جلنا پسند نہیں ہے تو میں نے اس کے ساتھ رقص بند کر دیا۔"

"ٹھیک ہے ٹونی! لیکن یہ بات ایک سال پرانی ہے۔ اس وقت مارگریٹ کی عمر صرف سولہ سال تھی اور میرا خیال تھا کہ تمھاری عمر اس سے بہت زیادہ ہے لیکن اب چند مہینے بعد وہ اٹھارہ سال کی ہو جائے گی اور تم دونوں کی عمروں میں صرف چھ سال کا فرق رہ جائے گا۔ یہ فرق بہت زیادہ نہیں ہوگا۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "گویا چند ماہ بعد آپ کو ہمارے میل جول پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا مسٹر سام؟"

"ہاں لیکن اس کا انحصار میل جول کی نوعیت پر ہوگا کہ تم اس سے مستقبل کی بیوی کی حیثیت سے ملا کرو گے یا جوانی کا کھیل کھیلنے کے لیے ایک ساتھی کی حیثیت سے؟"

میری بیباکی اور صاف گوئی نے چند لمحوں کے لیے ٹونی کی قوتِ گویائی سلب کر لی۔ وہ حیرت سے منہ کھولے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا: "میں نے شادی کے سلسلے میں ابھی زیادہ غور نہیں کیا مسٹر سام! یہ بات نہیں ہے کہ میں مارگریٹ کو بیوی کی حیثیت سے پسند نہیں کروں گا لیکن آپ نے خود ایک بار مارگریٹ سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کر کے خوش نہیں رہ سکے گی۔ یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ اسے خوش رکھنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"فرض کرو کہ تم اسے خوش رکھنے کے قابل ہو جاؤ تو؟"

وہ کچھ دیر ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔ "اگر میرے پاس اپنا کھیت ہوتا تو میں مارگریٹ سے شادی ہونے پر خود کو بڑا خوش نصیب تصور کرتا مسٹر سام! میرے لیے یہ بڑی خوشی اور عزت کی بات ہوتی۔"

"فرض کرو تم ذاتی کھیت کے مالک بن جاؤ، جو ہر قسم کے قرض سے مبرا ہو اور تمھارے پاس اخراجات کے لیے دس ہزار ڈالر آ جائیں تو؟" میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میری توقع سے زیادہ سمجھ دار ثابت ہو رہا تھا۔

"آپ کی اپنی زمین؟ یعنی آپ مارگریٹ سے شادی کرنے کے لیے مجھے اپنی زمین کی پیشکش کر رہے ہیں مسٹر سام؟"

"ہاں یہی سمجھ لو!"

"لیکن کیوں؟" اس نے مجھے شک کی نظروں سے گھورا۔ "کیا۔۔۔۔۔۔ کیا مارگریٹ حاملہ ہو گئی ہے؟"

میں نے اپنا چہرہ سخت کر لیا۔ "کیا تم اپنا سر دو حصوں میں تقسیم کرانا پسند کرو گے ٹونی؟" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں شرمندہ ہوں مسٹر سام!" اس نے معذرت کے لہجے میں کہا "لیکن آپ یہ پیش کش آخر کیوں کر رہے ہیں؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے وعدہ کرو کہ آج کی گفتگو کا ایک لفظ بھی تم کسی کے سامنے نہیں دہراؤ گے کیونکہ اگر تم نے میری شرط ماننے سے انکار کر دیا تو مجھے کوئی دوسرا نوجوان تلاش کرنا پڑے گا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں مسٹر سام!" اس نے کہا "کیا مجھے بائبل پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانا پڑے گا؟"

"نہیں مجھے تمھاری زبان پر بھروسا ہے ٹونی! میں تمہارے والدین سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے تھے۔ امید ہے کہ تم بھی کبھی وعدہ خلافی نہیں کروگے۔"

"آپ مجھ پر اعتبار کر سکتے ہیں جناب!"

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ "میرے ڈاکٹر نے کچھ دن پہلے مجھے شہر جا کر ایکسرے کرانے کی ہدایت کی تھی۔ آج ایکسرے رپورٹ موصول ہوگئی۔ اسے دیکھ کے اس نے مجھے صاف گوئی سے بتادیا کہ میں دو ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہوں گا۔"

ٹونی کو یہ خبر سن کر حقیقی صدمہ ہوا۔ کمرے پر بہت دیر تک سکوت طاری رہا۔ پھر وہ بولا "مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا ہے مسٹر سام! کیا ڈاکٹر کو اس کا.... پورا یقین ہے؟"

"شہر کے تین ماہرین نے ایکسرے رپورٹ کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے اس لیے اس اطلاع کی صداقت میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے کوئی ایسا انتظام کر جاؤں کہ میرے بعد میری بہن کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔ میں نے دو بیمہ پالیسیاں لے رکھی ہیں۔ میری موت کی صورت میں ایک بیمہ پالیسی میرا تمام قرض اتار دے گی اور دوسری پالیسی سے مارگریٹ کو دس ہزار ڈالر مل جائیں گے۔"



چند لمحے وہ کچھ غور کرتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا "اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی موت کے بعد مارگریٹ معاشی طور پر خوش حال ہو جائے گی۔ پھر آپ کو کون سی فکر پریشان کر رہی ہے؟ آپ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ میں مارگریٹ سے شادی کر لوں؟"

"وہ تنہا کھیت کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔ اسے ایک مضبوط مرد کی ضرورت پڑے گی۔ مجھے یقین ہے کہ قرض سے مبرا زمین مل جانے کی صورت میں تم مارگریٹ کے لیے ایک عمدہ شوہر ثابت ہوگے۔ اس کے علاوہ مجھے تم سے ایک کام بھی لینا ہے اور اس کام کے عوض میں مارگریٹ ہی کو تمھاری خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔ مارگریٹ کے ساتھ ہی زمین اور دس ہزار ڈالر بھی تمھاری ملکیت ہو جائیں گے۔" وہ مبہوت کھڑا تھا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر سے میرے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ اس نے مجھ سے کوئی بات چھپانی پسند نہیں کی۔ اس نے بتایا ہے کہ میرا درد آہستہ آہستہ بڑھتا جائے گا اور موت سے چند روز قبل اس کی شدت ناقابل برداشت ہو جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں میری موت بڑی اذیت ناک ہوگی خصوصاً زندگی کے آخری چند دن بے حد عبرت ناک ہوں گے۔ میں وہ آخری چند دن اپنی زندگی سے نکال دینا چاہتا ہوں تاکہ مجھے کرب و اذیت کا سامنا نہ کرنا پڑے اور میں آسانی سے مر جاؤں۔"

وہ کچھ دیر تک سحر زدہ انداز میں مجھے دیکھتا رہا۔ "کیا آپ خودکشی کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، خودکشی کی صورت میں دونوں بیمہ پالیسیاں ضائع ہو جائیں گی۔ مارگریٹ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے قتل کر دو۔"

میرے الفاظ اس پر بجلی کی طرح گرے۔ وہ سکتے میں آگیا۔ پھر اس نے تھوک نگلنے کی کوشش کی۔ کچھ دیر بعد اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی "میں — آپ کو قتل کر دوں؟ مجھے — مجھے پھانسی دے دی جائے گی۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے جو منصوبہ بنایا ہے، اس کی وجہ سے تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ تم مجھے اپنے دفاع میں قتل کروگے۔ اس لیے سزا ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔"

"اپنے دفاع میں؟" ٹونی نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں تم پر شاید مقدمہ چلے لیکن تم قتل کے الزام سے بری ہو جاؤ گے۔ ہم پہلے دکھاوے کے طور پر لڑیں گے۔ یہی چیز ہماری دشمنی کا سبب بن جائے گی۔ میں نے ابھی یہ نہیں سوچا ہے کہ ہم کس بات پر لڑیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مارگریٹ کے ساتھ دوبارہ رقص کرنا شروع کر دو اور میں اس پر اعتراض کروں۔ بہرحال جھگڑے کی تفصیلات ہم آسانی سے تیار کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد میں لوگوں کے سامنے کھلم کھلا تم سے نفرت اور دشمنی کا اظہار شروع کر دوں گا۔ تمھیں میرے خلاف کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم میرے سامنے آنے سے کترانا اور یہ ظاہر کرنا کہ تم مجھ سے لڑنا جھگڑنا پسند نہیں کرتے۔ تمہارے اس رویے سے میں اور چراغ پا ہو جاؤں گا اور کھلے عام تمھیں گولی مارنے کی دھمکیاں دوں گا۔ میں پھر ایک رات غصے میں اپنی رائفل لے کر تمہارے گھر آجاؤں گا اور تمہارے دروازے پر کئی گولیاں چلاؤں گا۔ تم اندر سے اپنی رائفل سے مجھے گولی مار دینا۔ یہ حالات سامنے رکھتے ہوئے احمق سے احمق آدمی بھی یہ کہہ دے گا کہ تم نے اپنے دفاع میں مجھے مارا ہے۔"

ٹونی بہت دیر تک سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا "آپ نے اس معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کیا ہے لیکن ایک بات بھول گئے ہیں۔ کیا مارگریٹ اپنے بھائی کے قاتل سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی؟"

میں نے اس مسئلے کا حل بھی تلاش کر لیا ہے۔ میں آج کی گفتگو قلم بند کر کے تمہارے حوالے کر دوں گا۔ جب تم میرے قتل کے الزام سے بری

ہو جاؤ اور قصبے کے لوگ یہ معاملہ بھول جائیں تو تم میری تحریر مارگریٹ کو دکھا دینا۔ جب اسے اصل حالات کا علم ہوگا تو میری طرح وہ بھی تمہاری بہت ممنون ہوگی اور میری آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے تم سے شادی کرلے گی۔"

ٹونی سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ "فرض کیجیے کہ مارگریٹ آپ کی تحریر پڑھنے کے بعد بھی شادی سے انکار کردے تو؟ یا اگر وہ آپ کی تحریر پولیس کے حوالے کردے تو؟"

میری تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ "یہ ناممکن ہے۔ میں اپنی بہن سے اچھی طرح واقف ہوں۔ پھر بھی ہم چند لمحوں کے لیے یہ فرض کرلیتے ہیں کہ وہ میری تحریر پولیس کو دکھا دے گی۔ اس صورت میں بھی تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہمارے ملک میں ایک قانون رائج ہے کہ کسی شخص پر ایک جرم کے سلسلے میں دو بار مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ جب تمہیں میرے قتل کے الزام سے ایک بار بری کردیا جائے گا تو پھر پولیس کو اگر اس بات کے ٹھوس ثبوت بھی مل جائیں کہ تم نے مجھے اپنے دفاع میں نہیں بلکہ جان بوجھ کر قتل کیا تھا تو وہ تم پر میرے قتل کے الزام میں مقدمہ نہیں چلا سکے گی۔ اس لیے اب میں تمہیں یہ ہدایت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب تمہیں میرے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جائے تو تم مقدمہ چلانے کا مطالبہ کرنا اور باقاعدہ عدالت کے ذریعے بری ہونے پر اصرار کرنا۔ بعض اوقات جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ مقدمے میں کوئی جان نہیں ہے تو ملزم کو معمولی پوچھ گچھ کے بعد رہا کردیا جاتا ہے۔ اگر تم ایک بار عدالت سے بری ہوگئے تو پھر اگر تم خود بھی میرے قتل کا اعتراف کروگے تو تم پر دوبارہ مقدمہ نہیں چلایا جا سکے گا۔"

"کیا اس قانون کے متعلق آپ کو پورا یقین ہے؟" ٹونی نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ ابھی چند سال قبل ایک شخص پر قتل کے الزام میں مقدمہ چلا تھا لیکن ناکافی ثبوت کی بنا پر عدالت نے اسے بری کردیا۔ پھر اس نے ایک اخبار میں اپنی کہانی شائع کروائی کہ اس نے کس طرح قتل کیا تھا؟ اس نے جرم کی ایک ایک تفصیل بتائی تھی۔ کہانی کی اشاعت پر ہنگامہ ہوا لیکن پولیس مجرم کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔"

جب ایک گھنٹے بعد میں اس سے رخصت ہوا تو منصوبے کی تمام جزئیات تیار ہو چکی تھیں۔ ہم نے اس تحریر پر بھی بحث کی جو مجھے اس کے حوالے کرنی تھی تاکہ وہ اسے مارگریٹ کو دکھا کے اس سے شادی کرسکے۔ ہم نے اپنے منصوبے پر آنے والے جمعے سے عمل کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اس روز نئے سال کی تقریبات منعقد ہونے والی تھیں اور قصبے کے ٹاؤن ہال میں رقص کی تقریب کا انتظام کیا گیا تھا۔

مارگریٹ کو ٹاؤن ہال میں چھوڑ کر میں بار میں چلا گیا۔ ٹاؤن ہال میں رات ایک بجے تک رقص کا پروگرام تھا۔ میں نے مارگریٹ سے کہہ دیا

اُلجھنا

ہو تو کسی بڑے مسئلے میں اُلجھنا چاہیے اور اپنے سے بڑے آدمی کے ساتھ اُلجھنا چاہیے ورنہ آدمی کی توانائیاں اور کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں، کمزور آدمی کو دبانے میں کوئی شان نہیں ہے۔ بڑے آدمی سے تصادم ہو تو انسان کی استعدادِ کار اور بھی چمکتی ہے۔ میں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں ہمیشہ بڑے آدمیوں سے ٹکر لی ہے۔ اور ہمیشہ کامیاب رہا ہوں۔"

پطرس بخاری

تھا کہ میں بارہ بجے کے بعد واپس آؤں گا اور اسے اپنے ساتھ گھر لے جاؤں گا۔

ٹھیک بارہ بجے جب ٹاؤن ہال کے ٹاور نے نئے سال کی آمد کا اعلان کیا تو پورا قصبہ مختلف آوازوں سے گونجنے لگا۔ یہ طوفانِ بدتمیزی تھوڑی دیر تک جاری رہا۔ میں اس وقت بار میں بیٹھا تھا۔ جب میں لوٹ کے ٹاؤن ہال میں داخل ہوا تو سوا بارہ بج رہے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا کہ ٹونی منصوبے کے مطابق مارگریٹ کے ساتھ رقص کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے ہال پر طائرانہ نظر ڈالی۔ مجھے اپنے قصبے کا پولیس انسپکٹر ایلس ہارن ایک کونے میں کھڑا رقص کرتے ہوئے جوڑوں کو محویت سے دیکھتا ہوا نظر آیا۔ یہ ایک نیک شگون تھا۔ انسپکٹر سے میرے دیرینہ مراسم تھے۔ میں اس کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ "نیا سال مبارک ہو سام!" اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "تم کہاں تھے اب تک؟"

"میں بار میں بیٹھا ہوا تھا۔ میری عمر کے تمام لوگ وہیں تھے۔ ٹاؤن ہال تو اب نوجوانوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ تمہیں بھی نیا سال مبارک ہو ایلس!"

میں نے ہال پر ایک نظر ڈالی اور میری پتلیاں سکڑ گئیں۔ "یہ کیا مارگریٹ کے ساتھ ٹونی رقص کررہا ہے ایلس؟"

"ہاں!" اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ٹونی نے شاید آج کسی دوسری لڑکی کے ساتھ رقص کیا ہی نہیں۔ میں شام سے ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ رہا ہوں۔"

میں رقص کرتے ہوئے جوڑوں کے درمیان سے گزرتا ہوا آگے بڑھا پھر میں نے ٹونی کا کاندھا پکڑ کے پوری قوت سے اسے لٹو کی طرح گھمایا۔ ٹھیک اسی وقت موسیقی کا ریکارڈ ختم ہوگیا اور ہال میں سناٹا طاری ہوگیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ میری بہن کے قریب نہ پھٹکنا۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ ہال میں موجود تمام افراد ہماری طرف متوجہ ہوگئے۔

ٹونی نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ "مارگریٹ اب بچی نہیں رہی مسٹر سام!" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ اپنے دوستوں کا انتخاب خود کرسکتی ہے۔ آپ اسے منع نہیں کرسکتے۔ آپ اس کے بھائی ہیں، والد نہیں۔"

میں نے اس کا گریبان پکڑ کے بری طرح جھنجوڑا۔ اس کے کئی بٹن

ٹوٹ گئے۔ "آئندہ اگر میں نے تمھیں اپنی بہن کے قریب بھی کہیں دیکھا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا سمجھے۔"

اس نے میرے ہاتھوں کے درمیان اپنی دونوں کلائیوں کو ایک جھٹکا دیا اور اپنا گریبان میری گرفت سے آزاد کرا لیا۔ اُسی وقت مارگریٹ زور سے چیخی: "بند کرو سام! رک جاؤ، یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

تمام لوگ ہمارے گرد جمع ہونے شروع ہوگئے تھے۔ میں نے ٹونی کے جبڑے کی طرف گھونسا بڑھایا۔ اُس نے پھرتی سے جھک کے وار خالی دیا۔ اُس کے ساتھ ہی اس نے میرے پیٹ میں مکا مارا۔ یہ مکا دیکھنے میں بڑا زبردست نظر آرہا تھا لیکن ٹونی نے دانستہ اس کی قوت کم رکھی تھی۔ پھر فوراً اس نے میرے منہ پر مکا مارا۔ اصولاً یہ مکا بھی ہلکا ہونا چاہیے تھا لیکن پتہ نہیں کیا ہوا کہ یہ مکا بہت زور سے مجھے لگا۔ منصوبے کے مطابق میرا منہ کھل گیا اور میں پیٹ پکڑتے ہوئے دُہرا ہوگیا لیکن اس کے لیے مجھے اپنی اداکاری کی صلاحیتوں سے کام نہیں لینا پڑا کیونکہ دوسرے مکے نے واقعی مجھے تارے دکھا دیے تھے۔ میں جھکتے جھکتے فرش پر بیٹھ گیا۔

ٹونی نے میرے ردِعمل سے غالباً یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اُس کا مکا میری قوتِ برداشت سے باہر تھا۔ وہ بے اختیار معذرت کے انداز میں میری طرف بڑھا مگر اس سے پہلے کہ وہ گھبراہٹ میں کوئی الٹی سیدھی بات کہہ کے منصوبے کا بیڑا غرق کرتا، میں نے سر اٹھا کر اسے خون خوار نظروں سے دیکھا۔ "اب میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا ٹونی!" میں نے غراتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے ایلس ٹونی کو دھکیلتا ہوا ایک طرف لے جا رہا تھا اور میری بہن سہارا دے کر مجھے فرش سے اٹھا رہی تھی۔ میں نے ٹونی کی طرف دیکھ کر فضا میں گھونسا لہرایا اور دانت پیسے۔ "کان کھول کر سن لو ٹونی!" میں نے پوری قوت سے چیختے ہوئے کہا۔ "میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

مارگریٹ تشویش سے میرے چہرے کا معائنہ کر رہی تھی مگر جب اسے چہرے کی کھال کہیں سے پھٹی ہوئی نظر نہیں آئی تو وہ مطمئن ہوگئی۔ پھر اسے غصہ آگیا۔ "گھر چلو سام!" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم نے آج کی تقریب کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اب یہاں رکنے سے کیا فائدہ؟"

وہ راستے بھر مجھ سے نہیں بولی اور گھر پہنچ کر جب اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو اس نے رک کر مجھ پر نظر ڈالی۔ "مجھے امید ہے سام! بھری محفل میں مجھے رُسوا کر کے تمھیں بڑا لطف آیا ہوگا۔"

"میں ایک بھک منگے کو تمھارے ساتھ رقص کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا مارگریٹ!" میں نے زور سے کہا۔ "آج اس نے تمھارے علاوہ کسی اور لڑکی کے ساتھ رقص نہیں کیا۔ تم اس حقیقت کی تردید کرنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ یہ اطلاع مجھے ایلس نے دی ہے۔"

"تم ہمیشہ یہ بھول جاتے ہو سام کہ تم میرے بھائی ہو، باپ نہیں ہو۔" مارگریٹ نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں تم سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی کہ مجھے کس کے ساتھ رقص کرنا چاہیے اور کس کے ساتھ نہیں۔"

مارگریٹ کا ردِعمل میری توقع کے مطابق تھا۔ میرے منصوبے کی کامیابی کا بڑا انحصار مارگریٹ کے اسی قسم کے تعاون پر تھا تاکہ وہ ضد میں آکر ٹونی سے ملے اور میں لوگوں کے سامنے اپنے شدید غصے کا اظہار کرسکوں اور پھر کسی روز رائفل اٹھا کر ٹونی کو قتل کرنے کے ارادے سے نکل جاؤں۔

اگر مارگریٹ میرے زبردست اعتراض پر سعادت مندی سے سر جھکا دیتی اور ٹونی سے قطع تعلق کر لیتی تو میرے پاس ٹونی سے جھگڑا بڑھانے کا کوئی جواز نہ رہتا۔ پچھلی دفعہ جب میں نے مارگریٹ کو ٹونی سے میل جول بڑھانے سے منع کیا تھا تو میرا انداز بالکل مختلف تھا۔ میں نے اُسے حکم نہیں دیا تھا کہ وہ ٹونی سے میل جول ختم کر دے بلکہ بڑے نرم لہجے میں معقول دلائل کے ساتھ اسے اس تعلق کے نقصانات کی طرف متوجہ کیا تھا اور محض تجویز پیش کی تھی کہ وہ آئندہ ٹونی کی حوصلہ افزائی نہ کرے۔ میرے دلائل وزنی اور معقول تھے۔ اس لیے مارگریٹ میری تجویز مان گئی تھی لیکن اس بار میں نے اسے حکم دیا تھا اور اپنا ایک قانون زبردستی اس پر لاگو کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اقدام میں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ حکم سننا مارگریٹ کی فطرت کے خلاف تھا۔ اس لیے اُس کا بغاوت پر آمادہ ہونا ایک فطری بات تھی۔

"آئندہ تم کبھی ٹونی سے گفتگو تک کرنے کی کوشش نہیں کرو گی مارگریٹ!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"اچھا! دیکھا جائے گا۔" وہ پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے روز مارگریٹ سارا دن اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ بس کھانے کے لیے نیچے آئی۔ شام کے وقت میں نے ٹونی کی کھٹارا پک اپ اپنے مکان کے سامنے رُکتی دیکھی۔ میں دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھا تو مارگریٹ بڑی تیزی کے ساتھ سیڑھیاں اُترتی ہوئی نظر آئی۔ میں دروازہ کھول کے کھڑا ہوگیا۔

ٹونی ٹرک سے نکلا اور دہلیز کے قریب آیا۔ "میں گزشتہ رات کا واقعہ رفع دفع کرنے آیا ہوں مسٹر سام!" اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یقین کیجیے میرے دل میں اب بھی آپ کے لیے پہلے جیسی عزت ہے۔"

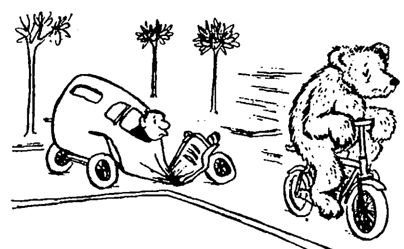
❀

"میں تمھاری معذرت قبول کرتا ہوں ٹونی!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں معذرت نہیں کر رہا ہوں مسٹر سام! کیونکہ لڑائی آپ نے شروع کی تھی۔ میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ ہمیں یہ افسوس ناک واقعہ فراموش کر دینا چاہیے۔"

میری بہن اب ورانڈے میں کھڑی تھی۔ "تم اندر کیوں نہیں آتے ٹونی؟" اُس نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے مارگریٹ!" میں نے کہا۔ "ٹونی واپس جا رہا ہے۔" پھر میں نے ٹونی کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "یہاں بہت سردی ہے ٹونی! میں زیادہ دیر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اب تم جا سکتے ہو۔"



میں مڑا اور مکان کے اندر داخل ہونے لگا لیکن مارگریٹ نے راستہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنی جگہ جمی رہی، اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ "اس مکان پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے سام! جتنا تمھارا ہے۔ ٹونی میرا مہمان ہے، اندر آجاؤ ٹونی!"

"معاف کیجیے گا۔" میں نے بہت مہذب انداز میں اپنی بہن سے کہا۔ "میں اندر جاکر ذرا اپنی رائفل لانا چاہتا ہوں۔"

میں نے مارگریٹ کو آہستگی کے ساتھ لیکن مضبوط ہاتھوں سے ایک طرف ہٹایا اور بے تلے قدموں سے آتش دان کی طرف بڑھا۔ وہاں میری رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ مارگریٹ دوڑتی ہوئی میرے پیچھے آئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے رائفل کی نال پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے میری کلائی۔ "سام کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟"

"شاید۔" میں نے جواب دیا لیکن میں نے اس کی گرفت سے کلائی چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ "یہ تم نے اچھا نکتہ سمجھایا۔ میرا وکیل عدالت میں کہہ سکتا ہے کہ میں عارضی طور پر پاگل ہوگیا تھا۔"

"پلیز۔" میری بہن خوف زدہ ہوگئی۔ "پلیز سام! میں اسے واپس بھیج دوں گی۔ خدا کے لیے تم کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر ڈالنا۔"

"میں تمھیں صرف تین منٹ دے سکتا ہوں مارگریٹ! اسے یہاں سے دفع کر دو۔"

"وعدہ کرو کہ تم یہاں سے ہلو گے نہیں؟"

"وعدہ! لیکن صرف تین منٹ کے لیے۔"

مارگریٹ میری کلائی چھوڑ کے باہر بھاگی۔ چند لمحوں بعد میں نے ٹونی کا کھٹارا ٹرک چلنے کی آواز سنی۔ پھر وہ آواز دور ہوتی ہوئی معدوم ہوگئی۔ میری بہن جب کمرے میں واپس آئی تو میں اپنی بندوق آتش دان پر لٹکا رہا تھا۔ کمرے کا اگلا دروازہ کھلا ہوا تھا اور یخ بستہ ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے لیکن اس ہوا میں اتنی ٹھنڈک نہیں تھی جتنی مارگریٹ کی آواز میں تھی۔

"میرا خیال ہے، سام! تم آہستہ آہستہ دیوانگی کی طرف بڑھ رہے ہو۔" اس نے کہا۔ "میں نے ہمیشہ تمھاری خواہشات کا احترام کیا ہے۔ تمھاری ہر بات مانی ہے، لیکن یہ میں برداشت نہیں کرسکتی کہ میرے دوستوں کا انتخاب بھی تم کرو۔ میں تم سے آخری بار کہہ رہی ہوں کہ میں ٹونی سے ضرور ملوں گی۔ میں ہر اس لڑکے سے ملوں گی جس سے ملنے کو میرا دل چاہے گا۔ میں جس سے چاہوں گی جب چاہوں گی، ملاقات کروں گی۔ مجھے تمھاری ذاتی پسند ناپسند کی کوئی پروا نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن اگر تم ٹونی سے ملیں تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔"

"اور تمھیں پولیس پھانسی پر لٹکا دے گی۔" مارگریٹ کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ "میں تمھاری پھانسی کا منظر دیکھنے ضرور آؤں گی۔"

اس رات ہم نے مکمل خاموشی میں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد مارگریٹ نے لباس تبدیل کیا اور مکان سے باہر چلی گئی۔ میں نے جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ ٹونی سے ملنے اس کے گھر جا رہی ہے اور غالباً اسے صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتی ہے کیونکہ اس نے سہ پہر کے وقت ٹونی کو بڑی عجلت میں رخصت کیا تھا۔ اب وہ اسے اس عجلت کی وجہ سمجھانے جا رہی ہے۔

دس منٹ بعد میں نے پولیس انسپکٹر ایمیس کو فون کیا۔ "میں سام بول رہا ہوں ایمیس!" میں نے اس کی آواز پہچانتے ہوئے کہا۔ "میری بہن مارگریٹ ابھی کچھ دیر پہلے گھر سے نکلی ہے اور میرا خیال ہے وہ ٹونی کے گھر گئی ہے۔ اگر واقعی وہ وہاں گئی ہے تو تمھارا فرض ہے کہ تم فوراً وہاں جا کر ٹونی کو گرفتار کر لو۔"

"کس جرم میں مسٹر سام؟" اس نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"زنا بالجبر کے جرم میں۔ مارگریٹ کی عمر ابھی اٹھارہ سال سے کم ہے۔ وہ نابالغ ہے اور ٹونی کی عمر چوبیس سال ہے۔"

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی۔ "یہ بڑا سنگین الزام ہے سام!" انسپکٹر نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ میں ٹونی کے مکان جا کر حالات کا جائزہ لیتا ہوں، پھر تمھیں فون کرکے بتاؤں گا۔"

"تم ٹونی کو میرا ایک پیغام ضرور دے دینا ایمیس! اس سے کہنا کہ اگر اس نے آئندہ اپنے مکان پر میری بہن سے ملاقات کی تو میں تمھیں تکلیف نہیں دوں گا بلکہ خود رائفل لے کر اس کے جھونپڑے میں گھس جاؤں گا۔"

"بس کرو سام!" انسپکٹر نے تیز لہجے میں کہا۔ "مجھے اس قسم کی گفتگو بالکل پسند نہیں ہے۔ اگر تم نے پھر کبھی ایسی باتیں کیں تو میں دوستی کا خیال کیے بغیر تمھیں حوالات میں بند کردوں گا۔"

"بس میرا پیغام اس تک پہنچا دینا ایمیس۔" میں نے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد مارگریٹ آندھی اور طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوئی اور اتنی ہی تیزی سے سیڑھیاں طے کر کے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ پانچ منٹ بعد ایمیس کا ٹیلیفون آیا۔ "وہ دونوں ایک دوسرے سے صرف گفتگو کر رہے تھے سام! مارگریٹ نے تو اپنا کوٹ بھی نہیں اتارا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم آخر ٹونی کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے ہو؟ وہ تو بڑا اچھا لڑکا ہے۔"

"تم نے اسے میرا پیغام پہنچا دیا ایمس؟" میں نے سرد مہری سے پوچھا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ آیندہ میں اس قسم کی بکواس سننا نہیں چاہتا۔ اگر ٹونی کو کچھ ہو گیا تو میں تمھیں فوراً قتل کے الزام میں بند کر دوں گا، سمجھ گئے کہ نہیں؟"

"ٹونی کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا بشرطیکہ وہ میری بہن سے دور رہے۔"

میں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

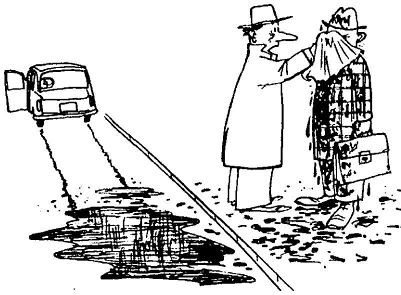
اب میں مطمئن تھا کہ میرا اور ٹونی کا جھگڑا خاصی بڑی دشمنی میں تبدیل ہو گیا تھا اور تمام حالات اطمینان بخش ہیں۔ ہمارا منصوبہ بڑی خوش اسلوبی سے کامیابی کی طرف جا رہا تھا۔ اس موقع پر اگر ٹونی مجھے گولی مار کر ہلاک کر دیتے تو کوئی اس سے یہ نہیں پوچھے گا کہ اس نے مجھے کیوں ہلاک کیا؟ میں نے سوچا کہ اب منصوبے کے آخری اور اہم حصے پر عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ میں کل رات رائفل لے کر ٹونی کے مکان پر جاؤں گا اور اس طرح میرا منصوبہ تکمیل پا جائے گا۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ میں اپنی بہن کے ساتھ باقاعدگی سے ہر اتوار کو گرجے جاتا تھا لیکن اس روز مجھے یقین تھا کہ مارگریٹ میرے ساتھ گرجا جانا پسند ہی نہیں کرے گی۔ اس لیے میں بڑے اطمینان سے شب خوابی کے لباس میں ناشتے کی میز پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ گرجا جانے کا لباس پہن کر نیچے آئی اور مجھ سے پوچھنے لگی کہ اب تک میں نے لباس کیوں نہیں تبدیل کیا؟

ناشتے کے بعد میں نے کپڑے بدلے اور ہم پک اپ میں سوار ہو کر قصبے کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے بھر ہمارے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ مارگریٹ چپ چپ سی تھی۔ گرجا میں ٹونی کے علاوہ ایمس بھی اپنی بیوی کے ساتھ موجود تھا۔ ہم ان سے علیحدہ ایک طرف بیٹھ گئے۔ دعا ختم ہوتے ہی مارگریٹ اپنی نشست سے اٹھی اور تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔ ایمس اپنی بیوی کے ساتھ باہر نکل رہا تھا۔ مارگریٹ نے اُس سے کچھ کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گرجے سے باہر نکل گیا۔ پھر مارگریٹ نے ٹونی کو روک کے اس سے بھی کچھ کہا۔ ٹونی نے بھی اثبات میں سر ہلایا اور گرجا سے باہر چلا گیا۔ جب میں اطمینان سے ٹہلتا ہوا اپنی بہن کے پاس پہنچا تو اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے گرجے سے باہر لے جانے لگی۔ باہر کچھ فاصلے پر ٹونی، ایمس اور اس کی بیوی ایک جگہ کھڑے تھے۔ مارگریٹ مجھے ان کے پاس لے گئی۔ "کیا بات تھی مارگریٹ؟" ایمس نے مجھے اور ٹونی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

مارگریٹ نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔ "بات یہ ہے مسٹر ایمس کہ میں آپ کو گواہ بنا کے آج وہ جھگڑا ختم کرنا چاہتی ہوں جو ٹونی اور سام کے درمیان صرف میری وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔"

میں ہکا بکا مارگریٹ کی صورت دیکھنے لگا۔ وہ کس سادگی اور خلوص سے میرے منصوبے کا بیڑا غرق کر رہی تھی لیکن صورتِ حال کچھ ایسی تھی



کہ میں زبان نہیں کھول سکتا تھا۔ ٹونی کی حالت بھی مجھ سے مختلف نظر نہیں آتی تھی۔ "اس بات کا مجھے پورا یقین ہے کہ میرا بھائی اس معاملے میں شروع سے غلط ہے۔ ٹونی کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔" مارگریٹ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں کل رات سو نہیں سکی۔ اسی مسئلے پر غور کرتی رہی۔ آخر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ میں حق پر ہونے کے باوجود گویا ٹونی کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کہ یہ معاملہ کسی المناک نتیجے پر ختم ہو۔ میں یہ ہرگز پسند نہیں کروں گی کہ ٹونی محض میری وجہ سے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور یہ بھی کبھی پسند نہیں کروں گی کہ میرا بھائی میری وجہ سے جیل جائے یا پھانسی پائے۔ میں ٹونی کو پسند ضرور کرتی ہوں لیکن اس کی وجہ سے اپنے بھائی کو کھونا نہیں چاہتی اور یہ بھی نہیں چاہتی کہ وہ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ سام کے سوا میرا اس دنیا میں کون ہے؟ میں اپنے بھائی سے محبت کرتی ہوں اور جانتی ہوں کہ وہ مجھے کتنا چاہتا ہے۔ اس لیے جو لوگ اس معاملے سے تعلق رکھتے ہیں میں انھیں واضح طور پر بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں آیندہ ٹونی سے کبھی نہیں ملوں گی، اُس کے ساتھ کبھی رقص نہیں کروں گی اور اگر کبھی راہ چلتے اس سے سامنا بھی ہو گیا تو اس سے گفتگو نہیں کروں گی۔"

ہم سب خاموشی سے مارگریٹ کی شکل دیکھ رہے تھے۔ اس نے نادانستگی میں خود اپنا مستقبل تباہ کر لیا تھا۔ انسپکٹر ایمس کے سامنے حلفیہ وعدے کے بعد میرے پاس ٹونی سے دشمنی جاری رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔

"مجھے امید ہے ٹونی کہ تم میری بات کا بُرا نہیں مانو گے۔" مارگریٹ نے اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "یقین کرو اس فیصلے میں میری مرضی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ مجھے تم سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ حالات تمھارے سامنے ہیں اور جو کچھ میرے دل میں تھا، میں نے بڑی صاف گوئی سے سب کے سامنے کہہ دیا ہے۔"

"ہاں — میں سمجھتا ہوں مارگریٹ!" ٹونی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ وہ غالباً منصوبے کی تباہی کا صدمہ اب تک برداشت نہیں کر سکا تھا۔

"اور سام، تم آیندہ کبھی رائفل کا ذکر زبان پر نہیں لاؤ گے؟" مارگریٹ نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے بڑی بے بسی سے مارگریٹ کو دیکھا پھر ٹونی

اور امیس کی طرف دیکھا۔ وہ سب مجھے متوقع نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"ٹھیک ہے مارگریٹ!" آخر مجھے کہنا پڑا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ پھر میں نے ایک موہوم سی امید پر ٹونی سے کہا۔ "تم مجھ سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کرنا۔"

گھر واپسی کے دوران میں مارگریٹ نے مجھ سے کہا۔ "سام! مجھے اب بھی یقین ہے کہ تم غلطی پر تھے لیکن میں نے جو کچھ کیا ہے، اس سے مطمئن ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تم میری وجہ سے کسی کو قتل کرو اور جیل جاؤ۔ تمھاری جگہ میں خود جیل چلی جاؤں گی لیکن تمھیں سلاخوں کے پیچھے بند نہیں دیکھ سکتی۔" زندگی میں پہلی بار میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میری بہن کو مجھ سے اتنی محبت نہ ہوتی۔ ایسی محبت کس کام کی جو مستقبل تباہ کر دے۔

اس رات کھانے کے بعد میں نے پک اپ اٹھائی اور ٹونی سے ملنے پہنچ گیا۔ "اب ہم کیا کریں؟" ٹونی نے بڑی مایوسی سے پوچھا۔

"کچھ اور سوچنا پڑے گا۔ جھگڑا تو کرنا ہی ہے ہمیں۔ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر چولھے پر ہاتھ سینکنے کے بعد میں نے اپنا اوورکوٹ اتارا اور میز کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹونی میرے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔

"کوئی ترکیب سوچی آپ نے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ تمھیں کوئی ایسی حرکت کرنی ہے جس کی وجہ سے مجھے غصہ آ جائے اور میں رائفل اٹھا کر تمھارے گھر کی طرف دوڑ پڑوں۔ اب ہمیں نمائشی ہاتھا پائی کی مزید ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اپنے طرزِ عمل سے یہ واضح کر دیا ہے کہ مجھے تمھاری صورت ہی سے نفرت ہے اور تمھاری طرف سے بھرا بیٹھا ہوں۔ میری حالت بارود کے ڈھیر کی طرح ہے۔ تمھاری ایک چھوٹی سی حرکت بھی دیاسلائی کا کام دے سکتی ہے۔ اس لیے اگر تم مجھے اپنی کسی حرکت سے غصہ دلا دو تو لوگ مجھ سے شدید ردِعمل کی توقع کریں گے اور ظاہر ہے میں انھیں مایوس نہیں کروں گا۔ اب بتاؤ، کوئی ترکیب سمجھ میں آئی؟"

ٹونی سر جھکا کر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ "کل ٹامی خرگوشوں کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آ گیا تھا۔" کچھ دیر بعد ٹونی نے کہا۔ "وہ اکثر خرگوشوں کے پیچھے یہاں تک آ جاتا ہے۔"

"ٹامی؟ ہمارا کتا؟ اگر وہ خرگوشوں کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آ جاتا ہے تو کیا ہوا؟"

"فرض کیجیے کہ میں اسے اپنی حدود میں گھسنے پر گولی مار کر ہلاک کر دوں؟"

"ٹامی کو؟" میں نے شدید حیرت سے کہا۔ "تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟"

"آپ سمجھے نہیں مسٹر سام!" ٹونی نے بے صبری سے کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ میرے پاس آپ کے کتے کو گولی مارنے کا ایک معقول جواز موجود ہے۔ کیوں نہ یہی بات دشمنی کی بنیاد بنائی جائے؟ یعنی میں آپ کے کتے کو گولی مار دوں اور آپ غصے میں مجھے گولی مارنے آ جائیں۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے گرم ہوتے ہوئے کہا۔ "میں تمھیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"مسٹر سام! پلیز۔" ٹونی نے کہا۔ "آپ ٹامی کی محبت میں اندھے ہو رہے ہیں۔ آپ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجیے۔ ٹامی کی عمر بارہ سال سے زائد ہے، وہ بوڑھا ہو رہا ہے۔ ابھی گزشتہ سردیوں میں وہ بیمار بھی پڑ گیا تھا۔ میں کافی عرصے سے اس کی نقل و حرکت دیکھ رہا ہوں۔ آپ کبھی غور سے اسے دوڑتا ہوا دیکھیے۔ میں کہتا ہوں بہت جلد اسے دمہ ہو جائے گا۔ لنگڑانے تو ابھی سے لگا ہے۔ چھ ماہ بعد اس کی حالت ایسی ہو جائے گی کہ آپ کو اسے گولی مارنی ہی پڑے گی۔ آپ یقین کیجیے مسٹر سام! میں کتوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔"

"ہاں، ٹامی کی عمر تیرہ سال ہے۔" میں نے کمزور پڑتے ہوئے کہا۔ وہ واقعی کچھ کچھ لنگڑانے بھی لگا تھا لیکن اگر وہ اب بھی خرگوشوں کے تعاقب میں میرے مکان سے تین میل دور ٹونی کے مکان تک آ سکتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ابھی جان دار ہے۔ "وہ ایک اچھا کتا ہے۔ اس لیے اسے گولی مارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ٹامی کی عمر کے کتوں کی ٹانگوں میں جب سختی آنا شروع ہوتی ہے تو وہ دیکھتے دیکھتے ناکارہ ہو جاتے ہیں اور طبعی موت کی صورت میں انھیں مرتے وقت شدید اذیت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اگر میں ایک آدمی ہو کر اذیت ناک موت کے تصور ہی سے خودکشی پر غور کر سکتا ہوں تو اس کتے نے کیا قصور کیا ہے کہ میں اسے اذیت ناک طبعی موت مرنے کے لیے زندہ رہنے دوں؟ یہ درست ہے کہ ٹامی سے شدید محبت کے باعث میں دل سے اسے گولی مارنے پر آمادہ نہیں تھا لیکن جذباتی فیصلے بہت کم صحیح ہوتے ہیں۔ محبت کا تقاضا یہی ہونا چاہیے کہ میں اسے تکلیف و اذیت سے بچانے کے لیے پہلے ہی گولی مار دوں۔

ایک گھنٹے بحث کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اب ہمارے سامنے اپنا منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی بس ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ ٹامی کو گولی مار دی جائے۔ اس سے بہتر کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی تھی۔ قصبے کے ہر فرد کو معلوم تھا کہ مجھے ٹامی سے کتنی محبت ہے اور لوگ یہ بھی جان گئے تھے کہ میں اپنی بہن کے معاملے میں ٹونی کا کتنا دشمن ہو گیا ہوں۔ ہم نے نئے منصوبے کی تفصیلات طے کرنے میں مزید ایک گھنٹہ صرف کیا۔ گھر واپسی سے پہلے میں نے ٹونی سے اپنی تحریر کا مسودہ طلب کیا اور اس میں ایک نوٹ کا اضافہ کیا جس میں ٹامی کو گولی مارنے کی وضاحت کی گئی تھی تاکہ مارگریٹ بعد میں میری تحریر پڑھ کے اس فیصلے کی وجہ سمجھ سکے۔

پیر سے مارگریٹ کا اسکول کھل گیا۔ وہ اسکول کی بس میں بیٹھ کر

چلی گئی۔ میں نے اپنی پک اپ اٹھائی اور قصبے کی طرف چل دیا۔ میں چونکہ منصوبے کے مطابق وقت سے پہلے ہی قصبے میں آ گیا تھا اس لیے بار میں چلا گیا۔

سردی کے زمانے میں کسانوں کے پاس فالتو وقت زیادہ ہوتا ہے اس لیے جب میں صبح کے وقت بار میں داخل ہوا تو خاصی تعداد میں گاہک بیٹھے تھے۔ میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد ٹونی بھی آ گیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر سرد مہری سے سر ہلائے۔ ٹونی مجھ سے کئی اسٹول چھوڑ کر بیٹھ گیا۔

جب اس کے سامنے بیئر کا گلاس رکھا گیا تو اس نے چسکی لینے سے پہلے بلند آواز میں کہا۔ "کل کسی کتے نے میری ایک مرغی مار دی۔ برف پر کتے کے پیر کے نشانات دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کتا بلڈ ہاؤنڈ کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔"

میں نے سر گھما کے اسے دیکھا۔ "اس علاقے میں صرف ایک کتا بلڈ ہاؤنڈ ہے اور وہ میرا ٹامی ہے۔"

اس نے بے پروائی سے کاندھے اچکائے۔ "اگر جوتا پیر میں صحیح بیٹھتا ہو تو اسے پہن لینا چاہیے۔"

"ٹامی کبھی مرغیوں پر حملہ نہیں کرتا۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"میں نے یہ کب کہا ہے کہ میری مرغی ٹامی نے ہلاک کی ہے۔" ٹونی نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "لیکن میں ایک بات جانتا ہوں۔ اب اگر میں نے کسی کتے کو اپنی مرغیوں کے قریب گھومتے دیکھا تو اس کا نام پوچھے بغیر اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔"

"اگر تم نے ٹامی کو ہاتھ بھی لگایا تو میں گولی سے تمہارا بھیجا اڑا دوں گا۔" بار میں بیٹھے ہوئے گاہک خاموشی سے ہماری گفتگو سنتے رہے۔ میرے گرم ہونے پر وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ جب ٹونی بیئر کا گلاس ختم کر کے بار سے نکلا تو سب نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس رات پھر ہلکی سی برف باری ہوئی۔ زمین پر برف کی معمولی تہہ جم گئی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ ٹامی موقع سے فائدہ اٹھا کے صبح پھر خرگوشوں کے تعاقب میں نکل جائے گا۔ برف کی ہلکی تہہ پر خرگوشوں کے نشانات بہت گہرے بنتے ہیں اور کتے اُن نشانات کے ذریعے خرگوشوں کے بلوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ میری توقعات درست ثابت ہوئیں۔ صبح مارگریٹ جیسے ہی اسکول کی بس سے روانہ ہوئی، ٹامی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ اس کا رُخ ٹونی کے مکان کی طرف تھا مجھے یقین ہو گیا کہ میرا کتا شام تک اِدھر اُدھر بھٹکتا ہوا ایک بار ضرور ٹونی کے مکان کی طرف جائے گا۔ کچھ دیر بعد میں اپنی پک اپ میں بیٹھ کر قصبے کی طرف چل دیا اور بار میں دھرنا دے کے بیٹھ گیا۔ سردی میں صبح کے وقت بار گاہکوں سے بھرا رہتا ہے لیکن دوپہر کے وقت تمام کسان کھانا کھانے اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ بارہ بجے کے بعد میں وہاں تنہا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور مارگریٹ اندر داخل ہوئی۔ "میں نے پک اپ باہر کھڑی دیکھی تو سمجھ گئی کہ تم یہاں بیٹھے ہو۔" مارگریٹ نے مجھ سے کہا۔ "تم قصبے میں کیا کر رہے ہو سام؟"

"تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟" میری تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ "تمھیں تو اس وقت اسکول میں ہونا چاہیے تھا۔"

"میں روزانہ سامنے والے ریسٹوراں میں کھانا کھانے آتی ہوں۔" مارگریٹ نے جواب دیا۔ "تمھاری گاڑی کھڑی دیکھ کر تم سے ملنے کے لیے یہاں آ گئی۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، بار کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور میرا دوست میک اندر داخل ہوا۔ اس کا مکان ٹونی کے مکان کے قریب تھا۔ ہم نے پیغام رسانی کے لیے اسی کو منتخب کیا تھا کیونکہ وہ ایک تنہائی پسند شخص تھا۔ ادھیڑ عمر کا ہونے کے باوجود وہ اب تک کنوارا تھا اور قصبے میں بہت کم دیکھا جاتا تھا۔ ہمیں امید تھی کہ میک کے کانوں تک ہمارے جھگڑے کی خبر نہیں پہنچی ہوگی۔ اس لیے اسے یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ وہ جو اطلاع مجھے پہنچا رہا ہے، اُس کا نتیجہ ہولناک بھی ہو سکتا ہے۔ اندر داخل ہو کر میک نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور مجھے دیکھ کر تیزی سے میری طرف لپکا۔ "سام، سام! میں سیدھا تمھارے گھر سے آ رہا ہوں۔" اس نے بڑی عجلت سے کہا۔ "چونکہ تم وہاں نہیں تھے اس لیے میں نے سوچا کہ تم یہاں ہو گے بلکہ ٹونی نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر تم گھر نہ ہوئے تو بار میں ملو گے۔"

"ٹونی؟" میری پیشانی پر بل پڑ گئے۔ مارگریٹ بھی چوکنی ہو گئی۔

"ہاں ٹونی نے مجھ سے کہا ہے، میں تمھیں اُس کا یہ پیغام پہنچا دوں کہ آج پھر تمھارے کتے نے اس کی مرغیوں پر حملہ کیا تھا اس لیے اس نے اسے گولی مار دی۔ اس نے کہا ہے کہ تم اپنا ٹرک لے کر آ جاؤ اور اپنے کتے کی لاش اٹھا کے لے جاؤ۔ وہ اپنے کھیت پہ گدھوں کا منڈلانا پسند نہیں کرتا۔"

"کیا کہا؟" مارگریٹ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ "اس نے ٹامی کو گولی مار دی؟"

میں اچھل کر اسٹول سے کھڑا ہو گیا۔ "کمینہ، ذلیل، اُس کی یہ مجال؟" میں نے چلا کر کہا۔ "میں اُس کا بھیجا اڑا دوں گا۔"

مارگریٹ نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "سام! تم کہاں جا رہے ہو سام؟"

"میں اسے جان سے مار دوں گا۔" میں نے غراتے ہوئے کہا۔ پھر میری آواز حلق میں رندھ گئی۔ میں نے جھٹکا دے کر مارگریٹ سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ پھر میں دوسرے ہی لمحے فرش پر چاروں خانے چت پڑا تھا۔ مارگریٹ نے پیچھے سے میری ٹانگ گھسیٹ کر فٹ بال کے کھلاڑی کی طرح مجھے فرش پہ گرا دیا تھا۔ جب تک میں زمین سے اٹھا، وہ دروازہ کھول کے باہر جا چکی تھی۔ جب میں بھاگتا ہوا باہر نکلا تو وہ پک اپ میں بیٹھی آندھی اور طوفان کی طرح ایک طرف جا رہی تھی۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

مجھے معلوم تھا کہ اب میرے ارادے کا علم ہونے کے بعد وہ سیدھی انسپکٹر ایمس کے پاس جائے گی اور اگر میں نے پُھرتی سے کام نہ لیا تو ایک بار پھر میرا منصوبہ غارت ہو جائے گا۔ میں نے پلٹ کر میک کو دیکھا اور اس کا بازو پکڑ کے اسے جھنجوڑا۔ "تمہاری گاڑی کہاں ہے میک؟ مجھے گھر چھوڑ آؤ۔"

"اگر تم ٹونی کو گولی مارنا چاہتے ہو تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔" میک نے دانش مندی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم کسی اور کو پکڑ لو۔"

ایک ایک لمحہ میرے لیے قیمتی تھا۔ مجھے مارگریٹ اور انسپکٹر ایمس سے پہلے ٹونی کے مکان پہنچنا تھا اور اس سے پہلے مجھے گھر جا کر اپنی رائفل لینی تھی اور گھر سے جیپ لے کر ٹونی کے مکان جانا تھا۔ میں میک کا بازو مضبوطی سے پکڑ کے اسے بے دردی سے اس کی گاڑی کی طرف گھسیٹنے لگا۔ اچانک میں نے اندر سے بار کے مالک کو باہر آتے دیکھا تو میں نے رُک کر اسے آنکھیں دکھائیں۔ "خبردار! تمہیں بیچ میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اُس پر میری دھمکی اثر کر گئی۔ وہ رُک گیا۔ میں نے میک کی گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسے اندر دھکیل دیا۔ پھر میں خود اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھ گیا۔ "پاگل مت بنو سام!" بار کے مالک نے وہیں سے چیخ کر کہا۔ "اس وقت تم پر غصہ سوار ہے، تم اندھے ہو رہے ہو، واپس آ جاؤ۔"

میک نے چابی گاڑی میں لگی چھوڑ دی تھی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری سے اپنے مکان کی طرف چل دیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد میک نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "سام! میں تمہیں اپنے اغوا کے الزام میں گرفتار کروا سکتا ہوں۔"

"ضرور میک!" میں نے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہیں اس کے لیے اپنی باری کا انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ کچھ دیر بعد انسپکٹر ایمس مجھے ایک قتل کے الزام میں گرفتار کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوگا۔"

میک کی گاڑی بہت پرانے ماڈل کی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے نہیں بڑھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس سست رفتاری کے باعث پیچھے سے انسپکٹر آ کر مجھے گھیر نہ لے۔ میں نے کئی بار عقبی آئینے میں دیکھا لیکن مجھے دُور دُور تک اس کی گاڑی نظر نہیں آئی۔

جب میں نے اپنے مکان کے احاطے میں گاڑی روکی تو دروازے کے سامنے میری پک اپ کھڑی تھی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مارگریٹ انسپکٹر کے پاس جانے کی بجائے گاڑی لے کر یہاں آ گئی تھی۔ "مارگریٹ!" میں نے اندر داخل ہو کر اپنی بہن کو آواز دی لیکن جواب میں خاموشی طاری رہی۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں یہ معلوم کروں، میری بہن کیا کر رہی ہے؟ میں نے اپنی رائفل اٹھائی اور اس کا چیمبر دیکھا۔ اس میں گولیاں موجود تھیں۔ باہر میک بدستور اپنی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں اسے نظر انداز کرتا ہوا اپنی پک اپ کی طرف بڑھا لیکن گاڑی میں چابی نہیں تھی۔ میں مارگریٹ کو کوستا ہوا گیراج کی طرف گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ وہاں جیپ موجود ہوگی۔ میں اس میں بیٹھ کر ٹونی کے گھر چلا جاؤں گا لیکن جیپ غائب تھی۔ مارگریٹ کی چالاکی میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ بار سے نکل کے میری پک اپ میں یہاں آئی۔ پک اپ یہاں کھڑی کر کے اس کی چابی جیب میں ڈال کے وہ اپنی جیپ میں بیٹھ کر ٹونی کے مکان چلی گئی تھی تاکہ اسے آنے والے خطرے سے ہوشیار کر دے۔

خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔ اگر میں جلدی سے ٹونی کے مکان پہنچ جاؤں اور ہم احتیاط سے اس طرح ایک دوسرے پر گولیاں برسائیں کہ مارگریٹ کو کوئی گزند نہ پہنچے تو اب بھی منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ خود میری بہن عدالت کے سامنے یہ گواہی دے گی کہ میں ٹونی کو قتل کرنے کے ارادے سے اس کے مکان

آیا تھا اور ٹونی نے صرف اپنے دفاع میں مجھ پر گولی چلائی تھی۔

میں بھاگتا ہوا رائفل سنبھالے میک کی گاڑی کے پاس آیا۔ میں نے دروازہ کھول کے اسے باہر گھسیٹا۔ "باہر نکلو میک! تم اندر جا کر انسپکٹر ایمس کو فون کر سکتے ہو کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ اس طرح تمہارا ضمیر مطمئن ہو جائے گا۔"

اس نے بڑی افسردگی سے مجھے دیکھا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے سام؟ ایک کتے کی جان انسانی جان کے برابر نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی تو سوچو کہ اس کتے کی خاطر تمہیں بھی پھانسی ہو جائے گی۔ کیا ایک کتا اس قابل ہو سکتا ہے کہ اُس پر دو انسانی جانیں قربان کی جائیں؟"

میں اس کی بات پر کان دھرے بغیر پھرتی سے اس کی گاڑی میں بیٹھا، رائفل پچھلی سیٹ پر ڈالی اور گاڑی اسٹارٹ کر کے ٹونی کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب میں نے سڑک سے اتر کے ٹونی کے مکان کی طرف جانے والے کچے راستے پر گاڑی موڑی تو دور سے مارگریٹ جیپ میں واپس آتی نظر آئی۔ اس نے قریب آنے پر جیپ روک دی اور میرا راستہ بند کر دیا۔ میں نے میک کی گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی اور رائفل اٹھا کر باہر نکلا۔ میں جیپ کے قریب پہنچا۔ مارگریٹ کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

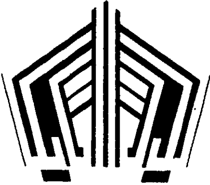
"میں تمہیں ٹونی کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی سام!" مارگریٹ نے سپاٹ لہجے میں میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اور مجھے معلوم تھا کہ اس مرتبہ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں ٹونی کو ہلاک کرنے سے نہیں روک سکے گی ——— پھر ٹامی صرف تمہارا ہی نہیں میرا کتا بھی تھا۔"

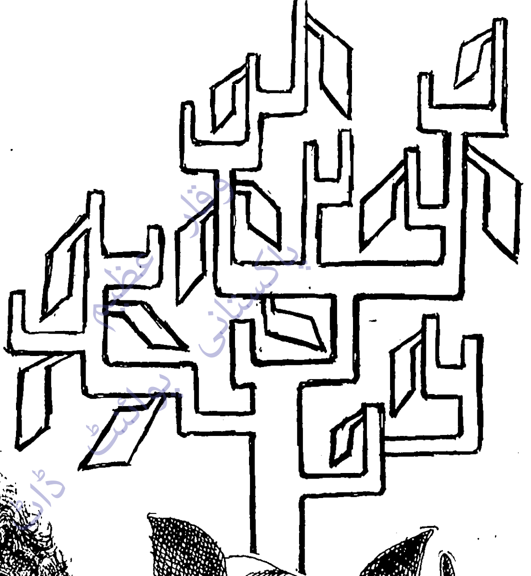
پہلی بار میری نظر جیپ کی پچھلی نشست پر رکھی ہوئی شاٹ گن پر پڑی۔



عقل کو اختیار ہے کہ وہ عرب نوجوان جابر بن یوسف کے ساتھ پیش آنے والے واقعات تسلیم کرنے سے انکار کر دے مگر جو کچھ بیروت کے اُس ضدی، سرکش، جذباتی ذہین اور شگفتہ مزاج نوجوان پر تاریک براعظم کے فسوں خیز ماحول میں گزری، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کی ہولناک سرگزشت عبرت انگیز واقعات پر مشتمل ہے۔ اگر جابر بن یوسف جیسا شوخ نوجوان اُس حسین و جمیل انگریز لڑکی فلورا سے بیروت میں دوبارہ ملاقات نہ کرتا تو اس داستان کا آغاز نہ ہوتا۔ آکسفورڈ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ فلورا کی یاد دل میں لیے بیروت آ گیا تھا کہ اتفاقاً فلورا اسی شہر میں نظر آ گئی اور وہ اپنے گھر اپنے والدین کو خیرباد کہہ کے اُس کے ساتھ ایک طویل بحری سفر پر روانہ ہو گیا۔ فلورا ڈربن جا رہی تھی لیکن راستے ہی میں سمندر کے ایک خوفناک طوفان نے ان کا جہاز غرق کر دیا۔ حفاظتی کشتی میں صرف چند افراد اپنی جانیں بچا سکے۔ کشتی مشتعل موجوں کے رحم و کرم پر کسی نامعلوم سمت رواں تھی۔ کچھ نے بھوک پیاس سے نڈھال ہو کے دم توڑ دیا۔ سمندر نے ایک صبر آزما انسانی جدوجہد کے خلاف کچھ اور ہی ٹھان رکھی تھی۔ آخر نویں دن عالمِ نزع میں انھیں کہیں دور خشکی کا ایک ٹکڑا دکھائی دیا۔ ساحل پر سیاہ فام برہنہ حبشیوں نے اپنے چمک دار نیزوں کے ساتھ ان کا استقبال کیا جنھوں نے مزاحمت کی، اپنا رشتہ رنگ و بو کی اس دنیا سے توڑ لیا۔ صرف پانچ افراد زندہ بچے۔ فلورا اور جابر کے علاوہ ایک ہندی بوڑھا سرنگا، اُس کی خوب صورت نازک اندام بیٹی سریتا، ایک ڈاکٹر جواد۔ ان سب کو تنگ و تاریک جھونپڑی میں قید کر دیا گیا۔ جابر افریقی زبان میں کچھ شُدبُد رکھتا تھا جلد ہی انھیں پتہ چل گیا کہ وہ ایک طلسمی جال میں پھنس گئے ہیں۔ نیز یہ سرزمین جزیرۂ تُوری کے نام سے موسوم ہے اور ماس وسیع و عریض سلطنت کا ایک حصّہ ہے جہاں اقابلا نامی ایک جلیل القدر عورت حکمراں ہے۔ تُوری میں دو قبیلے آباد ہیں۔ ایک کا سردار شوالا دوسرے کا کالاری ہے۔ یہاں نیولے کو تقدس کا درجہ حاصل ہے اور اُس کا نام مرجا ہے۔ اکا کا ہے یا وہ دیوتا جارا کا کاکے

سب رنگ کا ایک تحیّر خیز پُراسرار سلسلہ





تقدس کی علامت ہے۔ جارا کا کا کی کھوپڑی جس کے پاس ہوتی ہے، وہ اعزاز و فضیلت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

زنداں کی پہلی رات ہی قیامت کی گزری۔ اُن کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا گیا۔ نوجوان جابر اس ناگہانی عذاب سے نجات پانے کی کشمکش کرتا رہا اور اس کا بوڑھا ہندی ساتھی سرنگا ہندی شکل وصورت کی ایک چھوٹی سی مورتی کے سامنے عقیدت سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پہلی ہی رات سردار شوالا نے جابر کی محبوبہ فلورا کو اغوا کر لیا۔ جابر سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ اُس نے مرنے کا ارادہ کر لیا اور اپنے حُسنِ تدبر سے دو پہرے داروں کو ہلاک کر کے جنگل میں روپوش ہو گیا۔ پھر اُس نے جزیرے کے ایک معزز طبیب کو ہلاک کر کے اُس کے گلے سے جارا کا کا کی کھوپڑی حاصل کر لی۔ اُس نے یہ کارنامہ انجام تو دے دیا تھا مگر اب تعاقب کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جنگل جنگل بھاگتا رہا۔ اُس نے ایک غار میں پناہ لی۔ یہ غار نہیں تھا کوئی سرنگ تھی جو کہیں ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ شوقِ جستجو میں جابر آگے بڑھتا گیا۔ اچانک سرنگ میں روشنی ہو گئی اور دلکش نسوانی آوازیں آنے لگیں۔ ان آوازوں کے تعاقب میں چلتے چلتے وہ ایک محل میں پہنچ گیا۔ اُس کے سامنے سفید پتھروں سے بنا ہوا ایک عالی شان محل کھڑا تھا اور وہاں جو لڑکی موجود تھی جابر نے اس سے پہلے ایسی حسین دوشیزہ نہیں دیکھی تھی۔ وہ سراپا برہنہ تھی۔ یہ شان دار عمارات اور یہ خیرہ کن جمال دیکھ کے جابر کے عقل و ہوش گم ہو گئے لیکن جب وہ ماہ جبیں التفات پر آمادہ نظر آئی تو چشم زدن میں یہ منظر بکھر گیا۔ وہ پری چہرہ نہایت کرب کے عالم میں دھوئیں میں تحلیل ہو گئی اور جابر ناکام و نامراد اپنی جھونپڑی میں واپس آ گیا۔ جب اُس نے یہ روداد اپنے ہندی ساتھی سرنگا کو سُنائی تو وہ بے چین ہو گیا اور وہ غار دیکھنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ وہ دونوں پہرے داروں کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر غار کی تلاش میں بھٹکنے لگے۔ غار انھیں نظر نہیں آیا البتہ سرنگا کا متحرک جسم پتھر کے جان

تاریک برِ اعظم کا افسوں ○ جابر بن یوسف الباقر



مجسمے میں تبدیل ہوگیا۔ جابر اس افتاد سے خوف زدہ ہو کے جنگل میں بھاگ نکلا اور خود کو ایک غار میں چھپانے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ غار اصل میں توری کے کاہنِ اعظم سمورال کے مکان کا دروازہ تھا۔ خلافِ توقع کاہنِ اعظم اس سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آیا۔ اس کی عبادت گاہ جانوروں کی کھوپڑیوں اور دوسری حیرت انگیز اشیا سے اٹی پڑی تھی۔ ایک کونے میں ایک طلسمی کڑھاؤ رکھا تھا جس میں کھولتے تیل کی سطح پر کاہنِ اعظم توری کے مناظر دیکھ لیا کرتا تھا۔ جابر یہیں ٹھیر گیا۔ سمورال کی نوجوان لڑکی ترام اس سے مانوس ہوگئی۔ اس کے نوعمر لڑکے جرال کو بھی اس نے اپنا ہمنوا بنا لیا۔ یہاں آ کے جابر کو اندازہ ہوا کہ مہذب دنیا کے یہ بدنصیب لوگ کتنی بڑی مصیبت میں گھر گئے ہیں۔ نجات ناممکن ہے۔ اس نے عمر رسیدہ سمورال اور نوعمر جرال کے ناقابلِ یقین طلسمی مظاہرے دیکھے تھے۔ وہ اسی غار میں چھپا رہتا لیکن ایک روز سمورال کے طلسمی کڑھاؤ میں ایک مظاہرے کے دوران میں اسے نظر آیا کہ فلورا کے بعد اس کی دوسری ساتھی لڑکی سربیا دوسرے سردار کالاری کے عتاب میں آگئی ہے۔ وہ یہ منظر دیکھ کے سمورال کی اجازت کے بغیر غار سے بھاگ نکلا اور کالاری کے سر پہ جا پہنچا۔ اس کے گلے میں لٹکی ہوئی جادو کی کھوپڑی نے راستے میں اسے سرشور وحشیوں کے نیزوں سے بچائے رکھا۔ کالاری سرنگا کی حسین لڑکی سربیا کو برہنہ کر چکا تھا اور اب اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ جابر بن یوسف اس جزیرے کے لوگوں کی طلسمی طاقتوں سے آگہی کے باوجود کالاری پر جھپٹ پڑا۔ جابر بازی بے عقلی تھی۔ جابر اپنی موت سے کھیل رہا تھا۔

وہ مورتی جو سرنگا کی نظروں کے سامنے رہا کرتی تھی، وہی مورتی زندہ عورت کے روپ میں اب جابر بن یوسف کی مدد کے لیے کھڑی تھی۔ اس کے نقوش ہندی تھے۔ جابر پر پہلی بار اپنے بوڑھے دوست سرنگا کے سحر ہونے کا راز منکشف ہوا۔ دیوہیکل کالاری جابر پر حاوی آگیا تھا اور قریب تھا جابر کا تنفس اس کا ساتھ چھوڑ دیتا کہ وہی عورت نمودار ہوئی اور جابر نے ڈرامائی انداز میں کالاری کو جہنم رسید کردیا۔ اس کے بعد جابر نے کوئی تاخیر نہیں کی۔ وہ برہنہ سربیا کو پشت پہ لادے پوری قوت سے جنگل کی طرف دوڑنے لگا۔ اس کے پیچھے چلاتا ہوا ہجوم اور کالاری کا رفیق بندر کا مو تھا۔ وہ ہانپتا کانپتا سمورال کے غار میں گھس گیا اور سمورال نے اس بدحواس نوجوان کو یہ خوش خبری سنا کے حیرت میں ڈال دیا کہ اب وہ کالاری کا جانشین ہے کیونکہ اس نے کالاری کو ختم کردیا ہے۔ مہذب دنیا کے ایک اسیر بلا شخص کو یہ خبر دیوانہ بنا گئی۔ جابر نے سمورال کے مشفقانہ رویّے کے پیشِ نظر اور اس کی رفاقت کے لیے ایک اور جسارت کر ڈالی۔ اس نے سمورال سے اس کی لڑکی ترام مانگ لی۔ سمورال نے انکار نہیں کیا۔ اسے کچھ دن سرداری کے آداب سکھائے، ایک پُراسرار مالا بطور عطیہ دی اور اپنی بیٹی ترام جابر کے حوالے کردی۔ پھر تزک و احتشام سے دیوتاؤں کی دعائیں اور ابو ئیں اوڑھے جزیرۂ توری میں کالاری کی مسند پر بٹھا دیا گیا۔ قبیلے کی تمام عورتیں اب اس کے تصرف میں تھیں، پوری بستی اس کے اشاروں کی غلام تھی لیکن اس اعزاز کے باوجود اس کے باقی مہذب ساتھی ابھی تک قید و ابتلا کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کی محبوبہ فلورا شوالا کے قبضے میں تھی۔ اس کا بوڑھا ہندی دوست سرنگا اپنی پُراسرار دیوی کے ذریعے پتھر کے مجسمے سے آزاد ہو کے شوالا کی تحویل میں جا چکا تھا۔ سمورال نے اس کی لڑکی سربیا کو بھی اس کے پاس پہنچا دیا تھا۔ وہ تینوں شوالا کے علاقے اور قبیلے میں تھے۔ ڈاکٹر جواد اپنے ساتھوں سے نیم پاگل ہو چکا تھا۔ جابر نے سب سے پہلے فلورا کی بازیابی کے لیے شوالا سے مفاہمت کرنی چاہی جسے شوالا نے حقارت سے مسترد کردیا۔ نتیجتاً جابر کے دل میں شوالا کے خلاف نفرت کی گرہ پڑ گئی۔ وہ شوالا کو زیر کرنے کے لیے عملی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسی اثنا میں تاریک برّاعظم کی رفیع الشان ملکہ آقابلا نے اسے طلب کرلیا۔ آقابلا کے قصر تک اس کا سفر عجیب و پُراسرار تھا۔ وہ غنودگی کے عالم میں دھواں دھواں بادلوں، پُرشکوہ ایوانوں اور لالہ زاروں سے گزار کے آقابلا کے قصر میں پہنچا دیا گیا۔ حسن و جمال کے یہ نظارے دیکھ کے جابر کی عقل دنگ اور نگاہ خیرہ ہوگئی۔ قصر کے در و بام سے روشنی اور موسیقی پھوٹ رہی تھی۔ قدم قدم پر مہ تمثال دوشیزائیں کے بیسے منڈلا رہے تھے۔ سیاہ سرزمین میں یہ شان و شوکت، رنگ و نور کا یہ سمندر، یہ ایوان، یہ سانچے میں ترشے ہوئے بدن۔ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ تو ماضی کی کسی داستانِ پارینہ کا کوئی جلوہ تھا۔ جابر زمین کی جنت میں موجود تھا۔ یکایک گھن گرج کے ساتھ درمیانی چھت شق ہوئی اور آقابلا کا تخت نگار تخت اتر کے جابر سے کچھ فاصلے پر ہوا میں معلق ہوگیا۔ آقابلا کا سرخ و سپید بدن سرخ پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا اور کائنات کا سب سے حسین چہرہ سب سے دل فریب بدن جابر کی بینائی پھینٹنے لے رہا تھا۔ آقابلا نے اسے اپنی ترجمان اشمار کی زبانی گفتگو کا شرف بخشا۔ وہ صرف مسکراتی رہی۔ یہ گفتگو اتنے دل نشیں انداز میں ہوئی کہ جابر کی بساطِ ہوش الٹ گئی۔ وہ آقابلا کو دیکھتا رہا اور اشمار کی زبانی جزیرۂ توری میں اپنی حدود سے متجاوز ہونے کے الزام سنتا رہا۔ پہلی ہی نظر میں آقابلا کے حسنِ جہاں سوز نے اسے مسحور کرلیا۔ اس نے کچھ نہیں سنا مگر جب کچھ کہنے پر آیا تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے۔ اس شعلہ بدن کی تپش نے جابر جیسے مضبوط نوجوان کو موم کی طرح پگھلا دیا۔ اس نے فلورا کے حصول کے لیے شوالا سے مبارزت کی اجازت طلب کی جو کچھ اکراہ کے بعد منظور کرلی گئی۔ یہ محفل آناً فاناً برخاست ہوگئی۔ جابر کا بس چلتا تو وہ اسی قصر میں رہ جاتا۔ جب وہ واپس اپنی جھونپڑی میں پہنچا تو ایک ٹوٹا ہوا شخص تھا اور توری کا وہ یادگار مقابلہ منعقد ہوا۔ اس دن جابر کو آقابلا کا دوبارہ دیدار نصیب ہوا۔ وہ اپنے پری چہرہ دستے کے ساتھ ایک اونچے تخت پر فروکش تھی۔ جابر اپنی تمام کوششوں کے باوجود ہزیمت کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت ایک بار پھر سرنگا کی پُراسرار دیوی نے نمودار ہو کے جنگ کا نقشہ پلٹ دیا۔ جابر کو جیسے دوبارہ توانائی مل گئی۔ شوالا کو شکست فاش نصیب ہوئی۔ دیوی کی اچانک دخل اندازی شاید تاریک برّاعظم کے نادیدہ دیوتاؤں کو ناگوار گزری۔ لوگوں نے دیکھا دیوی شیشے کے ایک ٹوٹے جار میں مقید ہوگئی ہے اور جار فضا میں معلق ہے لیکن دوسرے ہی لمحے چھناکا ہوا اور دیوی جار توڑ کے فضاؤں میں گم ہوگئی۔ شوالا ہار چکا تھا۔ اب جابر کو مقابلے کی شرط کے تحت شوالا کے تصرف میں اپنی کوئی پسندیدہ چیز مانگنے کا حق ملا۔ جابر نے فلورا کے بجائے سربیا کو طلب کرکے سب کو حیرت میں ڈال دیا مگر چونکہ سربیا پر شوالا نے قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ کاہنِ اعظم نے اسے خود اس کے باپ سرنگا کے پاس شوالا کے علاقے میں بھیج دیا تھا اس لیے جابر کو دوبارہ حق دیا گیا کہ وہ کوئی اور چیز یا زر طلب کرے۔ آقابلا کی موجودگی میں وہ فلورا کو مانگنے کی غلطی نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے فیصلہ فلورا پر چھوڑ دیا۔ فلورا نے حیرت انگیز طور پر شوالا کے حق میں رائے دی۔ اس سانحے سے جابر کے سینے میں جیسے کوئی چیز منہدم ہوگئی اور وہ صرف آقابلا کے تصور میں تجرد کے دن گزارنے لگا۔ وہ ہر عورت سے دور رہا۔ اس نفس کشی کا انعام جابر کو آقابلا کی خاص کنیز اشمار کی صورت میں ملا۔ دل شکستہ جابر نے اسے اپنے محبوب کا عکسِ جمیل سمجھا۔ وہ دیوانوں کے مانند ٹوٹ کے اس سے متمتع ہوا۔ ساتھ ہی اشمار سے اس نے بعض پیچیدہ پُراسرار علوم بھی حاصل کیے۔

ابھی دلوں ایک ہولناک واقعہ رونما ہوا۔ جابر کو کالاری کے تہ خانے میں کامو نامی ایک بندر بھی ملا تھا جو نے کسی نامعلوم مخاصمت کے باعث جابر کی شریکِ زندگی ترام کو قتل کردیا اور موقع پا کے کہیں فرار ہوگیا۔ جابر کا گھر اجڑ گیا۔ سینہ سونا ہوگیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اشمار بھی خاموشی سے آئی تھی اسی طرح غائب ہوگئی اور کاہنِ اعظم سمورال نے کوئی وجہ بتائے بغیر جابر سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ جابر نے ان لمحوں میں آقابلا سے ملنا چاہا مگر اسے شرفِ باریابی نہیں بخشا گیا۔ ان مصائب نے اسے ذہنی کشمکش میں مبتلا کردیا۔ وہ سرداری کے باوجود ایک عذاب ناک زندگی بسر کر رہا تھا۔ اب آقابلا ہی اس کا مقصود تھی مگر وہ اس سے بہت دور تھی۔ اس کے حصول کے لیے جابر کا قد بہت چھوٹا تھا۔ شاید اس کا قد بڑھانے ہی کے لیے اسے ایک خود کار کشتی کے ذریعے جزیرۂ باگمان بھیج دیا گیا۔ باگمان میں دن اور رات کی کوئی حد نہیں تھی۔ ہر وقت ملگجا اندھیرا طاری رہتا تھا۔ جب وہ اس نئے جزیرے میں وارد ہوا تو یہاں کے سردار لوکا سا نے اس سے نہایت ذلت آمیز سلوک کیا۔ اس کی تواضع سڑے ہوئے انسانی گوشت سے کی گئی اور اسے باگمان کی ایک نوجوان دوشیزہ قربیا کا خون پینے پر مجبور کیا گیا۔ باگمان میں سب سے بڑی حیثیت لوریا کو حاصل تھی جو آقابلا کی نائب تھی۔ جزیرے کا سردار اس کی ماتحتی میں نظم و نسق چلاتا تھا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اسے لوریا پر بھی تصرف حاصل رہتا تھا۔ جابر نے قید و بند کی یہ زندگی کسی نہ کسی طرح گزار دی۔ اس نے ہر مصیبت آزمائش سمجھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے لوکا سا کی خدمت میں پیش کردیا گیا جہاں لوکا سا نے اپنے اشتعال انگیز توہین آمیز رویّے سے اسے بے حد برہم کردیا اور جب باگمان کا سالانہ جشن، جشنِ لوریا منایا گیا تو جابر نے اپنی جسمانی طاقت کے شعبدے دکھا کے سب کو دنگ کردیا۔ وہ لوریا جیسی حسین و جمیل لڑکی کی نگاہوں میں سرخ رو ہوگیا۔ لوریا نے اسے دو مالائیں عطا کیں۔ لوریا کی یہ نوازش لوکا سا کو پسند نہیں آئی اور اس نے جابر کو اس کی زندگی کی سب سے خطرناک مہم کے لیے صحرائے زارشی روانہ کردیا۔ صحرائے زارشی ایک بے آب و گیاہ وسیع و عریض لق و دق صحرا تھا۔ زارشی میں جابر نے نہایت استقامت سے دراز ریش بوڑھوں کے ساتھ برسوں دہکتی ہوئی آگ کے گرد ریاضت کی۔ یہ بوڑھے آگ سے نہیں ڈرتے تھے۔ آگ ہی ان کی زندگی کا مقصود و محور تھی۔ اس ریاضت کی تکمیل پر جابر کو شپالی نامی ایک انگارا انعام میں ملا جو جابر کے ہاتھوں میں آتے ہی گوہرِ آب دار میں تبدیل ہوگیا۔ آگ کے گرد اس خونیں ریاضت سے آگے چل کے صحرائے زارشی ہی میں جابر کو ایک شیر خوار بچے کا خون کرنا پڑا اور ایک قوی الجثہ جانور ڈگبی سے اس کا ہلاکت خیز معرکہ ہوا۔ اس نے درندے ڈگبی کو چیر پھاڑ کے اس کے سینگ محفوظ کرلیے۔ صحرائے زارشی میں اس کی ملاقات اسٹالا سے ہوئی جسے لوکا سا نے معزول کردیا تھا اور اب وہ صحرا میں دیوتاؤں کی خوشنودی اور باگمان کا اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ زارشی جابر کے نفس کے لیے ایک بھٹی تھی جہاں سے تپ کے وہ ایک مضبوط طاقت ور شخص کی حیثیت سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اب وہ اپنے اندر ایک نئی توانائی اور سرمستی محسوس کرتا تھا۔ یہ تمام آزمائشیں عبور کرکے وہ باگمان واپس آگیا اور آتے ہی اس نے لوکا سا سے ایک خوں ریز جنگ کی۔ لوکا سا عبرت ناک موت مارا گیا۔ وہ باگمان کا ناظم الامور قرار دے دیا گیا اور لوریا کے کسمساتے ہوئے مرمریں بازو اس کی گردن میں حمائل ہوگئے لیکن اس کی منزل لوریا نہیں، آقابلا تھی۔ اس نے لوریا کو بھی مایوس کیا اور باگمان میں چند دن قیام کرکے زارشی کے صحرا میں بھٹکتے ہوئے معزول اسٹالا کو باگمان بلا کے اسے اپنی نیابت سونپ دی۔ وہ باگمان میں اپنی غیر معمولی خوبیوں کی وجہ سے بہت مقبول ہوگیا تھا۔ جب وہ رخصت ہوا تو آنسوؤں اور دعاؤں سے اسے وداع کیا گیا۔ توری واپس جاتے ہوئے اس کی نگاہوں میں صرف آقابلا کا جلوہ تھا اور ایک جوش تھا، ایک ولولہ تھا کہ وہ آقابلا کے پاس کامیاب و کامران ہو کے جا رہا ہے۔

مگر وہ توری نہیں پہنچ سکا۔ راستے میں تاریک برّاعظم کے باغیوں نے اسے اچک لیا۔ پہلے اس کی کشتی سمندری طوفان کی نذر ہوئی پھر اسے انگروما کی باغی سرزمین پر کھینچ لیا گیا۔ یہ جزیرہ آقابلا کے باغیوں کی کمین گاہ تھا۔ یہاں تاریک برّاعظم کے برگزیدہ ترین افراد جمع تھے اور آقابلا کے زوال کے لیے مشترکہ جدوجہد کر رہے تھے۔ انگروما کے فاضلوں نے جابر بن یوسف کے شایانِ شان اس کی پذیرائی کی اور اسے اپنی تحریک میں شامل کرنا چاہا۔ ان کا یقین تھا کہ وہ ایک دن آقابلا کا تخت چھین لیں گے۔ جابر بن یوسف نے صاف انکار کردیا اور علاوہ ازیں وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا مگر کوشش کے باوجود انگروما سے فرار ہونے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ناچار اس نے اپنی قوت میں اضافے کی خاطر اور فرار سے مایوس ہو کے ان سرکشوں سے مفاہمت کرلی۔ انگروما کے نگراں گرونٹانے انگروما کی حسین عورتیں اس کی خدمت میں پیش کیں۔ نیشا جس نے مشروبِ حیات پیا تھا۔ کیشا جسے انگروما کے ساحروں نے پتھر میں مقید کردیا تھا وہ جب چاہتے اسے متحرک کرلیتے۔ انگروما کے جید فاضل گورمے کی رہنمائی میں اس نے بہت سے طلسمی علوم سیکھے اور ایک پُراسرار عمل کے ذریعے ہربیکا کا شکار کھیلا۔ ہربیکا کی خوبی یہ تھی کہ اس کی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ سمندر میں ڈال دی جاتی تو دوسری آنکھ سمندری نقل و حرکت کا پتہ دیتی تھی۔ یہاں وہ راہبوں کے غار میں بھی گیا۔ انگروما میں اس کے دن ضائع نہیں گئے۔ وہ علوم سیکھتا اور کڑی آزمائشوں سے گزرتا رہا۔ وہ کچھ کچھ اس خیال کا حامی بھی ہوتا گیا کہ آقابلا کا زوال ایک دن غیر ممکن ہو جائے گا۔ انگروما میں ڈھائی سال گزر گئے۔ ایک دن اچانک سرنگا کی پُراسرار دیوی نجات کا پروانہ بن کے انگروما میں نمودار ہوئی۔ پھر آگ اور خون اور طلسمی شعبدوں کا بازار گرم ہوا۔ دیوی انگروما کے ساحروں کی آنکھوں پر پردہ ڈال کے جابر کو سمندر میں لے آئی۔ چلتے وقت جابر نے مشتعل ہو کے گورمے کا طلسم کدہ پھونک ڈالا تھا اور ہربیکا کی آٹھ آنکھوں والا پتھر اپنے قبضے میں کرلیا تھا۔ بھاگتے وقت سارا انگروما جابر کو روکنے کے لیے امڈ آیا تھا لیکن دیوی کے سحر کے آگے ہر سحر ماند ہوگیا۔

توری کے لوگ ایک عرصے بعد اپنے بلند قامت، وجیہہ اور فتح مند سردار کو دیکھ کر دیوانے ہوگئے۔ اس عرصے میں قبیلے میں جتنی لڑکیاں جوان ہوئی تھیں، جابر کے ملاحظے کے لیے پیش کردی گئیں مگر اس بت طناز کی جانب سے کوئی سلسلہ جنبانی نہیں ہوئی۔ آخر جابر نے اس کی توجہ کے حصول کے لیے ایک سیاسی حربہ آزمایا۔ اس نے اپنے معاصر شوالا کے قبیلے کے لوگوں پر اپنے علاقے کے دروازے کھول دیے۔ سرنگا پہلے ہی بھاگ کے جابر

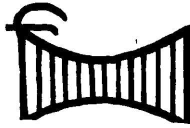
کے پاس آگیا تھا اور سرتیا بھی اب جابر کے ساتھ تھی۔ جابر کے قبیلے کی خوش حالی کا ذکر سن کے رفتہ رفتہ ہجرت شروع ہوئی۔ شوالا کے ظلم سے سب نالاں تھے اور جابر بن یوسف جیسے طاقت ور شخص کی اماں میں آنا چاہتے تھے۔ شوالا کے قبیلے کی تمام آبادی اِدھر منتقل ہوگئی، صرف فلورا اور بیزنار سے آیا ہوا ایک تنومند شخص شوالا کے پاس رہ گیا۔ عملی طور پر شوالا کو شکست ہو چکی تھی۔ حکمرانی کرنے کے لیے اب اُس کے پاس کیا رہ گیا تھا؟ صرف زمین اور درخت۔ پھر بھی ہوا جس کی جابر کو توقع تھی۔ شوالا مقابلے پر اُتر آیا اور جابر نے انگرو ما میں سیکھے ہوئے ایک پُراسرار عمل کے ذریعے اُس کا نچلا دھڑ پتھر میں تبدیل کر دیا۔ شوالا کی شکست بڑی شرم ناک تھی۔ جابر بن یوسف اب توری کے دونوں قبیلوں کا سردار تھا لیکن شوالا نے شکست قبول کرنے سے پہلے ایک چالاکی کی تھی کہ فلورا کو بیزنار کے سرکش نوجوان نرنگا کو بطورِ عطیہ دے دیا تھا اور وہ اُسے لے کے توری سے دُور نکل گیا تھا۔ فلورا اب بھی جابر کو نہیں ملی۔ اُدھر آقا بلا کی طرف سے بھی سرد مہری تھی۔ جابر ان فتوحات کے باوجود ایک تنہا شخص تھا۔ سرنگا توری کے کسی غار میں ریاضت کے لیے جابر سے دُور جا چکا تھا اور اُس کی شرمیلی لڑکی سرتیا ہی جابر کے دکھوں پر مرہم رکھتی تھی۔ سرتیا سرنگا کی دیوی کی اماں میں تھی اور وہ جابر کے دوست کی لڑکی تھی۔ جابر تمام تر قربت کے باوجود اُس کے آتشیں بدن سے کوئی حظ نہ اُٹھا سکا۔ یوں سرتیا رفتہ رفتہ اپنے حسنِ سلوک، ایثار، میٹھے پن اور اپنی منفرد جاذبیت کے سبب اس پر غالب آرہی تھی۔ اتفاق سے اُنھی دنوں مہذب دنیا کا ایک بدنصیب قافلہ جزیرۂ توری کے ساحل پر وارد ہوا۔ اُن میں چار لڑکیاں بھی تھیں۔ بہت دنوں بعد اِن لوگوں نے کپڑوں میں ملبوس لوگ دیکھے۔ انھوں نے ان کا سامان، گھڑیاں وغیرہ چھین لیں اور انھیں جھونپڑیوں میں قید کر دیا۔ اُسی وقت بارگاہِ آقا بلا میں جابر کی طلبی ہوگئی۔ ایک مدت کی آرزو پوری ہونے کا وقت آیا۔ وہ بعجلت تمام اپنے تمام نوادر سمیٹنے پر سجا کے اُس کے روبرو پہنچا تو اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے لیکن اُس کے دیدار کی اتنی آرزوؤں اتنی شدتوں کے بعد بھی آقا بلا اپنے تخت ہی پر متمکن رہی۔ صرف اتنا ہوا کہ اُس کا پیر چومنے کی اجازت دے دی گئی۔ جابر نے اپنا دستِ وحشت اُس کی ساقِ سیمیں تک رسا کر کے اُس کے بدن پوش پھولوں میں سے ایک پھول نوچ لیا۔ اس بار آقا بلا نے پہلے سے زیادہ توجہ دی تھی مگر اس بار جابر کی شدتیں بھی سوا تھیں۔ اُن کے درمیان ایک فاصلہ برقرار رہا۔ ترجمان بھی درمیان میں موجود رہی اور جابر اپنے جذبوں کا ہذیان بکتا رہا اور اسی عالم میں واپس آگیا۔

آقا بلا کی طرف سے اس گریز نے اُس میں سرکشی پیدا کر دی۔ اُس نے خونیں عبادتوں کا سلسلہ شروع کیا اور مہذب دنیا کا تمام قافلہ جارا کا کا کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دیا۔ صرف چار لڑکیاں زندہ بچ گئیں اور ایک مہذب نوجوان شراڈ بچا کیونکہ اُسے جارا کا کا کی رُوح نے اماں دے دی تھی۔ جابر کو اس امریکی نوجوان سے کد سی ہوگئی تھی۔ وہ اُسے اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا اور اس کا گمان تھا کہ آقا بلا اور جارا کا کا کی رُوح اب شراڈ پر مہربان ہوگئی ہے۔ چنانچہ جابر نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ شراڈ کی منگیتر جینا کو خود اُس کے ہاتھوں جارا کا کا پر قربان کرا دیا اور باقی تین لڑکیاں اپنے تصرف میں رکھیں۔ اُس نے شراڈ کو اذیت ناک سزائیں دیں لیکن وہ ہر سزا خندہ پیشانی سے جھیلتا رہا۔ جابر پر جنون طاری ہوگیا۔ وہ سردار ہونے کے باوجود شراڈ کو قتل نہیں کر سکتا تھا۔ جابر نے جزیرے میں قتل و خون کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا۔ کبھی کبھی وہ سرنگا کے غار میں جاتا تھا۔ سرنگا اب بھی نجات کے بارے میں فکر مند تھا۔ اِدھر جابر نے سمورال کو باقاعدہ اپنا اُستاد بنا کے پُراسرار علوم کی مزید تربیت حاصل کرنی شروع کر دی تھی۔ سرنگا کی لڑکی سرتیا بھی اب اس کی وحشتوں سے نالاں تھی۔ اسی عالمِ اشتعال میں اُسے اسمار جانے کا حکم ملا۔ اسمار میں آقا بلا کی نائب شوطار کی حکومت تھی اور عورتوں کو مردوں پر فوقیت حاصل تھی۔ مرد عورتوں کے غلام تھے۔ اسمار تاریک برِاعظم کی جنت تھی۔ یہاں جابر کی غیرت پر پے در پے تازیانے لگے۔ شوطار کی نائبین نے اُس کا نیلام کیا۔ وہ اذیت ناک مرحلوں سے گزرتا رہا۔ اسمار کی ملکہ شوطار کو بیزنار میں مقیم ساحرِ اعظم جالوش کی اعانت حاصل تھی اور اُس کے محل میں ایک طلسمی عکس نما نصب تھا جس سے وہ اسمار میں ہونے والی ہر سرگرمی دیکھ لیتی تھی۔ شوطار کے محل تک پہنچنا مشکل کام تھا لیکن جابر نے انھی مشکل حالات میں اپنی غیر معمولی ذہانت، شجاعت کا سکہ جما دیا۔ اُس نے اپنی سرکشی کے کچھ ایسے مظاہرے کیے کہ اُسے مجبوراً شوطار کی خدمت میں پیش کر دیا گیا جہاں اُس نے اپنی فصاحت کا جادو جگایا اور شوطار کو شیشے میں اُتارنے میں کامیاب ہوگیا اور ایک رات اُس کی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھا کے اُس نے طلسمی عکس نما تباہ کر دیا اور وہ ہیرا حاصل کر لیا جو شوطار کی فضیلت کی سند تھا۔ وہ اُسے لے کے اسمار کی عبادت گاہ میں آگیا جہاں کاہنِ اعظم کی مدد سے اُس نے ایک بند کمرے میں بے شمار دوشیزاؤں کو متبرک دھال سے سرفراز کیا اور اُن کے خون سے جارا کا کا کی مورتی کو نہلاتا رہا۔ یہاں جابر کی باطنی قوتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ وہ اِس اندھیرے کمرے میں روز نئی لڑکی کا خون کرنے اور نئے نئے عمل سیکھنے میں ایسا مستغرق ہوا کہ اُسے اپنے نام کا بھی ہوش نہ رہا۔ جب ایک عرصے بعد اُسے باہر نکالا گیا تو وہ سر بسر ایک وحشی تھا۔ اُسے اپنی خبر نہیں تھی۔ اُس نے باہر آتے ہی شوطار سے مقابلے کا اعلان کر دیا۔ اسمار کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی مرد اسمار کی کسی عورت سے مبارزت کا خواہاں تھا۔ عین موقع پر شوطار اسمار سے فرار ہوگئی اور جابر بن یوسف اسمار کا حکمراں بنا دیا گیا۔ یہ مہم سر ہوئی تو اُس نے بیزنار کا رُخ کیا۔ بیزنار میں اُسے ایک حساب چکانا تھا اور وہاں نہ صرف اُس کی محبوبہ فلورا مقیم تھی بلکہ تاریک برِاعظم کا سب سے بڑا ساحر، ساحرِ اعظم جالوش بھی فروکش تھا۔ اُس نے جالوش کی عظمت کے متعلق اتنا کچھ سُن رکھا تھا کہ وہ اُس سے ملنے اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔ جالوش نے اپنے علاقے میں آنے کے لیے جابر کا ہر مرحلے پر امتحان لیا۔ اُسے ایک سیاہ غار میں کودنا پڑا اور اُس نے اُس سحر زدہ علاقے میں عبادت و ریاضت کے ناقابلِ فراموش جوہر دکھائے۔ جالوش کے بارے میں اُس نے جو کچھ سُنا تھا وہ سب سچ تھا۔ زرد جبیں جالوش کی غلام تھیں۔ ایک ایوان میں بے شمار طلسمی عکس نما نصب تھے جہاں سے ہر جزیرے میں ہونے والی سرگرمی دیکھی جا سکتی تھی۔ جابر نے یہاں ایک مجہول اور کریہہ صورت بڑھیا کے خشک پستانوں سے دودھ پیا۔ آخر ساحرِ اعظم نے اُس کے انہماک اور استغراق سے متاثر ہو کے اُسے طلب کر لیا۔ اُس کا چہرہ اتنا ہیبت ناک اور اُس کی آواز اتنی گھن گرج کی تھی کہ جابر اُس کی بارگاہ میں لرز رہا تھا۔ ساحرِ اعظم نے اُس کی تواضع اپنی انگلیوں کے پوروں سے کی اور اُسے بچھوؤں کا ایک ہار عطا کیا۔ جالوش کے علاقے سے سرفراز ہو کے وہ بیزنار کی بستی میں پہنچا۔ نرنگا یہاں سے بھی فلورا کو لے کے فرار ہوگیا۔ یہاں کے سردار ادمیگا نے ہتھیار ڈال دیے اور جابر بیزنار کا حکمراں بھی قرار دے دیا گیا۔ وہ اپنا ایک نائب مقرر کر کے فلورا کے تعاقب میں جزیرے جزیرے گھومتا رہا اور جہاں جہاں وہ جاتا رہا جزیرے سرنگوں کرتا رہا لیکن فلورا کو کہیں نہ دیکھ سکا۔ جابر پندرہ جزیروں اور سولہ قبیلوں کا سردار ہو چکا تھا اور اُس کی گردن نوادر سے جھکنے لگی تھی۔ ہر جگہ اُس کے نائب مقرر تھے۔ ان پندرہ جزیروں کے سیاہ و سفید کا مالک وہ خود تھا۔ جب فلورا کا نام و نشان نہ ملا تو جابر نے توری کا رُخ کیا۔

توری آکے وہ سب سے پہلے بوڑھے سرنگا سے ملا جو اپنی جڑیں بے حد مضبوط کر چکا تھا اور ابھی تک غار میں مقیم تھا۔ مہذب دنیا میں واپسی کا یقین اب بھی رکھتا تھا۔ جابر نے اُسے بتایا کہ نجات کا خیال چھوڑ دو، نجات ممکن نہیں ہے۔ اسی دنیا میں خود کو شامل سمجھو لیکن سرنگا اپنی ضد پر اڑا رہا اور جابر کو نصیحتیں کرتا رہا کہ اب وہ نجات کا پہلو سامنے رکھے۔ جابر اب ایک ناقابلِ تسخیر شخص بن چکا تھا۔ توری میں اُس کے لیے کیا نہیں تھا۔ بے شمار دوشیزائیں، غلام، مہذب دنیا کی تین لڑکیاں اور سب سے بڑھ کر سرتیا۔ لیکن آقا بلا؟ وہ سمجھتا تھا کہ پندرہ جزیروں کی حکمرانی اور جالوش کی خوشنودی کے بعد اب وہ یقیناً آقا بلا کے التفات کا مستحق ہو گیا ہے لیکن ابھی تک آقا بلا کی عنبریں زُلف اُس کے دراز ہاتھوں سے کہیں بلند تھی۔ وہ دن رات اُس کے پیام کا منتظر رہنے لگا۔ اس انتظار میں اُس پر وحشت سوار ہونے لگی۔ اُس نے خوں ریزیاں شروع کر دیں اور توری کی جھونپڑیوں کو محلات میں تبدیل کر دیا۔ اب سمورال بھی اس کی عظمت و بزرگی کا قائل تھا۔ بس بے نیاز نے اُسے پھر بھی طلب نہیں کیا۔ آخر ایک روز جابر نے خود اُس کے پاس پہنچنے کا عزم کیا۔ وہ گفتنی ناگفتنی مرحلوں سے گزرتا اور اپنے طلسمی تحائف سے مدد لیتا ہوا اُس کے ناقابلِ رسائی قصر تک پہنچ گیا۔ آقا بلا کی کنیزوں نے اُس کا استقبال کیا۔ جلد ہی اس دیوانے شخص کو سجا بنا کے آقا بلا کی بارگاہ میں پیش کر دیا گیا۔ آقا بلا نے کمالِ مہربانی سے اُس کی بے اذن آمد معاف کر دی گویا گزشتہ تمام قربانیوں کا صلہ یہ معافی تھی؟ جابر نے اپنا جلتا ہوا سینہ اُس کے سامنے کھول کے رکھ دیا۔ اُس کی جادو بیانی سے آقا بلا متاثر ہوئی اور اُس نے اپنے پیر آگے بڑھا دیے۔ جابر عالمِ وحشت میں اُس کی ساقِ سیمیں سے جا چمٹا اور اُس نے دیوانگی میں اُس کے بدن سے پھول نوچنے شروع کر دیے۔ آقا بلا التفات پر آمادہ نظر آتی تھی۔ اس کی پتھر نگاہوں میں گداز نظر آنے لگا اور وہ کرب سے جابر بن یوسف کا نام پکارنے لگی۔ جابر سب کچھ آج ہی حاصل کر لینا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ جابر آج اپنی تمام آرزوئیں پوری کرتا، تمام تشنگیاں دُور کرتا، دل کے تمام حوصلے نکالتا اور اپنی زندگی کا گوہرِ مقصود حاصل کرتا، اچانک ساحرِ اعظم جالوش کی چیخوں نے در و دیوارِ بلا کے رکھ دیے، سارا قصر لرزنے لگا اور برسوں میں سجائی ہوئی یہ محفل لمحوں میں اُجڑ گئی۔

جیسے ہی جالوش کی چیخیں بلند ہوئیں، یہ سارا منظر درہم برہم ہوگیا۔ آقا بلا ایک ناقابلِ بیان انتشار میں نظر آئی۔ جابر بن یوسف کے لیے یہ سانحہ کچھ کم اذیت نہیں رکھتا تھا۔ اُس کے برسوں کے خواب پھر منتشر ہو گئے۔ آقا بلا چشم زدن میں نظروں سے اوجھل ہوگئی اور اُس کی حسین کنیزوں نے اُسے نرغے میں لے لیا۔ جابر مچل گیا کہ وہ کسی صورت میں باہر نہیں جائے گا۔ ان نازنینوں کے سامنے اُس نے بچوں کی طرح ضد کی اور جب وہ ان پر اپنے مہلک نوادر استعمال کرنے پر اُتر آیا تو مجبوراً انھیں اُس پر غنودگی طاری کرنی پڑی۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو وہ جنگل کے ایک گوشے میں پڑا تھا۔ حشرات الارض اُس سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ جابر آقا بلا کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا تھا۔ وہ ایک لاش کے مانند زمین پر پڑا تھا اور چیونٹے اُس کے چہرے پر دندنا رہے تھے۔ اس مایوسی کے عالم میں سرنگا کی دیوی نے نمودار ہو کے جابر کے تنِ مُردہ میں جیسے کوئی رُوح پھونک دی۔ ورنہ اُس نے بستی میں جانے کا ارادہ موقوف کر دیا تھا۔ وہ سرنگا کی دیوی کی ایما پر بستی میں چلا آیا جہاں بدستور جشن برپا تھا۔ سرتیا نے اُس کی دل دہی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ مہذب دنیا کی دوسری لڑکیاں بھی ناراض جابر کو آسودہ کرنے میں پیش پیش تھیں مگر بستی میں آنے کے بعد پھر اُس پر مایوسی کا غلبہ ہوا۔ وہ بے حد دل شکستہ، دل گرفتہ تھا۔ سرتیا نے اپنے باپ کی طرح اُس کے اندر مہذب دنیا میں واپس ہونے کی آرزو پیدا کرنی چاہی اور اُسے اپنی رفاقت کا ایسا اعتماد بخشا کہ جابر نے سرتیا کو جیسے نئے سرے سے دریافت کیا۔ اُس لڑکی نے اپنی موجودہ زندگی پر آنسو بہائے اور جابر سے گہرے التفات کا بالواسطہ اظہار کیا۔ ایک دن جابر کو شراڈ یاد آگیا۔ مہذب دنیا کا وہ نوجوان جسے جابر اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا۔ توری لوٹ کے جابر نے اب تک شراڈ کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اُسے تلاش کرتا ہوا توری کے ایک غار میں چلا گیا جہاں شراڈ نے کوئی مقام حاصل کرنے کے لیے ریاضت شروع کر دی تھی۔ جابر بن یوسف نے اُس سے اپنے تمام گزشتہ رویوں کی معافی مانگی اور اُسے عزت کے ساتھ توری کی بستی میں لے آیا۔ آقا بلا کی طرف سے مایوسی ہو گئی تھی تو پھر رقابت کیسی؟ حسد کیسا؟ مہذب دنیا کے یہ بچے کھچے فرد ہی جابر کو عزیز معلوم ہونے لگے تھے۔ جابر کا کام سوچنا اور سوچ سوچ کر جلنا، کڑھنا اور آقا بلا کی یاد میں آنسو بہانا رہ گیا تھا۔ پھر اُس کا بیشتر وقت تنہائیوں اور ویرانوں میں گزرنے لگا کہ ایک روز آقا بلا کی طرف سے دو کنیزوں کا تحفہ اُس کی آسودگی کے لیے ارسال کیا گیا۔ یہ تحفہ جابر کے زخموں پہ نمک چھڑکنے کے مصداق تھا۔ اُس نے انھیں کسی جذبے کے بغیر قبول کیا۔

یہ سرد دن کب تک گزرتے؟ اگر توری میں زلزلہ نہ آجاتا۔ اُس روز ہر طرف آگ لگ رہی تھی۔ توری کے عابد و زاہد غاروں سے نکل کے سمندر کی طرف بھاگ رہے تھے۔ انگرو ما کے باغیوں نے توری پر حملہ کر دیا تھا۔ جابر بھی چار و ناچار سینہ سپر ہو کے آ ڈٹا۔ سرنگا بھی اپنے غار سے نکل آیا اور توری کا ہر فرد ساحل پر انگرو ما کے باغیوں سے نبرد آزما ہوگیا۔ سرنگا کی دیوی نے بھی اپنا کھیل شروع کر دیا۔ سلطنتِ آقا بلا کا سب سے بڑا پشت پناہ ساحرِ اعظم جالوش بھی وہاں موجود تھا۔ اُس نے مدافعت کے محیر العقول کرشمے دکھائے۔ آگ اور خون کی ہول ناک جنگ جاری تھی، آسمان پر بے شمار چنگاریاں رقص کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگرو ما کے باغی آج پوری تیاری کر کے آئے ہیں مگر جالوش، جابر، توری کے ہزلوبا عابد، سرنگا اور اُس کی دیوی کے مشترکہ دفاع نے انھیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ فرار ہوتے ہوئے توری کے تین سو زاہدوں اور پندرہ جزیروں کے سردار جابر بن یوسف کو بھی ساتھ لے گئے۔ جابر جوش و خروش میں آگے بڑھ گیا اور اُس کے بوڑھے ہندی دوست سرنگا نے مشورہ دیا کہ وہ کسی طرح خود کو اُن کی تحویل میں دے دے۔ انگرو ما میں ایک قیدی کے بجائے مہمان کے طور پر اُس کا خیر مقدم کیا گیا اور اُسے اسمار کی ملکہ شوطار تک طلب کرنے کی اجازت دے دی گئی مگر اُس نے سب سے پہلے فلورا کو طلب کیا۔



"فلورا ۔۔۔۔۔" اس نے تذبذب سے کہا۔

"ہاں فلورا ۔۔۔۔۔! کیا تم نے یہ نام پہلے نہیں سنا؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"مگر..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور اس کی اندر کی طرف دھنسی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ ساتھ ہی اس کے گھٹے ہوئے سر پہ بیٹھا ہوا نیولا شعلہ بار نظروں سے مجھے گھورنے اور اچھلنے لگا۔ شاید وہ کچھ اور توقع کر رہا ہوگا۔ اس کا خیال ہوگا کہ میں سب سے پہلے اسمار کی حسین و جمیل ملکہ شوطار کو طلب کروں گا مگر میں نے زرنگا جیسے معمولی شخص کے ساتھ آئی ہوئی مہذب دنیا کی ایک لڑکی فلورا کو طلب کیا تھا۔ اب وہ اپنی فراخ دلانہ پیشکش کا اظہار کر کے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کی تشویش سے مجھے مسرت ہوئی اور میں نے اپنے مطالبے پر جمے رہنے کا قصد کر لیا۔ اس گریز سے میرا تجسس دو چند ہو گیا تھا۔

"مگر فلورا ہی کیوں؟" وہ چند ثانیوں کے توقف کے بعد ہچکچا کے بولا۔

"مگر فلورا ہی کیوں نہیں؟" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "انگرو ما کے محترم سردار! کیا تم نے ابھی ابھی یہ نہیں کہا تھا کہ میں انگرو ما میں بسنے والی کوئی بھی عورت طلب کر سکتا ہوں؟"

"مجھے یاد ہے۔" گرو ڈنا عجز بہ ہو کے بولا۔

"پھر تم کس غور و فکر میں مبتلا ہو گئے گرو ڈنا؟ تمھاری خاموشی سے کیا مطلب اخذ کیا جائے؟ کیا تم نے بھی اسے یہاں سے فرار کرا دیا ہے؟"

"نہیں نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔" گرو ڈنا کے لہجے میں تاسف تھا۔ "میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا، اس پر قائم ہوں۔ انگرو ما میں تم جیسے عالم کی آمد ہمارے لیے باعث فخر ہے۔ تمھارے جانے کا ہمیں اتنا غم نہیں ہوا تھا، جتنا دوبارہ آنے کی خوشی ہوئی ہے، تمھارا احترام ہم پہ واجب ہے۔"

"پھر یہ اکراہ کیوں؟ کیا تمھیں معلوم ہے کہ فلورا کون ہے؟ فلورا، مہذب دنیا کی وہ لڑکی ہے جو میری ملکیت ہے۔ اسے توری کے ایک سردار شوالا نے غصب کر لیا تھا۔ بعد میں اس نے اسے زرنگا کے سپرد کر دیا۔ زرنگا جزیرۂ بیزنار سے میرے مقابلے کے لیے توری آیا تھا مگر فلورا کو لے کر فرار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے بیزنار میں اس کا تعاقب کیا اور ساحر اعظم جالموش سے ملاقات کی۔ پھر میں جزیرے پر جزیرہ سر کرتا رہا۔ جب وہ یہاں آ کے روپوش ہو گئے تو میں نے مزید جزیرے سر کرنے کے بجائے توری واپس جانے کا قصد کیا اور اب انگرو ما میں آ گیا ہوں۔"

وہ میری باتیں غور سے سنتا رہا۔ اس کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے چند ثانیوں تک آسمان کی طرف دیکھا اور پھر نہایت غم زدہ لہجے میں کہنے لگا۔ "تم کچھ دیر انتظار نہیں کر سکتے؟ میں یہ وضاحت دوبارہ کر دوں کہ انگرو ما میں تمھاری حیثیت قیدی کی نہیں، مہمان کی ہے۔ تم یہاں آزاد ہو۔ مجھے معلوم ہے تمھارے سینے میں ابھی تک انگرو ما کے لیے ہمدردی پیدا نہیں ہوئی ہے مگر امید ہے، پہلے کی طرح تم اس بار بھی ہمارے ہم نوا ہو جاؤ گے کیونکہ سچ ہمارے ساتھ ہے اور سچ یہ ہے کہ اقابلا کے خلاف جدوجہد محض اسی کے بغض و عناد کے سبب سے ہے، سچ یہ ہے کہ جالموش کا سحر زاہدوں اور عابدوں کے اعلا مقام کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ سچ یہ ہے کہ بے قرار روحیں صدیوں سے اپنے دائمی آشیانوں میں جانے کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ ہم ایک دن یہ سارا طلسم توڑ دیں گے اور جارا کاکا کی عظیم روح ہمیں سکون اور مسرت سے سرفراز کرے گی۔"

گرو ڈنا فلورا کی گفتگو سے پہلو تہی کر رہا تھا۔ میں یہ باتیں پہلے بھی انگرو ما کے باغی عالموں کی زبانی سن چکا تھا مگر اس بار گرو ڈنا کے لہجے میں مجھے کچھ زیادہ یقین کی آمیزش نظر آئی۔ "جارا کاکا کی عظیم روح۔" میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم پر ترس آتا ہے گرو ڈنا! تم سب لوگوں پر جو احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ جارا کاکا کی عظیم روح کس کے حق میں ہے؟ کیا اس میں اب بھی کوئی شبہ ہے؟ جالموش جیسا بڑا ساحر وہاں موجود ہے۔ مقدس اقابلا جیسی حسین اور پراسرار عورت وہاں موجود ہے، وہ ایک وسیع سلطنت ہے۔ وہاں بے شمار غاروں میں عابد اور زاہد جارا کاکا کی خوشنودی کے لیے برسوں سے عبادت کر رہے ہیں۔ تم کئی بار ناکام ہو چکے ہو۔ تم ایک سراب میں مبتلا ہو۔ میرے عزیز گرو ڈنا! میں تمھارے عالموں کو مشورہ دوں گا کہ وہ اقابلا کے حکم کے آگے اپنے سر جھکا دیں۔ یقین کرو، یہ ایک بہترین مشورہ ہے ۔۔۔۔۔ مگر ۔۔۔ مگر ۔۔۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔ "میری بات تمھاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ مجھے مختلف طریقوں سے تمھیں سمجھانا پڑے گا۔ شاید یہاں میرے آنے کا مقصد یہی ہے۔ میں تمھارے اور مقدس اقابلا

کے درمیان ایک اچھا رابطہ بن سکتا ہوں۔ بہرحال یہ گفتگو بعد میں ہوتی رہے گی۔ فلورا کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟"

گرڈٹا کسمسانے لگا۔ "معزز جابر! تم ابھی تازہ تازہ وہاں سے وارد ہوتے ہو۔ اس لیے تمھارے ذہن پر آقا بلا اور جالوش کا سحر طاری ہے۔ ہم تم سے کچھ سمجھنے اور تمھیں سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ رہا جارا کاکا کی عظیم روح کی خوشنودی کا مسئلہ، تو انگروما کی موجودگی ہی اس بات کی دلیل ہے کہ جارا کاکا کی روح اپنے ان عبادت گزاروں کے موقف کی تائید پر مائل ہے۔ وہ دن ضرور آئے گا جب ہمیں کلّی طور پر اس کی ہمدردیاں حاصل ہو جائیں گی ـــــ ہم جالوش کو شکست دے دیں گے۔ ہم آقا بلا سے اس کی مسند چھین لیں گے اور....."

میں نے کسی قدر ناراضی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں مہذب دنیا کی لڑکی فلورا کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

"ہاں وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "معزز جابر! میں تمھیں صاف صاف بتائے دیتا ہوں، شاید تمھاری آمد کی خوشی میں مجھے اپنی زبان پر قابو نہیں رہا ـ جس وقت زرلگا نے انگروما میں پناہ لینے کے لیے ہم سے رابطہ قائم کیا تھا، اس نے فلورا کے سلسلے میں ہم سے یہ عہد لے لیا تھا کہ ہم فلورا کو اسی کے تصرف میں رہنے دیں گے۔ فلورا صرف اُسی کی رہے گی۔ مجھے افسوس ہے، جابر بن یوسف! ہم یہ عہد توڑ نہیں سکتے۔ تم اس کے بجائے انگروما کی کوئی بھی عورت طلب کر سکتے ہو اگر چاہو تو کچھ اور خواہش کر سکتے ہو۔"

"مگر مجھے صرف فلورا درکار ہے۔" میں نے غصے میں کہا۔ "کیا زرلگا اتنا اہم شخص ہے کہ تم نے اسے اپنے ہاں بلانے کے لیے ایک عہد بھی کر لیا؟ اگر وہ انگروما میں نہ آتا تو کیا انگروما کی طاقت میں کوئی کمی واقع ہو جاتی؟"

"ہمارے لیے سلطنتِ آقا بلا کا ایک ایک شخص اہم ہے اور پھر زرلگا جیسا طاقت ور شخص؟ اس کے بھائی ارمیگا نے اسے پُراسرار علوم کی تربیت بھی دی تھی۔ وہ کوئی جاہل اور کمزور شخص نہیں ہے۔ وہ کسی وقت بھی ہمارے کام آسکتا ہے اور انگروما میں بڑا مقام حاصل کر سکتا ہے۔"

"ہونہہ۔" میں نے نفرت سے کہا۔ "تم ایک معمولی شخص کے عہد کے لیے جابر بن یوسف کو ناراض کر رہے ہو اور جابر بن یوسف کی ناراضی کا مطلب یہ ہے کہ تم انگروما میں ایک نہ ختم ہونے والے انتشار کو ہوا دے رہے ہو۔ کیا میں اپنی ریاضتوں کی فہرست گنواؤں اور تمھیں اپنے بارے میں حقائق سے آگاہ کروں؟ مقدس جارا کاکا کی روح مجھ پر مہربان ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے معزز جابر! ہم تمھارے مقام سے آگاہ ہیں، تمھارا چمکتا ہوا سینہ تمھاری عظمتوں کا ثبوت ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ تم انگروما کی طلسمی دیوار پھلانگ کے توری پہنچ گئے تھے۔ تمھارے پاس یقیناً ایک عظیم طاقت ہے جو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ اس کے علاوہ مقدس جارا کاکا کی روح بھی تم پر مہربان ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ اسی نے تمھیں ہمارے پاس روانہ کیا ہے تاکہ تم ہم میں مل جاؤ اور ہمارے ہاتھ مضبوط کرو۔"

"پھر ـــ پھر۔" میں نے تمسخر سے کہا۔ "مقدس جارا کاکا کی روح کے فرستادے کی یہ خوب تواضع ہو رہی ہے کہ اس کے مقابلے میں تمھیں ایک حقیر شخص سے کیے ہوئے وعدے کا پاس ہے؟"

"میں مجبور ہوں لیکن ہم جلد ہی اس کا کوئی حل نکال لیں گے۔ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ جلد ہی فلورا تمھاری خدمت میں پیش کر دی جائے گی۔"

"معزز گرڈٹا! میں اس گریز کو اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ میں اُس وقت تک انگروما میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتا جب تک فلورا کو حاصل نہیں کر لیتا۔ اگرچہ انگروما میں آنے کا میرا مقصد یہی نہیں ہے، میرے مقاصد تو بہت سے ہیں۔ ابھی سفر کی تکان غالب ہے اور میں پہلے ابتدائی مراحل سے نمٹنا چاہتا ہوں۔ ازراہ کرم فلورا کو پیش کیا جائے۔"

"میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو، اگر ہم تم سے کوئی عہد کریں گے تو اُسے ہر حال میں نبھائیں گے۔ اگر ہم نے عہد شکنی شروع کر دی تو انگروما کے عالموں پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے گا اور یہ زمین جو امن و سکون کا گہوارہ ہے، یہاں انتشار پھیل جائے گا۔"

"لیکن میں نے خود سے عہد کیا ہے کہ میں زرلگا کو زمین کا پیوند بنا دوں گا، یہ جابر بن یوسف کا عہد ہے۔ کیا تم یہ دیکھنا پسند کرو گے کہ کون اپنے عہد پر قائم رہنے کی طاقت رکھتا ہے؟" میں نے درشتی سے کہا۔

گرڈٹا کی آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔ وہ بار بار کہیں گم ہو جاتا تھا۔ جیسے جیسے اس کا انداز معذرت خواہانہ ہوتا گیا، میرے لہجے میں اشتعال بڑھتا گیا اور میرے اندر بیٹھے ہوئے ایک صلح جُو شخص نے سمجھایا۔ جابر بن یوسف! اتنے جلال میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اس زمین پر تنہا ہو اور نئے نئے آئے ہو۔ گرڈٹا کے لہجے کی نرمی سے زیادہ رعایت حاصل کرنے کی کوشش مت کرو۔ فلورا کسی وقت بھی مل سکتی ہے کیونکہ تم اس سے دور نہیں ہو۔ تمھیں یہاں بہت سے کام کرنے ہیں۔ سرلگا نے توری اور انگروما کے باغیوں کی جنگ کے درمیان تمھیں گرفتار ہو جانے کا جو مشورہ دیا تھا تمھیں اُس پر غور کرنا ہے۔ تمھیں یہاں سکون سے بیٹھ کے اپنی ذہانت اور شجاعت کی بساط بچھانی ہے۔ اگر تم نے شروع ہی میں فشار برپا کر دیا تو یہ لوگ تم سے محتاط ہو جائیں گے اور ان کی میزبانی کا یہ انداز بدل جائے گا۔ میں نے اپنے اندر بیٹھے ہوئے اُس صلح جُو شخص کی باتیں بزدلی سے تعبیر کیں۔ مجھے اپنی یہ ترغیبیں خود زہر لگیں۔ ہونہہ میں نے خود سے کہا۔ اگر پہلے ہی موقع پر اپنی عظمت کا سکّہ نہ جمایا گیا تو آئندہ وہ مجھ سے اور نرمیوں کی توقع کریں گے۔ یہاں پھر ایک طویل وقت گزر جائے گا اور کچھ نہیں ہوگا۔ جو فیصلے کرنے ہیں یا کروانے ہیں ان میں تاخیر عبث ہے۔ گرڈٹا سے کہہ دو کہ اُسے میری میزبانی عزیز ہے یا زرلگا سے کیا ہوا عہد؟

میں نے گرڈٹا سے کہہ دیا۔ "اگر تم اسی وقت فلورا کو پیش نہیں کرو گے



علامہ اقبال رح

سیالکوٹ میں کسی دُکان کے تختے پر ایک پیر رکھے حُقے کے کش لگا رہے تھے کہ اتفاقاً ان کی نظر اپنے اُستاد سیّد میر حسن پر پڑی، وہ تیزی سے اُن کی جانب لپکے تو جلدی میں ایک جوتا وہیں چھُوٹ گیا۔ علاّمہ جوتے کی پروا کیے بغیر گردن جھکاتے اُستاد کے ساتھ چلنے لگے اور اسی حالت میں انھیں اُن کے گھر تک پہنچایا۔



تو میں بیزنار کے قوانین کا احترام کرنے کا پابند نہیں رہوں گا۔ سنتے ہو۔" میں نے تیز آواز میں کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ جاراکاکا کی متعدس روح اپنے ایک غلام کی خواہش کا زیادہ خیال رکھے گی۔ تم نے درمیان میں آنے کی کوشش کی تو پھر ناکامی کا منھ دیکھو گے کیونکہ تمھارے مقابل جو شخص کھڑا ہے وہ کسی اعتماد ہی سے اس مضبوط لہجے میں بات کر رہا ہے۔"

گروڈما کے پاس شاید میری بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے میری تُندی اور تلخی برداشت کرتا رہا اور نہایت نرمی سے کہنے لگا۔ "معزز جابر بن یوسف! مجھے اپنے ساتھیوں سے مشورے کے لیے وقت درکار ہے۔ میں انھی کے پاس جا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے تو کوئی صائب فیصلہ کرنے میں میری مدد کریں گے۔"

"اور میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔" میں نے عزم سے کہا۔

"آؤ۔" وہ کچھ جھجک کے بولا

ہم دونوں جلد ہی بستی کے درمیانی حصے میں پہنچ گئے جہاں ایک چھوٹی سی عبادت گاہ کے گرد انگروما کے منتظمِ عالم موجود تھے۔ میں دور کھڑا رہ گیا۔ گروڈما اپنے ساتھیوں کے پاس مشورے کے لیے چلا گیا اور میں نے دور کھڑے کھڑے دیکھا کہ ان کا سکون گروڈما کی اچانک آمد سے درہم برہم ہو گیا ہے۔ وہ گفتگو کرتے ہوئے بار بار میری جانب دیکھتے تھے۔ ان کے تلاطم سے میری سرکشی کو ہوا لگی اور جب انھیں کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے دیر ہو گئی تو انتظار کرنے کے بجائے میں خود ان کی جانب بڑھنے لگا۔ کسی نے اشارہ کیا کہ میں ان کی طرف آ رہا ہوں۔ وہ سنبھل کر میرے پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔ جب میں ان کے درمیان پہنچا تو انھوں نے ایک دوسرے کو سوال طلب نظروں سے گھورنا شروع کر دیا

"معزز جابر!" ایک عمر رسیدہ شخص آگے آیا اور شائستگی سے لرزیدہ آواز میں بولا۔ "فلورا کو ہم نے مقدس ریماجن سے مشورہ کر کے تحفظ دیا ہے۔ گروڈما اور انگروما کے دوسرے منتظموں کا وعدہ اصل میں مقدس ریماجن کا وعدہ ہے۔ جب تک اُس کی طرف سے یہ تحفظ نہ اُٹھ جائے، ہم تم سے توقف کی درخواست کریں گے۔"

ریماجن کا نام میرے لیے نیا تھا لیکن اس موقع پر میں ان سے اس شخص کے بارے میں پوچھ گچھ کر کے اپنی کم علمی کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یقیناً ریماجن کوئی اہم شخص ہو گا جس کا تذکرہ وہ اتنے ادب سے کر رہے تھے۔ اس کے نام کے ساتھ انھوں نے مقدس کا لفظ بھی استعمال کیا تھا۔ میں نے اپنے آیندہ روّیے کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور پھر میرے ذہن میں بجلی کی طرح ایک خیال کوندا۔ میں نے ادب سے کہا۔ "اے بزرگو! مقدس ریماجن کی خدمت میں میری یہ حقیر خواہش پہنچا دو۔ وہ جاراکاکا کے ایک پسندیدہ غلام کے لیے اپنا فیصلہ بدل دے گا۔ اُسے معلوم ہو گا کہ کس کی امانت کس کے پاس رہنی چاہیے۔ کون اُس لڑکی کا صحیح دعوے دار ہے۔ میں سرِ شام منعقد ہونے والی جاراکاکا کی مشترکہ عبادت میں تمھارے جواب کا انتظار کروں گا۔ شام کو میں تمھارے سامنے ایک بیان بھی دینا چاہتا ہوں کہ تم مقدس آقابلا کے ساتھ سرکشی سے تائب ہو جاؤ۔ امید ہے تم مجھے اس کا موقع ضرور دو گے۔"

"ضرور، ضرور۔" ان کے چہروں پر شادمانی چھا گئی۔ اس مسکراہٹ میں کینہ شامل نہیں تھا۔ "ہم تمھارے شکر گزار ہیں کہ تم نے ہمیں اس کا موقع دیا۔ لو ہماری طرف سے انگروما کی اقبال مندی کا یہ جام نوش کرو۔" بوڑھے نے اپنا قدح میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے ایک ہی سانس میں پی لیا اور بازو سے باچھیں پونچھتے ہوئے بولا۔ "اب میں چلتا ہوں۔ مجھے انگروما کا یہ سبزہ زار دیکھنا ہے اور دیکھنا ہے کہ تم نے کتنے طلسم کدے اس عرصے میں تعمیر کیے اور علم و فضل کے معاملے میں کیا کیا مراتب حاصل کیے۔"

"یہ زمین تمھاری ہے۔" گروڈما نے خوش دلی سے کہا۔

ان کا انکسار اور عجز ان کی سب سے بڑی خوبی تھی جو تاریک برِّاعظم میں آقابلا کی قلمرو میں عنقا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آقابلا کی سلطنت کے ستم رسیدہ لوگ تھک کے انگروما کا رُخ کرتے تھے، یہاں غذاؤں کی بہتات تھی اور غلاموں کے ساتھ حاکموں کا رویّہ بہت مشفقانہ تھا۔ وہ اپنی میزبانی اور حسنِ سلوک سے ہر شخص کو پسپا کر دیتے تھے۔ میں ان کی خوش خلقی سے اپنے تمام سخت عزائم کے باوجود اچھا تاثر لے کے وہاں سے چلا آیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں نے اپنے ارادے بدل دیے ہیں۔ میں نے ریماجن کا ذکر آنے کے بعد مزید اصرار مناسب نہیں سمجھا تھا۔ فلورا کو دیکھنے کی آرزو شدت سے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ میرا وہی حال تھا جو بیزنار کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے تھا۔ وہی بے چینی، وہی ایک کسک۔ جب اس کا خیال آتا تھا تو سارا تاریک برِّاعظم منہدم کرنے کو جی چاہتا تھا۔ زخم دُکھنے لگتے تھے اور بہت سی کربناک یادیں سینے میں آگ لگا دیتی تھیں۔ یہ سب اسی کی وجہ سے تھا۔ وہ نہ بیروت میں دوبارہ ملتی اور نہ اس ہولناک سرگزشت کا آغاز ہوتا۔ بیروت میں کسی حسین لڑکی سے میری شادی ہو گئی ہوتی اور وہاں کی صاف و شفّاف سڑکوں پر میں دھوم مچاتا پھرتا۔ وہاں کے شبینہ کلبوں میں نازنینیں مجھے دیکھ کر میری

"میں نے سُنا ہے کہ
ایک نیا سینٹری ٹاول آیا ہے
جو آرام دہ ہے اور محفوظ بھی،
اور قیمت بھی نہایت
مناسب ہے"

"جی۔ آپ نے صحیح سُنا!
وہ ہے "کیئر فری"





Johnson & Johnson

تین نرم انتہائی جاذب تہیں۔ ایک نمی کو دور رکھنے والی محفوظ تہہ۔
خصوصی تعارفی قیمت ۳ روپیہ ۹۵ پیسے۔ عام قیمت ساڑھے چار روپیہ۔

FOURAYS-74JJ-1

طرف لپکتیں۔

فلورا سے اب میرا کیا رابطہ تھا؟ میں سمجھتا ہوں وہ ایک قرض تھا جو مجھے ادا کرنا تھا، وہ ایک ضد تھی جو پوری کرنی تھی، وہ ایک غرور تھا جس کا اظہار ضروری تھا، وہ ایک طاقت تھی جو اس کے حصول کے بغیر بے سند تھی — مگر وہ میری منزل نہیں تھی۔ وہاں پہنچ کے مجھے ٹھیرنا نہیں تھا۔ درمیان میں دوڑتے دوڑتے کبھی اس کا خیال آجاتا تھا۔ ورنہ منزل تو بہت دور تھی اور اس منزل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں یہ جدوجہد تمام تر شعبدہ گری سمجھتا تھا۔ مجھے جہاں تک جانا تھا، وہیں تک جانا تھا۔ وہی ایک چہرہ — ایک مینار، ایک سنگِ میل، مجھے وہیں تمام ہونا تھا۔ کسی مرتبے پر پہنچنا اور کسی شخص کے دل میں نفوذ کرنا دو مختلف عمل ہیں۔ مہذب دنیا میں اگر دنیا کی سب سے حسین دوشیزہ کے روبرو میں اتنے جان لیوا اظہار کرتا اور اتنے اذیت ناک مرحلوں سے گزرتا تو اس کا دل راکھ ہو گیا ہوتا مگر جو شخص مجھے مطلوب تھا، اُس کا نام آقابلا تھا اور بے شمار نادیدہ، دیدہ طلسم میرے اور اس کے درمیان حائل تھے۔ کتنی ہی بار میں نے خود کو ایک مرا ہوا شخص سمجھا اور پھر کسی امید، کسی کرن نے مجھے متحرک کر دیا۔ کتنی ہی بار میری سانس اکھڑی اور میں زمین پہ کھڑا کھڑا اُس کی پہنائیوں میں دھنستا چلا گیا۔ پھر کسی تنکے نے سہارا دے کے مجھے روک دیا۔ تورہی میں آقابلا کے دربار سے واپس آ کے میں نے اپنے بے دست و پا وجود پر قناعت کر لی تھی لیکن پھر انگروما کے باغی آ گئے اور انھوں نے تاریک بر اعظم متزلزل کر دیا۔

میں انگروما کیوں آ گیا؟ انگروما کے راستوں پر وہاں کے باشندوں کے درمیان چلتے ہوئے میں یہی سوچ رہا تھا اور میری نگاہیں ہجوم میں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ سموراں کی مالا کے دانے میری سمت متعین کر رہے تھے اور چوبی اژدہا متحرک ہو کے میرے شانوں پر بیٹھا اپنا منہ ایک سمت کیے ہوئے مجھے اشارے کر رہا تھا۔ خود میں وہ عمل دُہراتا جا رہا تھا جو آج انگروما میں میری جہدِ اول کا آغاز کرنے والے تھے۔ اس کے بعد ہی میں اپنے لیے کوئی راستہ منتخب کر سکتا تھا۔ میں اُس انکسار سے انگروما کے لوگ جس سے مجھے نواز رہے تھے اپنی قدر و قیمت کا صحیح تخمینہ نہیں لگا سکتا تھا۔ اس کے لیے ایک پیش قدمی کی جرأت کرنی تھی۔ شام کی آمد آمد تھی اور میں گوشے گوشے میں یو سونگھتا پھر رہا تھا۔ ہزاروں افراد اب تک میری نظروں سے گزر گئے تھے۔ میدانوں میں جابجا پتھر کے مجسمے ایستادہ تھے۔ ان کی تعداد پہلے سے زیادہ بڑھی ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ فلورا مجھے کہیں نظر نہیں آئی لیکن ایک جگہ میرے قدم رک گئے۔ میں نے ایک مجسمہ غور سے دیکھا۔ وہ ایک تنومند شخص کا مجسمہ تھا۔ میں نے اپنا چوبی اژدہا اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اژدہا مجسمے کے گرد لہرانے لگا۔ میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ اس بات سے مجھے دکھ ہوا۔ کیا یہ لوگ مجھے ایک بے ضرر شخص سمجھتے ہیں؟ یا اپنے علم و تربیت سے اتنے آسودہ ہیں کہ ان کے پاس میری ہر تخریب کا مداوا موجود ہے؟ وہ مجسمہ ایک سیاہ فام شخص کا مجسمہ میرے سامنے تھا۔ میں نے سوچا، اسے زمین میں گاڑ دوں یا ریزہ ریزہ کر دوں؟ اس پر شیالی پھینک دوں یا جالموش کا عطا کیا ہوا ہار پہنا دوں جس کے زہریلے بچھو اس میں اپنے ڈنکوں سے سوراخ کر دیں؟ میں اسے بدترین سزا دینے کے پہلوؤں پر غور کرتا رہا لیکن کسی اقدام سے قبل میرے ہاتھ رک گئے۔ اگر یہ مجسمہ یہاں موجود ہے تو قریب ہی ایک دوسرا مجسمہ بھی موجود ہوگا۔ میں نے نگاہ وسیع کی۔ اس وسعت میں چہار اطراف پھیلے ہوئے مجسموں میں مجھے اپنی مانوس شکل کہیں دکھائی نہیں دی۔ وہ کہیں اور ہے، کہیں دور..... ممکن ہے وہ پتھر کے خول میں مقید نہ ہو؟ سرِشام ہی مشترکہ عبادت کا اہتمام ہوتا تھا اور اس میں میری شرکت لازم ہوتی تھی۔ میں نے مجسمے کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے کاندھے پر اٹھا لیا۔ وہ ایک بھاری شخص تھا مگر میری پشت ایسے کئی مجسموں کا بوجھ بیک وقت برداشت کر سکتی تھی۔ میں نے ایک سحر کے ذریعے اسے عام نگاہوں سے روپوش کر دیا۔ صرف برگزیدہ آنکھیں دیکھ سکتی تھیں کہ وہ میری پشت پر سوار ہے۔ اب میں تیز قدموں سے اُس میدان کی طرف جا رہا تھا جہاں انگروما کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا تھا۔ میدان میں خاصے لوگ جمع ہو چکے تھے اور چہار اطراف سے میدان میں داخل ہو رہے تھے۔ میری نگاہ کے سامنے ذرا اونچائی پر گروٹا، گوسمے اور انگروما کے دوسرے بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ حسبِ دستور ان کے آگے ایک بڑا الاؤ روشن تھا۔ میں جس وقت مجمع میں داخل ہوا، لوگ مجھے دیکھ کے ہیبت سے پیچھے ہٹنے لگے اور گروٹا تک خود بخود ایک راستہ سا بنتا گیا۔ گروٹا اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ میں ان سب کی پروا کیے بغیر چبوترے پر پہنچ گیا اور میں نے مجسمہ وہیں نصب کر دیا۔ اب مجسمہ سارے مجمع کی نگاہوں میں آچکا تھا۔

"جابر بن یوسف!" گروٹا چیخ کر بولا۔ "تم اسے یہاں کیوں اٹھا لائے؟"

"میں اس کے خون سے جارا کاکا کی مقدس روح کو آسودہ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے چلّا کر جواب دیا۔

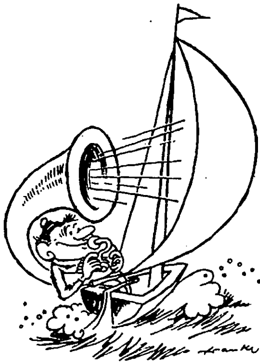
"لیکن یہ انگروما کی مقدس سرزمین کی امان میں آیا ہے۔"

"اور میں مقدس جلاکاکا کے نام پر اسے قربان کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے اس سعادت سے بڑھ کے اور کیا نیکی ہو سکتی ہے؟"

"مگر اس کے لیے ہمیں مقدس ریماجن سے اجازت لینی ہوگی۔" گروٹا کے قریب کھڑے ہوئے ایک بوڑھے شخص نے کہا۔

"اور مقدس ریماجن کو ایک برے شخص کو قربان کر دینے پر کوئی اعتراض ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

اس اثنا میں تمام مجمع زمیں بوس ہو گیا تھا۔ گروٹا کے سوا چبوترے پر کھڑے ہوئے انگروما کے تمام بزرگ گردنیں جھکائے گریہ و زاری میں مصروف ہو گئے تھے۔ میں نے تاخیر اپنے لیے مہلک سمجھی اور اپنے سحر سے مجسمہ فی الفور متحرک کر دیا۔ پتھر کا منجمد خول جب حرکت کرنے لگا تو لوگوں نے حیران نظروں



سے اُسے دیکھا۔ وہ زریگا تھا۔ زریگا میری صورت دیکھتے ہی خوف سے گنگ ہوگیا تھا۔ جاراکاکا کی مشترکہ عبادت کے اجتماع میں غیر متوقع طور پر مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کے ہونٹ لرزنے لگے، اس نے گرڈٹا کی جانب پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ گرڈٹا کی گردن بھی جھک گئی۔ میں نے دہکتے ہوئے الاؤ میں سرعت سے ہاتھ ڈال کے دو انگارے نکالے اور ایک ہولناک چیخ ماری۔ میری دہشت ناک چیخ سے سارا مجمع لرزہ براندام ہوگیا اور لوگ کھڑے ہوکے میری وحشت دیکھنے لگے میرے ایک ہاتھ میں جلتے ہوئے انگارے تھے اور دوسرے ہاتھ میں جاراکاکا کی کھوپڑی۔ دونوں پھیلے ہوئے ہاتھ زریگا کی طرف بڑھے ہوئے تھے "مقدس جاراکاکا تیرے لیے"۔ میں نے دہاڑ کے کہا "اور مقدس ریماجن تیری اجازت سے، جاراکاکا کی خوشنودی ہی تیری اجازت ہے اور اجازت طلبی کی صدا جابر بن یوسف لگا رہا ہے۔"

"جابر بن یوسف!" ایک بوڑھا چیختا ہوا آگے آیا۔ "انگروما کے ساحروں کا صبر و ضبط مت آزما۔"

"مجھے یہاں جس مقصد سے بھیجا گیا ہے وہ تجھے نہیں معلوم بوڑھے! پیچھے ہٹ جا اے بزرگ شخص، اپنی جگہ چلا جا" میں نے سختی سے کہا۔ "جاراکاکا کس کے زیادہ قریب ہے؟ اس کا فیصلہ آج ہو جائے گا۔"

تنومند زریگا لرزنے لگا تھا۔ غیر اختیاری طور پر وہ چبوترے سے بھاگنے لگا لیکن چند ہی قدم چلنے کے بعد ٹھٹک کر ایک جگہ ساکت ہوگیا۔ مجھے پہلے ہی وار میں اس کا کام تمام کر دینا چاہیے تھا لیکن میں نے ایسی عجلت اپنے مستقل مزاج کے موافق نہیں پائی۔ میں اسے پوری اذیت دینا چاہتا تھا۔ انگروما کے بڑے مجمع کے سامنے میرا یہ اقدام باقاعدہ غور و فکر کے بعد تھا۔ گرڈٹا اور دوسرے ساحر دم بخود کھڑے تھے۔ میں نے آخری لمحے تک ان کی طرف سے کسی مداخلت کا امکان یکسر رد نہیں کیا تھا۔ میں پوری طرح اپنے عمل میں منہمک اور اپنے قدموں پر مستعد جما ہوا تھا۔ میں نے وہ دونوں شعلے زریگا کی طرف پھینک دیے۔ نشانہ ٹھیک اس کی آنکھوں پر لگا، وہ ایک فلک شگاف چیخ کے ساتھ تڑپنے اور ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ میں نے اسے بھاگتے ہوئے اپنی جانب کھینچ لیا اور اس کے بال پکڑ کے چہرہ سامنے کیا۔ شعلوں نے اس کی آنکھیں ویران کر دی تھیں۔ خون اور جلتے ہوئے گوشت کے دو بڑے دھبّوں نے اس کا چہرہ مکروہ بنا دیا تھا۔ ان آنکھوں نے فلورا کے جمال کا نظارہ کیا تھا اور اس کے سیاہ بھدّے ہونٹ جو فلورا کے رسیلے ہونٹوں سے مَس ہوئے تھے، میرے چوبی اژدہے نے جگہ جگہ سے ڈس کے نیلے کر دیے تھے۔ لمحوں میں اس کا چہرہ مسخ ہوگیا۔ کاش میں اسے اور اذیتیں دے سکتا۔ کاش یہ مجمع توری کا مجمع ہوتا اور میں نے یہ قربانی جاراکاکا کے نام پر کرنے کا اعلان نہ کیا ہوتا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ میں نے اُس کے منہ پر ٹھوکریں لگانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور الاؤ کے گرد ایک عمل پڑھ کے اپنی تمام تر ظاہری و باطنی طاقت یکجا کر کے جاراکاکا کا نعرہ لگایا۔ "صرف تیرے لیے" میں نے دہاڑتے ہوئے کہا اور میرے خنجر نے زریگا کے سینے سے خون کا فوارہ جاری کر دیا۔ میں نے اس کے تڑپتے ہوئے خون آلود لاشے میں جاراکاکا کی کھوپڑی کو غسل دیا۔ پھر گورمے، گرڈٹا اور اس کے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ "اس کی روح اپنے زنداں خانے میں بھجوا دو۔ ممکن ہے کسی وقت یہ تمہارے کام آجائے۔" گورمے نے آگے بڑھ کے زریگا کا نرخرا دبا لیا اور گرڈٹا سے احترام کے ساتھ اس کا نیولا لے کے زریگا کے گلے پر رکھ دیا۔ پھر اس نے کوئی عمل پڑھا۔ نیولے نے زریگا کی گردن پکڑ لی۔ اسی لمحے زریگا کی لاش ٹھنڈی ہوگئی۔ ہر جگہ خون پھیلا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ خون سے سرخ تھے۔ میں نے جاراکاکا کی رنگین کھوپڑی گلے میں ڈال لی اور زریگا کی لاش دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کے الاؤ میں جھونک دی۔ جب میں اس عمل سے فارغ ہوا تو مجمع میں سرگوشیاں سی گونجنے لگیں۔ "آؤ۔ ہم جاراکاکا کی مشترکہ عبادت کا عمل جاری کریں۔" میں نے بلند آواز میں کہا جیسے ابھی ابھی جو واقعہ ہوا ہے اُسے تازہ رکھنے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ گرڈٹا اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں خون بار ہوگئی تھیں۔ گرڈٹا نے آگے آکے جاراکاکا سے انگروما کی سربلندی کے لیے دعائیں مانگیں لیکن اس کی آواز میں لرزش تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جلد سے جلد یہ رسمی کام ختم کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے بعجلت تمام عبادت کی رسوم سے نمٹ کے مجمع منتشر کرنا چاہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک لیا اور گرڈٹا سے دبنگ لہجے میں پوچھا۔ "میری بات کا کیا جواب ہے؟"

"ہم نے تمہارا پیغام بھجوا دیا ہے۔" اس نے بے رُخی سے کہا۔

"تم نے اس موقع پر کوئی جواب دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہمیں جواب کا انتظار ہے۔"

"کیا میں یہ سمجھوں کہ تم نے میری میزبانی کے نیک فریضے سے ہاتھ اٹھا لیے ہیں، کیا مجھے اب براہِ راست مقدس ریماجن سے بات کرنی ہوگی؟"

"ہم تمہیں اس کا ردِ عمل ظاہر ہونے تک محتاط رہنے کی تلقین کریں

گئے۔ امید ہے تم مقدس ریماجن کو ناراض نہیں کرو گے۔" گرڈنا نے بے دلی سے جواب دیا۔

"میں؟" میں نے اپنا رُخ بدل کے مجمع سے خطاب کیا۔ "اے انگروما کے لوگو! میں جابر بن یوسف مقدس آقابلا کے پندرہ جزیروں کا سردار تم سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں۔ میں مقدس آقابلا اور ساحرِ اعظم جاملوش کی طرف سے تمھارے لیے ایک تنبیہہ ہوں کہ تمھیں طاقت اور کمزوری کا فرق سمجھاؤں۔"

"وہ ظالم ہے۔ وہ جابر ہے۔" مجمع نے نعرے لگائے۔

میں نے چیخ کر انھیں خاموش کرا دیا۔ "لیکن وہ ایک عظیم طاقت ہے اور اسے جارا کاکا کی اعانت حاصل ہے۔"

وہ میری بات سننے کے بجائے جارا کاکا کے نام کا وِرد کرنے لگے۔

میں نے چیخ کر پھر انھیں خاموش کرایا۔ "تم کب تک شکستوں سے دوچار ہوتے رہو گے؟ ایک دن طاقت تمھاری ناتوانی پر غالب آجائے گی۔ میں تمھیں یہ مشورہ دینے آیا ہوں کہ اے نیک لوگو! تم انگروما کی حد تک اپنے آپ کو مقید کر لو اور آقابلا کی معزولی کا خیال دل سے نکال دو۔"

مجھے حیرت تھی کہ گرڈنا اور اس کے ساتھی مجمع سے میرا خطاب خاموش کھڑے سن رہے ہیں۔ میں نے ملکہ آقابلا کی شان و شوکت کے متعلق کچھ کہنا شروع کیا تو ہجوم نے میری یہ بات مسترد کر دی لیکن انھوں نے کسی شدید ردِ عمل کا اظہار بھی نہیں کیا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اُس وقت تک خطاب کرتا رہوں گا جب تک وہ میرا اثر قبول نہیں کریں گے۔ گرڈنا نے پیچھے سے آکے مداخلت کر دی اور میرے نام کے ساتھ تمام احترام ادا کرتے ہوئے مجمع سے کہا کہ میں جزیرہ توری سے آج ہی آیا ہوں اور جو نیا شخص آتا ہے وہ اسی طرح کی باتیں کرتا ہے اور ہم اسی طرح سنتے ہیں۔ اس لیے انھیں میری بات سن لینی چاہیے۔

یہ کہہ کے گرڈنا پھر پیچھے چلا گیا اور اس نے گویا بھرے مجمع میں میرے ساتھ ہمدردانہ رویّے کا اظہار کر کے میری سبکی کی۔ میں نے پھر کوئی جملہ ادا نہیں کیا اور گرڈنا کی طرف اشتعال کی نظروں سے دیکھا۔

پھر چبوترے پر میرا حال پہلے سے مختلف ہو گیا۔ میں عقل و ہوش سے دُور ہو گیا اور میں نے جاملوش کے علاقے میں حاصل کیے ہوئے سحر پڑھنے شروع کر دیے۔ رات ہو چلی تھی۔ الاؤ کے گرد میرے وحشیانہ انداز، میری ساحری، میری چیخوں اور لمحے لمحے بعد سکوت نے اس پُراسرار ماحول کے تاثر میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ "سنو گرڈنا۔" میں نے گرج دار آواز میں کہا اور میری آواز کے ساتھ ہی چبوترے کی زمین دہلنے لگی۔ "سنو گرڈنا! میں نے براہِ راست مقدس ریماجن سے رابطہ قائم کر لیا ہے، دیکھو وہ جابر بن یوسف کا کیسا خیال رکھتا ہے۔"

گرڈنا اور اس کے ساتھی ہلتے ہوئے چبوترے پر اپنے پیر جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے مستانہ نعرے ہر طرف گونج رہے تھے۔ اندھیرے میں اچانک ہجوم کی پشت سے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ میرے بلند ہاتھ تیزی سے گردش کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس ہذیانی چیخ کی آواز اور گہری ہو گئی۔

وہ پاگلوں کی طرح ہجوم چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ گردن جھٹک کے تیزی سے چبوترے کے نزدیک آرہی تھی۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتی جاتی تھی، ہجوم کائی کی طرح پھٹتا جاتا تھا۔ وہ سرتاپا برہنہ تھی۔ اُس کے چہرے اور شانوں پر پھیلے ہوئے بالوں کی وجہ سے اس کی صورت کبھی کبھی دکھائی دیتی تھی۔ پیر پٹکتی، سر جھٹکتی، دیوانہ وار چیختی ہوئی وہ میرے سامنے کھڑا ہوا ہجوم عبور کر گئی۔ میں نے اپنے ہاتھ اُس کے لیے پھیلا دیے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت گرڈنا اور اس کے ساتھیوں کا کیا تاثر تھا۔ چبوترے کی لرزش ختم ہو گئی تھی۔ اچانک اُس وقت میرے دل میں ایک خیال آیا۔ میں نے اپنا خنجر تولا اور ارادہ کیا کہ اسے اس کے سینے کے پار کر دوں لیکن اسی لمحے اس کے خوب صورت چہرے سے بال ہٹ گئے اور ایک مدت بعد، ایک طویل عرصے بعد وہ چہرہ میری نظروں کے دائرے میں آیا تو خنجر میرے ہاتھ سے چپک کر رہ گیا۔ میں نے خنجر پھینک دیا اور دونوں ہاتھ نیچے کر کے اُس مضطرب عورت کو ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ جیسے ہی وہ میرے ہاتھوں میں آئی، اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ نڈھال ہو کے میرے بازوؤں پر جھول گئی۔ میں نے اسے چبوترے پر کھڑا کیا اور اس کے بال درست کیے۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میرے سامنے وہی ہے —— وہی فلورا —— حالاں کہ جس وقت میں نے پہلی بار اُس کی درد انگیز چیخ سنی تھی، اسی وقت مجھے اس کی آمد کا یقین ہو گیا تھا۔ پھر میں نے جارا کاکا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسے ہلاک کرنا چاہا لیکن ایسا نہ کر سکا۔ اُس کی کھلی ہوئی آنکھیں ایک جگہ ٹک گئی تھیں۔ میں نے اپنے سینے کے تمام نوادر پشت کی طرف کر لیے اور اسے اپنے سینے میں اس طرح مدغم کر لیا جیسے وہ میرے وجود ہی کا ایک حصّہ ہو۔

گرڈنا نے میرے نزدیک آنے کی کوشش کی۔ میں نے اُس پر اور اُس کے ساتھیوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ فلورا کو اپنے کاندھوں پر ڈالا —— اور آہستگی کے ساتھ چبوترے سے اتر گیا۔ گرڈنا میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اسی وقت تین نیزہ بردار شخص میرے اردگرد چلنے لگے اور انھوں نے ایک وسیع جھونپڑی تک پہنچانے میں میری رہنمائی کی۔ جھونپڑی میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ مٹکے، پیال کا آرام دہ بستر، قدح اور طشت —— پھل گوشت اور شرابیں —— میں نے فلورا کو پیال کے بستر پر لٹا دیا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

تاریک بر اعظم میں آنے کے اتنے عرصے بعد وہ میرے اس قدر سامنے تھی۔ اس کا رنگ کچھ اور نکھر گیا تھا۔ رخساروں پر سُرخی اور تابانی تھی۔ بے داغ بدن سے خون چھلکا پڑ رہا تھا۔ توری میں پہلے دن میں نے اسے برہنہ دیکھا تھا مگر اُس وقت اُس کے سارے جسم پر چھوٹے چھوٹے زرد کیڑے رینگ رہے تھے اور توری میں پہلے خادمائیں نوشا اور نیری اس کی نگرانی کے لیے مامور ہوئی تھیں، وہ وقت ایسا تھا جب ہمیں آنے والے بھیانک وقت کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اب اُس کا برہنہ سراپا

پھر میری نظروں کے سامنے تھا اور میں اُس کا مالک تھا میری محبوبہ میرے سامنے عریاں پڑی تھی۔ یہ بات مجھے کچھ اچھی نہیں لگی میرے ہاتھ خود بخود کپڑے کھینچنے کے لیے اُٹھے مگر تاریک برِاعظم کے لوگ ایسی کسی چیز سے ناواقف تھے۔ میں نے اُس کے بدن کے بعض حصّے پیال سے چھپا دیے۔ پھر مجھے نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے وہ تنکے جلدی جلدی ہٹا دیے۔ دیر تک ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا۔ اس کے تراشے ہوئے گلابی ہونٹ بند تھے۔ میں نے انھیں پانی سے تر کیا اور انگلی سے سہلانے لگا۔

اُس وقت میرے ذہن کے پردے پر وہ تمام مناظر اُبھر رہے تھے جو فلورا سے وابستہ تھے۔ آکسفورڈ میں اُس سے ملاقات، بیرٹ میں اُس کے ساتھ حسین لمحے، شوالا سے معرکہ آرائی کے وقت میرے ساتھ آنے سے اُس کا انکار اور اس کے تعاقب میں مختلف جزیروں کا سفر۔ میری عقل خبط تھی کہ میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں کہ اُس نے ایک نازک لمحے میں میرے بجائے شوالا کو ترجیح دی تھی اور وہ نرنگا کے ساتھ بھاگتی رہی تھی۔ کبھی اس کے چہرے پر مجھے بے انتہا پیار آتا، کبھی نفرت اُٹھنے لگتی۔ آخر میں نے پانی کے چند چھینٹے اس کے رخساروں پر ڈالے اسے ہوش آنے لگا۔ اس کے بدن میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوا۔ میں نے اشتیاق سے اُسے آواز دی "فلورا!" وہ کسمسانے لگی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور حواس باختہ ہو کے مجھے دیکھنے لگی۔ "فلورا" میں نے آہستگی سے اُسے پکارا۔

اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی اور پھر میرا چہرہ تکنے لگی اور ایک دم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کے اُسے وہیں لیٹنے کا اشارہ کیا۔

"یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"تم؟" وہ وحشت زدہ ہو کے بولی۔ "تم یہاں؟"

"ہاں میں یہاں ہوں تمہارے پاس۔ آخر میں نے تمھیں پا لیا۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

شاید اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے میرا بازو چھو کے دیکھا "یہ انگروما ہے؟"

"ہاں یہ انگروما ہے اور میرا نام جابر ہے۔ میں ایک بار پھر تمھیں اس کا موقع دوں گا کہ میری رفاقت تمھیں عزیز ہے یا ان سیاہ فام لوگوں کی؟"

"تم واقعی جابر ہو۔" وہ دوبارہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔ "مگر میں یہاں کس طرح آ گئی؟"

"تاریک برِاعظم میں سوال کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ تسلیم کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔"

"اوہ جابر!" اس کی آواز لرزنے لگی اور وہ بے تابانہ میری آغوش میں گر گئی اور اس کی آنکھوں سے ایک سیلاب جاری ہوا۔ وہ کچھ اس طرح روئی کہ میرے سینے پر دریا بہنے لگا میری ریگ زار آنکھیں بھی کروٹ لینے لگیں۔ یہ صحرا بھی نم ہو گیا۔ اس کا طوفان ورق کے اندر رہا تھا۔ اسی درمیان اس نے جو لفظ ادا کیے وہ میری سمجھ میں نہیں آ سکے یا میں خود ایسی کیفیت میں مبتلا تھا کہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس کی رقت میں ایسا درد تھا کہ میرے پتھر پگھلنے لگے۔ جب دیر ہو گئی تو میں نے اس کا سر اٹھایا اور اپنی انگلیوں سے اس کے رخسار خشک کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"فلورا!" میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "اپنی آنکھیں بند کر لو۔ ان سے

ایک

کنجوس آقا اپنے مُلازم کی کسی بات سے خوش ہو کے اُسے انعام دینے کا وعدہ کر بیٹھا مگر بعد میں اُسے خیال آیا کہ مجھ سے سخت غلطی ہو گئی ہے۔ چنانچہ جب بھی ملازم سامنے آتا۔ آقا اپنی گردن پھیر لیتا۔

ایک روز گلی سے ایک اُونٹ گزر رہا تھا۔ اس کی گردن ٹیڑھی تھی۔ آقا نے اپنے ملازم سے پوچھا "اس کی گردن ٹیڑھی کیوں ہے؟"

ملازم نے جواب دیا "جناب! اس نے بھی کسی کو انعام دینے کا وعدہ کیا ہو گا۔"

جو لاوا اُبل رہا ہے، وہ میرا سینہ جلا رہا ہے۔"

"جابر!" وہ ایک مرتبہ اور تڑپ کے میرے سینے سے لگ گئی۔

میں نے اسے دوبارہ بستر پر لٹا دیا اور قریب رکھے ہوئے گھڑے سے مشروب انڈیل کے اسے پیش کیا۔ اس نے آدھا پیا، آدھا اس کے سینے پر گر گیا۔ وہ ابھی تک میری موجودگی کا یقین کر رہی تھی اور آنکھیں پٹ پٹا کے مجھے دیکھ رہی تھی۔ "تم کتنے بدل گئے ہو۔" اس کا لہجہ اب قابو میں تھا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "تمھیں پوچھنا چاہیے تھا کہ میں اب تک زندہ کیسے ہوں؟"

"وہ مجھے تمھارے بارے میں بے خبر رکھتے تھے لیکن بعض عورتوں سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ تم ابھی زندہ ہو اور اس منحوس خطّے میں خاصے نامور ہو گئے ہو۔"

"یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا۔ تم نے مقابلے کے بعد شوالا کو مجھ پر ترجیح دی تھی۔"

"آہ" وہ غم زدہ لہجے میں بولی۔ "مجھے اس کی وضاحت کا موقع نہیں ملا۔ میں سمجھتی تھی کہ یہ سب کچھ عارضی ہے مگر شوالا نے مجھے نرنگا کے پاس پہنچا دیا۔"

"تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

"میں نے اس وقت کچھ اور بات سوچی تھی۔ جب تم شوالا سے معرکہ آرا ہوئے تو تاریک برِاعظم میں مہذب دُنیا کے ایک فرد کے لیے بڑی بات تھی۔ اس عرصے میں میں نے شوالا کی طاقت، اس کا طلسم اور اس سرزمین میں بسنے والوں کی ساحرانہ قوتوں کا اندازہ بخوبی لگا لیا تھا۔ میں شوالا کے پاس رک کے اسے تم سے غافل رکھنا چاہتی تھی کیونکہ وہ تم سے شدید نفرت کرتا تھا۔ میں تمھارے دل میں اس کے خلاف ایک عناد پیدا کرنا چاہتی تھی تاکہ تم اس شخص سے ایک آخری مقابلے کے لیے مزید طاقتیں حاصل کرنے پر آمادہ ہو اور میرے انکار کا تازیانہ تمھیں مزید علم حاصل کرنے پر اکسائے اور تم شوالا سے انتقام لینے، مجھے کسی طور حاصل کرنے اور نفرت کا اظہار کرنے کے لیے خود کو طاقت ور بنانے میں اور منہمک ہو جاؤ۔ جیسا کہ تم نے اس وقت تک کیا تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ شاید تم کہیں ٹھہر نہ جاؤ اور تمھاری رگوں میں خون دوڑتا ہے

لہٰذا میں نے خود کو تمہاری نظر میں گرا دیا لیکن میری بدقسمتی کہ جب مجھے تم سے ملنے کا موقع ملا، آخری لمحے میں شوالا نے مجھے زرنگا کے حوالے کر دیا اور میں ہمیشہ کے لیے تمہارے دل و دماغ میں رسوا ہو گئی۔" فلورا جذباتی انداز میں بولی۔

فلورا کی باتوں میں صداقت کا اندازہ اس کے جذباتی لہجے سے ہو رہا تھا۔ میں اس کا ایک ایک لفظ اپنی سماعت میں محفوظ کرتا رہا۔ "کاش تم ایسا نہ سوچتیں۔"

"میں نے اس دن ملکہ آقابلا کی آنکھوں میں تمہارے لیے ایک خاص چمک دیکھی تھی اور جس انداز سے شوالا کا مقابلہ طے ہوا تھا، وہ بھی میری نظر میں تھا۔ میں نے چاہا تھا کہ تمہارا شعلہ میری آمد کے بعد سرد نہ پڑ جائے، یہ شعلہ جلتا رہنا چاہیے کیونکہ ہوائیں تمہارے موافق تھیں۔ اس منحوس خطے سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی ذریعہ میری سمجھ میں آتا تھا کہ ہم ان میں شامل ہو جائیں، ان کا اعتماد حاصل کریں اور ان کی طاقتوں کا راز۔۔۔۔۔"

میں نے فلورا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اٹھ کے دروازے کے پاس آیا۔ پھر میں نے ادھر ادھر کمرے میں کسی نادیدہ شے یا کسی طلسم کی بو سونگھی اور احتیاطاً دروازہ بند کر دیا۔ اپنا چوبی اژدہا متحرک کر کے وہاں تعینات کیا اور تختیاں گلے سے اتار کے آگ روشن کر دی۔ پھر میں نے چاروں طرف ایک سحر پڑھ کے پھونک دیا۔ فلورا میری یہ حرکتیں مبہوت سی دیکھ رہی تھی۔ "ہاں۔ اب تم اطمینان سے بات کر سکتی ہو۔" میں نے اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

فلورا کو سلسلۂ کلام ملانے میں دشواری ہوئی اور وہ گلوگیر آواز میں کہنے لگی "کیا اس وقت میں نے غلط سوچا تھا؟"

"نہیں۔" میں نے جھجک کے کہا "تم نے سب کچھ صحیح سوچا تھا لیکن حالات اس طرح پیش نہیں آئے جس طرح ہم سب نے مستقبل کے متعلق تصور کیے تھے۔"

"تم اب ایک طاقت ور آدمی ہو جب تم مڑتے تھے، میں نے تمہاری پُشت پر ان گنت زاویے دیکھے تھے تم نے انھیں حاصل کرنے کے لیے یقیناً بڑی جان لیوا جدوجہد کی ہوگی۔"

"یہ ایک طویل داستان ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا "یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے کتنا یاد کیا؟"

"آہ۔" وہ پھر رو پڑی "میں نے اپنی موت کا بہت انتظار کیا۔ کبھی کبھی امید کی ایک کرن پیدا ہوتی تھی جب میں تمہارے متعلق کسی سے کچھ سنتی تھی۔ میں اکثر یہ خواب دیکھا کرتی تھی کہ تم مجھے لینے آ گئے ہو۔"

"میں تمھیں جگہ جگہ لینے گیا لیکن تم ہر جگہ سے فرار ہوتی رہیں۔" میں نے شوخی سے کہا "اب میں نے آخر کار تمھیں پکڑ لیا ہے۔"

"جابر! وہ بے تابی سے بولی۔ اب کسی کو مجھے چھیننے کی اجازت نہ دینا۔ اس سے پہلے میرا گلا گھونٹ دینا۔"

"اب میرے بازوؤں میں بڑی طاقت ہے۔"

"تم تو پہچانے نہیں جاتے۔" اس کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ آئی۔ پھر وہ افسردگی سے کہنے لگی "کیا ہم اب کبھی واپس نہیں جائیں گے؟"

"یہ سوال سبھی کرتے ہیں۔ سرتاباجی، سرنگاجی، ڈاکٹر جواد بھی اور کبھی کبھی میں بھی خود سے پوچھتا ہوں لیکن اس سوال کا جواب کسی کو نہیں معلوم۔"

"کیا یہ سب لوگ زندہ ہیں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"زندہ ہیں؟" میں نے ہنس کے کہا "عیش و عشرت کر رہے ہیں، یہ سب جزیرۂ توری میں موجود ہیں۔ سب تمہاری طرح بے لباس رہتے ہیں، بوڑھا سرنگا بھی ننگا رہتا ہے۔"

"اوہ جابر!" وہ بے چینی سے بولی "مجھے ان کے متعلق بتاؤ۔"

میں نے ایک قدح مشروب کا اور پیا۔ فلورا میری آغوش میں مچلنے لگی اور اس طرح نیم دراز ہوئی کہ اس کا چہرہ میرے چہرے کے سامنے تھا۔ اب اس کی حالت بہتر تھی اور جب قربتوں کا یہ منظر آیا تو میری زبان پر نہ کوئی شکایت آئی نہ میں اس تلخی کا اظہار کر سکا جو فلورا کے واسطے مجھے مل گئی تھی۔ جب وہ سینے سے لگی تو زہر غبار چھٹ گیا۔ اس نے شوالا کے پاس جانے کا جو جواز پیش کیا تھا، وہ اس کے جذبات کا ایک بے مثل ایثار تھا۔ مہذب دنیا کے کسی بھی فرد نے اتنی پریشانیاں نہیں اٹھائی تھیں جتنی فلورا نے اٹھائی تھیں۔ تھوڑی دیر میں ہمارے درمیان کوئی فاصلہ حائل نہ رہا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ دوری میرے حق میں بہتر ہوئی کیونکہ فلورا آج کچھ اور ہی انداز سے مل رہی تھی۔ آکسفورڈ میں تو وہ ایک طنطنے سے بات کرتی تھی۔ بیروت میں بھی میری وارفتگیوں کے باوجود اس کے ہاں ایک گریز تھا۔ اب اس میں کوئی تکلف نہیں تھا۔ وہ ہمہ دل، ہمہ جذب تھی۔ اس کی قربت میں، میں بھول گیا کہ تاریک برِاعظم میں میرا کیا مرتبہ ہے؟ میں اس وقت اپنے ماضی میں تھا، میں بیروت میں تھا، میں اس کے سامنے صرف اس کا آدمی تھا اور میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ صرف اس کی خوشی عزیز تھی، صرف اس کی سرشاری مطلوب تھی۔

رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ ہمیں کھانے پینے کا ہوش نہ رہا۔ وہ میری سرگزشت پورے انہماک سے سنتی رہی۔ اس میں سبھی کا ذکر تھا۔ اس میں آقابلا کا بھی ذکر تھا۔ آقابلا کے ذکر پر کئی بار اس کی آنکھوں میں مشعلیں روشن ہوئیں مگر میں نے اس کے ضمن میں اپنی تمام شدتوں کا احوال بیان نہیں کیا کیونکہ مجھے فلورا کی نازکی کا خیال تھا۔ مجھے اس کے نبیتے کا خیال تھا۔ جب آقابلا کا ذکر آیا تو میں نے خود اپنے درونِ خانہ جھانک کر دیکھا۔ آقابلا پوری تمکنت سے میرے اندر موجود تھی۔ وہ کچھ اور سربلند معلوم ہوتی تھی۔ اسے اپنے اندر پا کے مجھ پر فخر و شادمانی کے جذبے چھا گئے اور فلورا پر میرے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ تاریک برِاعظم میں اتنا عرصہ گزارنے کے بعد فلورا ان رموز سے آگاہ ہو گئی ہوگی جو مقام کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں اور میرا خیال ہے، وہ کہیں نہیں بدلتے، صرف رسمیں بدل جاتی ہیں، صرف پیمانے مختلف ہوتے ہیں۔ اس نے میری گفتگو سے مفاہمت کی۔ اس لیے نہیں کہ وہ مفاہمت پر مجبور تھی بلکہ اس لیے کہ اس میں میرے بیان کی سچائی شامل تھی اور تاریک برِاعظم میں ہم سب بے لباس ہو گئے تھے۔ ہم نے زیادہ قریب سے

انسانی جذبوں کا مطالعہ کیا تھا۔ میں نے اسی لیے آقا بلا کا نام صاف گوئی سے لیا اور فلورا نے اسے اسی طرح قبول کیا جس طرح میں نے بیان کیا تھا۔ سورج کی اولین کرنیں جب درزوں سے اندر آنے لگیں تو ہمیں وقت کا احساس ہوا۔ رات بھر میں فلورا کو میں اپنے بیتے ہوئے دنوں کے متعلق جو کچھ بتا سکتا تھا، وہ میں نے بتا دیا۔ وہ سرتیا، فروزیں، مارتسا، جولیا اسٹراڈ، ڈاکٹر جواد اور سرنگا کے ناموں پر بے چین ہو جاتی تھی۔ ہم ایک دوسرے میں مدغم تھے لیکن وہ استعمال کے لمحے نہیں تھے۔ میں نے اس کے شیریں لبوں سے صرف ایک بار اپنا دہن تر کیا۔ ہاں اس کا گداز رات بھر میرے تھکے ہوئے جسم کو تھپکیاں دیتا رہا۔ ہم نے اپنا وقت لطافتوں میں بتایا، وحشتوں میں صرف نہیں کیا۔ وہ ہمہ تن گوش تھی اور میری زبان سے گزرے ہوئے وقت کا بوجھ اُتر رہا تھا۔

"یہ سلسلہ ختم کہاں جا کے ہوگا؟" اس کی لرزتی ہوئی آواز اُبھری۔

"پتہ نہیں لیکن ہم کسی فیصلہ کن موڑ پر ضرور آ گئے ہیں۔ یہاں اسرار کے پرت ہیں، ایک پرت ہٹاؤ، دوسرا نظر آ جاتا ہے۔ ایک گتھی سلجھاؤ، ہزار گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔ ایک معرکہ سر کرو، اَن گنت معرکے منتظر رہتے ہیں۔ ایک طاقت زیر کرو، دوسری طاقتیں اُبھر آتی ہیں۔"

"بوڑھے سرنگا کا خیال صحیح ہے کہ ہمیں یہاں سے واپسی کی جستجو ہمیشہ کرتے رہنا چاہیے۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولی۔

"اس نے توری کے میدانِ جنگ میں کہا تھا کہ میں انگروما کی قید میں چلا جاؤں، نہ جانے اُس کا کیا مطلب تھا۔"

"اس کا مطلب بہت صاف تھا۔ انگروما تمھاری عظمت کی راہ میں سنگِ میل ثابت ہو سکتا ہے۔ تم یہاں اِن لوگوں سے وہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہو جو توری کے بزرگ عابد تمھیں دینے میں بخل کرتے ہیں کیونکہ انھیں تمھاری سرفرازی سے بہت سے اندیشے لاحق ہو جاتے ہوں گے۔"

"تم نے اپنی اسی ذہانت کی وجہ سے زبگا اور ارمیگا کے دلوں پر حکومت کی ہوگی۔ میں نے بیزنار میں تمھارا تعمیر کردہ مکان دیکھا تھا۔" میں نے شوخی سے کہا۔

"یہ رگیں مت چھیڑو۔ اگر میں یہ ذہانت صرف نہ کرتی تو آج تم سے دوبارہ ملاقات نہ ہوتی۔"

"اب تم آ گئی ہو تو خوب آرام کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"میں تمھیں آرام نہیں کرنے دوں گی۔" وہ پُرعزم لہجے میں بولی۔ "تم اسی رفتار سے اپنا سفر جاری رکھو گے جس طرح اب تک سفر کرتے رہے ہو بلکہ اس میں اور شدت پیدا کرو گے۔ میں تمھارے بہت قریب ہوں لیکن تمھیں اس وقت تک اپنے نزدیک نہیں پھٹکنے دوں گی جب تک ہم اپنا مقصد حاصل نہیں کر لیتے۔"

"میں تمھیں دبوچ لوں گا۔" میں نے اس کی ہڈیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔

"تو میں مر جاؤں گی تاکہ میرا غم تمھیں اپنے مقصد کی یاد دلاتا رہے۔ سنو جابر! تم دو طریقوں سے یہاں اپنا کام شروع کر سکتے ہو۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ تمھیں یہاں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر انگروما میں علم سیکھنا ہے اور کوئی بڑا مرتبہ حاصل کرنا ہے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تمھیں یہاں ہر جگہ یہ عمل جاری رکھنا ہے۔ دوسرا طریقہ مہلک ہے کیونکہ ابھی تمھیں انگروما کے ساحروں کی پیمائش کا صحیح اندازہ نہیں ہے، ممکن ہے کہیں تم ٹھوکر کھا جاؤ — یہ مہمانی و میزبانی کی اجازت ایک حد تک دیں گے۔"

"یہ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔" میں نے سرکشی سے کہا۔

"تم تنہا ایک دن خود تھک جاؤ گے۔ ممکن ہے ایک بار پھر تم انگروما سے توری واپس چلے جاؤ لیکن کیا ہوگا؟ کوئی بڑا انقلاب نہیں آ جائے گا۔ ہمیں کسی امید کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے اور جدوجہد ہی کرنا ہے تو باقاعدہ منصوبے سے کیوں نہ کی جائے؟"

"تمھارا مقابلہ مہذب دُنیا کے کسی شخص یا اشخاص سے نہیں ہے بلکہ پُراسرار بلاؤں اور ناقابلِ توجیہہ مظہروں سے ہے۔"

"اور تم نے انھی حالات میں اپنا سینہ بھاری کیا ہے۔" فلورا جوش میں بول رہی تھی۔

"اٹھو۔ انگروما کی گلیوں میں چلو — مجھے یہیں چھوڑ دو۔ میرا خیال ترک کر دو اور نئے راستے تلاش کرو۔"

"صبر، صبر، فلورا، ذرا صبر کرو۔ ابھی مجھے تمھیں جی بھر کے دیکھنا ہے۔"

"اس کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔" وہ شرماتے ہوئے بولی۔

"تم نے بڑا تنگ کیا ہے۔ اب میں تمھیں تنگ کروں گا۔"



"تم مجھے راکھ کردینا، میرا خون پی جانا۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ مہذب دُنیا کے ساحل پر قدم رکھتے ہی تمھارے حکم پر اپنی جان قربان کردوں گی۔"

"وہاں تو تم بات بھی نہیں کروگی۔"

میں اُسے چھیڑتا رہا۔ سورج کی روشنی سے جھونپڑی میں اُجالا ہوگیا تھا۔ تشپالی کی آگ ابھی تک روشن تھی اور چوبی اژدہا ابھی تک مستعدی سے دروازے پر تعینات تھا۔ میں نے اُٹھ کے دیکھا، میرا محاصرہ جوں کا توں قائم تھا۔ میں نے اور فلورا نے گوشت کے چند پارچے ایک دوسرے کے منہ میں ڈالے اور شراب اُچھالے۔ کل صبح جب میں نے انگروما کی خشکی پر قدم رکھا تھا، میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ فلورا سے ملاقات ہو جائے گی۔ اُس فلورا سے جس کے لیے میں تاریک برِ اعظم کے ویرانوں میں عرصے تک خاک چھانتا رہا تھا۔

انگروما میں دوسرے دن ہم دونوں ایک نئے عزم کے ساتھ باہر نکلے۔ ہمارے چہروں پر رات بھر کی بیداری کے باوجود ــــــــــ شادابی تھی۔ فلورا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے اپنی برہنگی سے حجاب آنے لگا تھا۔ کچھ یہی حال فلورا کا تھا لیکن کچھ دُور جانے کے بعد ہمارے برہنہ جسموں نے ایک دوسرے سے خوب شناسائی پیدا کرلی۔ مجھے یقین تھا کہ فلورا بھی وہی سوچ رہی ہے جو میں سوچ رہا ہوں۔ سرِراہ میں نے ایک بڑے درخت پر تشپالی پھینک کے آگ لگادی اور فلورا کو حیرت زدہ کردیا۔ اس کے سامنے اپنی طاقت کے عملی مظاہرے کے لیے میرے دل میں عجب اُمنگیں اُٹھ رہی تھیں۔ میں توری کی طرح یہاں کی زمین پر بھی محل اُگا سکتا تھا۔ جب راستے میں ایک مجسمہ نظر آیا تو میں نے اُسے لمحوں میں متحرک کرکے فلورا کو اور پریشان کردیا۔ میرے اشارے پر ایک سیاہ فام شخص راستہ چلتے چلتے زمین پر لوٹنے لگا۔ فلورا نے یہ تماشا دیکھ کے مجھ سے اس کی پُرزور سفارش کی اور میں نے اسے دوبارہ صحیح و سلامت زمین پر ایستادہ کردیا۔ ہم اور آگے بڑھے تو میں نے اپنا خنجر آسمان کی طرف اُچھالا۔ فلورا نے دہشت سے اُوپر دیکھا۔ خنجر ایک پرندے میں پیوست ہوگیا تھا اور اب پرندے سمیت نیچے اُتر رہا تھا۔ میں نے پرندہ وہیں چیر پھاڑ کے اس کا دل کھا لیا اور اس کا خوب صورت پَر فلورا کے بالوں میں لگادیا۔ مجسموں کے درمیان میں نے کیشا کا مجسمہ تلاش کیا اور اسے متحرک کیا تو وہ حیرت زدہ ہوکے میرے سینے سے لگ گئی۔ اس کا حسن اور دلِ فتنگی دیکھ کے فلورا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیشا دیر تک میرے بارے میں پوچھتی رہی۔ میں نے آگے جا کے اسے دوبارہ پتھر کے خول میں مقید کردیا۔ وہ دوبارہ ساکت و جامد ہوگئی۔ میں راستے بھر فلورا کو اپنے طلسم کے تماشے دکھاتا ہوا گُرمے کے شکستہ طلسم کدے تک پہنچ گیا۔ اس کا طلسم خانہ میں نے جلا دیا تھا اور وہاں سے ہربیکا کی مقدس آنکھیں اپنے قبضے میں کرلی تھیں۔ وہ آنکھیں اب بھی میری گردن میں لٹکی ہوئی تھیں۔ گُرمے کے طلسم کدے میں قبتانِ آقا بلاکی پری جمال کنیز نیشا بھی تھی جو انگروما میں میری طرفدار ہوگئی تھی کیونکہ وہ دل سے انگروما کے باغیوں کے خلاف تھی۔ گُرمے توری کے معرکے میں شریک تھا اور کشتی میں بھی میرے ساتھ تھا لیکن میری اس سے کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ شاید گُرمے نے تباہ حال طلسم کدے کے ساتھ ساتھ ایک نیا طلسم کدہ تعمیر کرلیا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے ایک ٹھوکر لگائی تو پتھر میں شگاف پڑ گیا اور اندر سے گُرمے بھاگتا ہوا آیا۔

"معزز جابر بن یوسف!" وہ مجھے دیکھ کے سٹپٹا گیا اور محتاط لہجے میں بولا۔ "آؤ آؤ اندر آؤ۔ میں تمھیں اپنا نیا طلسم کدہ دکھاؤں۔"

میں نے اندر جا کے ایک اُچٹتی نظر ڈالی۔ دیواروں پر جانوروں کی کھوپڑیاں لٹکی ہوئی تھیں اور وسط میں انسانوں کی کھوپڑیوں کا انبار تھا۔ گُرمے کے طلسم کدے میں پہلے سے زیادہ سامان نظر آرہا تھا۔ ایک طرف جارا کا کا کی مورتی رکھی تھی اور اس میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ کمرے میں چربی کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ گُرمے سحرکاری میں مصروف تھا۔ "ہاں۔" میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے خاصی چیزیں جمع کر رکھی ہیں مگر میری آنکھوں نے جاملوش کا طلسمی عشرت کدہ دیکھا ہے اور اسمارا میں حیرت انگیز نوادر کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہ سب اُن کے سامنے کچھ نہیں ہے۔ اس لیے میں تم سے ایک برحق بات کہتا ہوں کہ تمھیں جاملوش سے مقابلے کے لیے ابھی ایک مدت درکار ہوگی اور اس مدت میں جاملوش اور آگے نکل چکا ہوگا کیونکہ اس کے ہاں سحر و افسوں کا سلسلہ بند نہیں ہوا ہے۔ اس کے علاقے میں اب بھی لوگ کڑی ریاضتیں کرتے ہیں۔ میں نے انگروما میں کوئی ایسا علاقہ نہیں دیکھا جو جاملوش جیسی درس گاہ کا حامل ہو۔"

"تم نے انگروما میں ابھی کیا دیکھا ہے جابر بن یوسف! افسوس ہے جب تم علوم سیکھنے کے مرحلے میں آئے تو انگروما سے فرار ہوگئے۔ اگر یہاں رہتے تو مقدس ربما جن تمھیں طلب کرلیتا۔" گُرمے نے وہی ردِ عمل ظاہر کیا جس کا میں خواہاں تھا۔

"لیکن اب میں دوبارہ واپس آیا ہوں تو ایسی صورت نہیں ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے تمھاری اس وقت کی مشقت یاد ہے جو تم نے ہربیکا کو زیر کرنے کے لیے کی تھی۔ اب میں وہ سب کچھ سوچتا ہوں تو مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ اُس وقت بھی میرے پاس زارشی کا یہ تحفہ تشپالی تھا۔ اُگبی کے سینگ تھے۔ اب تو

بلت ہی کچھ اور ہے تم ایک زمانے میں میرے اتالیق تھے۔" میں گرزمے کو اُکسا تا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے کتنی نفرت کرتا ہوگا کیونکہ میں نے اس کا طلسم کدہ تباہ کر دیا تھا۔ گرزمے بڑے ادب سے بات کر رہا تھا۔ میں کے طنز پہلے تو وہ برداشت کرتا رہا جو میں نے انگروما کے عالموں کے متعلق کیے پھر وہ ناراض ہونے لگا۔ میں اس کی برہمی ہی کا خواہش مند تھا۔ میں نے ریماجن کے بارے میں شدید جملے کہے اور اُس کے علم و طاقت سے جاملوش کا موازنہ نہایت اشتعال انگیز انداز میں کیا چونکہ مجھے ریماجن کے بارے میں اہم معلومات درکار تھیں۔ گفتگو کے درمیان میں نے دانستہ طور پر گرزمے کے طلسم کدے سے ایک انسانی کھوپڑی اُٹھائی اور اس کے نیچے ہیبت زدہ انداز میں کھڑی ہوئی فلورا کا ہاتھ رکھ دیا اور فلورا سے کہا کہ وہ کھوپڑی اُچھالے۔ فلورا نے کھوپڑی چھت کی طرف اُچھال دی جو ایک جگہ جا کے مُعلّق ہوگئی پھر میں نے گرزمے سے کہا کہ وہ کھوپڑی زمین پر لانے کی کوشش کرے اور چاہے تو اپنے کسی بزرگ سے مدد لے لے۔ گرزمے نے اس ہتک پر خوں بار آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان توہین آمیز کلمات نے اسے صدمہ پہنچایا تھا۔ اس نے چند لمحوں کے لیے غصّے سے آنکھیں بند کیں، دیکھتے ہی دیکھتے معلّق کھوپڑی میں آگ لگی پھر اس کا نام و نشان تک نہ رہا۔ یہ ایک معمولی عمل تھا۔ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ گرزمے یہ کام آسانی سے کر سکتا ہے۔ میں نے بظاہر برافروختہ ہو کے اس کی ساری کھوپڑیاں اسی طرح خاک کر دیں جیسا کہ اس نے معلّق کھوپڑی کے ساتھ کیا تھا۔ گرزمے اس پر ہذیان بکنے لگا اور اس نے ریماجن کے حوالے سے کہا کہ وہ میرے خلاف اس کی خدمت میں درخواست پیش کرے گا تاکہ میرے گلے میں لگام ڈال دی جائے اور انگروما میں مجھے کھلا نہ چھوڑا جائے۔ جب گرزمے خاصا ناراض ہو چکا اور غصّے میں ریماجن کے بارے چند اہم نکتے میرے گوش گزار کر چکا تو میں نے اُس پتھر پر ہاتھ پھیرا جس پر کھوپڑیاں دھری تھیں۔ شاید گرزمے کو ایک پل آنکھ بند کرنے کی مہلت ملی ہوگی کہ ساری کھوپڑیاں جوں کی توں وہاں موجود تھیں میں نے قہقہہ لگا کے کہا۔ "گرزمے! محترم گرزمے! دیکھنا ان میں کہیں تمھاری کھوپڑی تو نہیں ہے؟"

گرزمے میرے اس عمل پر حواس کھو بیٹھا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس نے اپنی حیرت پر قابو پا لیا اور نہایت اطمینان سے کہنے لگا۔ "مقدس جابر! بلاشبہ تم بہت آگے نکل گئے ہو۔ میں تم سے درخواست کروں گا کہ مجھے اپنی شفقت کی چھت میں لے لو۔ مجھے اپنا شاگرد تسلیم کر لو اور اپنے علم کی روشنی سے میرا دماغ منور کر دو۔"

"ایک شرط پر۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"وہ کیا؟ میں تمھاری ہر شرط منظور کرتا ہوں۔" وہ تیزی سے بولا۔

"وعدہ کرو کہ تم مقدس آقا بلا کے خلاف جدوجہد سے باز آ جاؤ گے۔"

"یہ ناممکن ہے۔" وہ ترشی سے بولا۔

"تمھاری مرضی۔ حالانکہ تم نے ابھی ابھی وعدہ کیا تھا۔"

میں دیر تک گرزمے کے طلسم خانے میں مختلف چیزیں چھیڑتا رہا اور اُسے تنگ کرتا رہا، اس کے بعد گرزمے خاصا محتاط ہوگیا، وہ بڑے تحمل سے میرے سخت سست



جملوں اور طنز و تضحیک کے رویّے کو پی گیا۔ اس دوران میں فلورا بار بار مجھے ٹوکتی رہی تھی۔ وہ خوف زدہ تھی کہ کہیں میں کوئی غلط قدم نہ اُٹھا لوں۔ میری نظریں نیشا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں نے بے تکلفی سے اُس کے بارے میں گرزمے سے پوچھا۔ گرزمے نے ایک صدا لگا کے اُسے فوراً میرے سامنے پیش کر دیا۔ نیشا مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر وہی تازگی تھی جو آقا بلا کی کنیزوں کا خاصّہ ہے۔ اُسے میری آمد کی اطّلاع ہو چکی تھی۔ فلورا کے سامنے بارگاہِ آقا بلا کی ایک اور حسین و جمیل عورت کھڑی تھی۔ میں نے کسی جھجک کے بغیر نیشا کو شب بسری کے لیے اپنی جھونپڑی میں مدعو کر لیا اور اس نے کمال اشتیاق سے وعدہ کر لیا۔

ابھی میں گرزمے کے طلسم خانے سے نکلنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ مجھے ایک خیال آیا۔ چلتے چلتے میں نے اُس سے اس غار کے بارے میں پوچھا جہاں انگروما کے ساحروں نے روحیں قید کر رکھی تھیں۔ "کیا وہ ابھی تک زنداں میں مقیم ہیں؟" میں نے گرزمے سے پوچھا۔

"ہاں، ہم نے ان میں اور اضافہ کر لیا ہے۔ یقیناً ہمیں کسی وقت بھی ان کی ضرورت پڑے گی۔" اس نے متانت سے جواب دیا۔

"مگر گرزمے! تم انھیں آزاد کیوں نہیں چھوڑ دیتے، کیا تم انھیں تابع کرنے کی خوبی سے محروم ہو جو تم نے ایک غار میں انھیں محبوس کر رکھا ہے؟"

"ہم انھیں اس وقت آزاد کریں گے جب سرزمینِ آقا بلا سے ہمارا آخری معرکہ ہوگا۔"

"لیکن جاملوش کے علاقے میں روحیں آزاد رہتی ہیں اور جاملوش جب چاہتا ہے انھیں طلب کر لیتا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس سلسلے میں خود بھی خاصا تجربہ حاصل کیا ہے۔ کیا تم مجھے وہاں پھر لے چلو گے؟"

"ہمیں مقدس ریماجن سے اجازت لینی ہوگی۔" گرزمے نے جواب دیا۔

"پہلے تم خلوصِ دل سے انگروما کے حامی بن گئے تھے۔ اب کھلے عام انگروما کی وجود کی مخالفت کر رہے ہو۔"

"اچھا گرزمے۔" میں نے موضوع بدل کے کہا۔ "میرے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟"

کیا تم سمجھتے ہو کہ میں دوبارہ تمہارا ہمنوا بن جاؤں گا اور اگر تم یہ نہیں سمجھتے تو مجھ جیسے خطرے کو تم نے انگرد ما کی سرحدوں کے اندر کیوں برداشت کر رکھا ہے؟"

"تم ایک ہوشمند شخص ہو جابر بن یوسف! آقابلا اور جالموش کے لیے تم ہماری نفرت سے پوری طرح آگاہ ہو یہ نفرت بے سبب نہیں ہے۔ کیا تم نے جالموش کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا ہے؟ وہ ایک سانپ ہے جو پھن کاڑھے آقابلا کے قصر پر بیٹھا رہتا ہے، وہ ایک ظالم شخص ہے جو صرف اپنی برتری کا خواہاں ہے۔ اس نے اپنے سوا تمام راستے بند کر دیے ہیں اور تاریک برِ اعظم کے عابدوں زاہدوں کو اذیت ناک سزائیں دی ہیں۔ کیا تم تاریک برِ اعظم میں جالموش سے بڑے مرتبے کی امید رکھتے ہو؟ تم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔ جس دن تم نے اس طرح سوچنا شروع کر دیا، جالموش تمہیں آگے دبوچ لے گا کیونکہ اس نے تمام طاقتیں اپنے گرد جمع کر رکھی ہیں۔ اور آقابلا۔" وہ نفرت سے بولا۔ "جابر بن یوسف۔ کیا تمہیں سب کچھ دوبارہ سمجھانے کی کوشش کرنی پڑے گی؟ کیا ہم سب لوگ پاگل ہیں؟ کیا تم آقابلا کی بارگاہ میں وہ منصب حاصل کر سکتے ہو جس کے امیدوار ہو اور یہاں کا ہر شخص جس کا امیدوار ہے؟ اس کا حسن، وہ حسن جس کا پہرے دار جالموش ہے۔ کیا تم اس پہرے دار سے بچ کے اندر داخل ہو سکتے ہو؟"

گورمے کی باتوں میں خاصا تاثر تھا۔ وہ ایسے دردناک انداز میں بول رہا تھا کہ اس پر جھوٹ اور تصنع کا گمان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میری نظروں میں وہ سارا منظر گھوم گیا جب آقابلا مجھ پر مائل تھی اور جالموش کی چیخوں نے وہ خوب صورت، وہ دل نشیں منظر منتشر کر دیا تھا۔ جالموش کے علاقے میں اس کا رویہ ——— آقابلا کی جھجک، سمورال کی پیش بینیاں، سرنگا کے نصائح اور خود میری ذات کا کرب۔ شاید گورمے کو معلوم تھا کہ اسے میری کون سی رگوں پر ہاتھ رکھنا چاہیے۔ وہ آقابلا کے اقتدار سے نفرت کرتے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ آقابلا کو تاریک برِ اعظم کے تخت پر متمکن دیکھنا نہیں چاہتے اور وہ جالموش کی طاقت سے حسد رکھتے ہیں اور ان کے یہ باغیانہ خیالات محض بغض و عناد کی وجہ سے ہیں لیکن گورمے ایسی ناگفتنی باتیں کہہ رہا تھا جن کا شکار کبھی کبھی میں خود ہو جایا کرتا تھا۔ میں جن ناآسودگیوں کے بارے میں اپنی تنہائیوں میں سوچتا تھا، آقابلا کے قصر سے ناکام واپس آنے کے بعد جو حال میرا ہوا تھا، وہ انگرد ما کے ہر فرد کا تھا۔ ان کی کیفیت مستقل تھی۔ مجھ پر عارضی حملے ہوتے تھے، پھر کہیں سے اس کی نگاہِ کرم کی امید ہونے لگتی تھی۔ خود میرے دل میں انھی جذبوں نے کئی بار سر ابھارا تھا۔ میں اتنا بڑا بے وقوف نہیں تھا اور میں اتنا بڑا قانع شخص نہیں تھا کہ یہ تمام وسائل "تاریک برِ اعظم" کے تمام پُراسرار ذرائع خود حاصل کرنے کی خواہش کبھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ ان اسرار سے پوری آگہی حاصل کرنے کی جستجو میرے اندر بھی شدید تھی۔ گو میری ذات کا محور صرف آقابلا تھی، اقتدار نہیں تھا لیکن آقابلا کی زلفِ دوتا تک پہنچنے کے لیے تاریک برِ اعظم کی تمام طاقتیں اپنی زیرِ نگیں بنانے کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس بلندی تک پہنچنے کی راہ میں جو فصل حائل ہوگی، وہی میرا حریف، میرا رقیب تھی اور یہ رقیب اس وقت تک موجود تھا جب تک اسے راستے سے ہٹا نہ دیا جائے ——— گورمے کی باتیں انگرد ما کے لیے پروپیگنڈے کی حیثیت رکھتی تھیں اور پروپیگنڈا اپنا اثر کھو بیٹھتا ہے اگر معمول کو اس کی نوعیت کا علم ہو جائے کہ وہ جو کچھ سن رہا ہے، پروپیگنڈا ہے لیکن سچ بہرحال اثر رکھتا ہے۔ گورمے کی باتوں میں سچ تھا۔ میں ان سب مصائب کا ہدف رہا تھا۔ ممکن تھا، گورمے ابھی کچھ اور اشتعال انڈیلتا اس لیے میں فوراً وہاں سے چل دیا۔ اس کے طلسم خانے سے نکل کے میں اور فلورا انگرد ما کی بستی سے بہت دور نکل گئے۔ ہم نے سنسان گوشوں غاروں میں بیٹھے ہوئے مست الست زاہد دیکھے۔ ان کے چہرے کسی امید سے چمک رہے تھے۔ عجب کہ توری اور دوسرے جزیروں کے زاہدوں کے چہروں پر ایسی تابانی نہیں ہوتی تھی۔ انگرد ما ایک سرسبز و شاداب جزیرہ تھا۔ جنگل میں ایک درخت کے سائے میں ہم نے پڑاؤ ڈال دیا۔ گورمے کی باتوں نے بڑا تھکا دیا تھا۔ بے شمار چہرے میری نظروں کے دائرے میں رقص کناں تھے۔ فلورا نے اس جگہ کی تنہائی محسوس کر کے مجھ سے بات کرنی چاہی لیکن میں نے اسے خاموش کر دیا۔ یہ کھلی جگہ بات کرنے کے لیے نہایت ناموزوں تھی۔ میں زمین پر لیٹ گیا اور فلورا نے میرے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ میرے ذہن میں ایک شورش برپا تھی۔



شام کو جارا کاکا کی مشترکہ عبادت میں پھر میرا خنجر خوں ریزی کے لیے مچلنے لگا اور میں نے ہجوم کے سامنے اپنے علم کا کوئی بہت بڑا مظاہرہ کرنے کا ارادہ کیا مگر ہجوم کی انگرد ما سے سابق عقیدت دیکھ کے میرے حوصلے پست ہو گئے۔ میں نے آواز بلند کر کے پھر انھیں ان کے موقف سے باز رہنے کی تلقین کی۔ انھوں نے کل کی طرح میرا خطاب پوری توجہ سے سنا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے انھوں نے ایک کان سے سن کے دوسرے کان سے اڑا دیا ہو۔ گورمے کی مسکراہٹ مجھے زہر معلوم ہو رہی تھی۔ میں فلورا کو لے کے وہاں سے چلا آیا۔ انگرد ما میں مشعلیں روشن ہو چکی تھیں۔ جھونپڑی میں آ کے ہم دونوں بے سدھ دراز ہو گئے۔ فلورا میری ذہنی کشمکش میں شریک تھی۔

میں انگرد ما میں کیا کروں؟ گورمے کو ختم کر دوں؟ گرد ٹا کو مار دوں؟ اور چن چن کے غاروں میں بیٹھے ہوئے ساحروں کو نیست و نابود کر دوں؟ کیا میں اتنا بڑا جزیرہ تنہا ختم کر سکتا ہوں؟ میں اپنا میزان کر رہا تھا، ان لوگوں کی شائستگی، نرمی، اخلاق اور تواضع کے رویے بڑے بڑے جری لوگوں کو کمزور کر دیتے تھے تو کیا میرا کام یہ ہونا چاہیے کہ میں یہاں کی اصل طاقت کا اندازہ لگاؤں اور جالموش سے رابطہ قائم کر کے اسے مطلع کر دوں کہ وہ انگرد ما کو کسی وقت زیر کر سکتا ہے یا ان شرائط کے تحت مجتمع کر سکتا ہے؟ جب جالموش اور آقابلا انگرد ما کا وجود نہ مٹا سکے تو میں تنہا کیا کر سکتا ہوں؟ میں جالموش سے بڑا ساحر نہیں ہوں، سرنگا کی دلوی سے بڑی طاقت نہیں رکھتا۔ جالموش نے انگرد ما کے بارے میں کبھی شدت سے کیوں نہیں سوچا؟ ممکن ہے، وہ آقابلا کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ایسے کسی مخالف جزیرے کا وجود خود پسند کرتا ہو تاکہ اس کی عظمت برقرار رہے۔ اور ——— اور ممکن ہے ——— ممکن ہے کہ خود جالموش کی ایما پر انگرد ما کا قیام عمل میں آیا ہو؟ ان حالات میں مجھے کیا قدم اٹھانا چاہیے؟ یہ سوال مجھے اس وقت سے پریشان کر رہا تھا جب میں جزیرۂ انگرد ما کی طرف آنے والی کشتی میں بیٹھا تھا۔ میں نے سرکشی کر کے فلورا کو حاصل کر لیا تھا۔ میں اب اور کیا

کروں؟ ذہن بند تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کاش سرنگا کی دیوی آ کے رہنمائی کر جاتی۔ میں تھک گیا۔ فلورا نے اٹھ کے میرے لبوں سے مشروبات کے کئی قدح مس کر دیے۔ مجھے انھیں پینے نہ پینے کا خیال نہیں تھا۔ رات ڈھلی تو مشعل کی روشنی میں نیشا اپنا تاباں چہرہ لیے ہوئے برآمد ہوئی۔ اس کے آنے سے خیالوں کا یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ فلورا موجود تھی۔ میں نے اس کے سامنے ہی نیشا کو ہم آغوش کیا اور اس کے لبوں سے آبِ نشاط انڈیلا۔ وہ میرے ساتھ ہی پیال کے بستر پر لیٹ گئی۔ فلورا خاموشی کے ساتھ میرے بائیں پہلو میں لیٹ گئی۔

میں نے حجرہ جلد از جلد انگروما کی باقی زمین سے کاٹ دیا۔ اب ہماری آوازیں باہر نہیں جا سکتی تھیں۔ مجھے خدشہ تھا کہ اس عرصے میں نیشا کہیں انگروما کے باغیوں کی حامی نہ ہو گئی ہو؟ چنانچہ میں نے مختلف طریقوں سے اسے ٹٹولنا شروع کیا۔ وہ ابھی تک آقا بلا کو یاد کرتی تھی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کے میں نے ریماجن کے متعلق اپنا تجسس ظاہر کیا اور اس کی گفتگو سے مجھے کچھ اطمینان نصیب نہیں ہوا بلکہ ذہنی حالت اور متزلزل ہو گئی۔ وہ ریماجن اور جاملوش کو ایک ہی صف میں کھڑا کر رہی تھی۔ ریماجن جاملوش کا نائب تھا اور زہد و عبادت سے اس نے جاملوش کے درجے کا منصب حاصل کر لیا تھا۔ پھر ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اور ریماجن نے انگروما کے جزیرے میں پناہ حاصل کر لی۔ رفتہ رفتہ اس نے ایسی طاقت پیدا کی کہ جاملوش سے باقاعدہ نبرد آزما ہونے لگا۔

"مقدس آقا بلا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ اختلاف تو محض جاملوش اور ریماجن کے درمیان ہے۔ مقدس آقا بلا اس میں کہاں ملوث ہوتی ہے؟ کیا وہ اتنی مجبور اور بے بس ہے کہ اسے اصل حالات کا پتہ نہیں؟"

"آہ جابر!" نیشا تاسف سے بولی۔ "وہ ایک عظیم طاقت ہے۔ وہ جارکا کی مقدس روح کی امان میں ہے مگر اسے بہرحال اپنے عابدوں اور زاہدوں کی ایک کثیر تعداد کی اعانت کی ضرورت پڑتی ہے۔ خصوصاً جاملوش اس کے لیے ہمیشہ ایک ڈھال ثابت ہوا ہے۔"

"وہ جاملوش کو برطرف کر سکتی ہے اگر وہ ایک عظیم طاقت ہے تو نارییک برِ اعظم کے تمام ذرائع اس کی تحویل میں ہونے چاہئیں۔"

"وہ دیوتاؤں کے ازلی قوانین کی بھی تو تابع ہے۔ وہ ایسے فیصلے کس طرح صادر کر سکتی ہے جو دیوتاؤں کے نافذ کردہ قوانین کے برعکس ہوں۔"

نیشا کے جواب سے متعدد سوال ابھرنے لگتے۔ میں اس سراغ میں کسی حل تک پہنچنے کے بجائے اور الجھتا گیا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ نیشا ان مشکل سوالوں کے جوابات کے لیے ناموزوں عورت ہے۔ وہ صرف آقا بلا کی پرستار ہے۔ ہاں نیشا سے ریماجن کے بارے میں بیش از بیش معلومات حاصل ہو گئیں۔ نیشا ایک مدت بعد میرے ساتھ شب بسر کرنے آئی تھی۔ اس کی قربت کی حسین یادیں میرے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھیں لیکن فلورا میرے پہلو سے چپکی ہوئی یہ پُراسرار گفتگو سن رہی تھی۔ میں نے نیشا سے صرف عجیب باتیں کیں اور اس کی معطر زلفیں سنواریں اور اس کے گداز سے حظ حاصل کیا۔ وہ رات گزرنے سے پہلے چلی گئی اور ایک طویل مباحثے کے بعد میں اور فلورا کسی نتیجے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ میں نے اسارہ میں شوطار جیسی بڑی ملکہ کو اپنی ذہانت سے زیر کیا تھا۔ انگروما کے میں دماغی طور پر کسی قدر مفلوج ہو گیا تھا مگر ابھی صرف دو دن گزرے تھے۔ فلورا اطمینان سے میرے پہلو میں سو گئی تھی۔ میں رات کے آخری سرے تک آنے والے لمحوں کے بارے میں قیاسات کرتا رہا اور تخمینے لگاتا رہا۔ پھر مجھے بھی نیند آ گئی۔

اگر مجھے یہ اطمینان حاصل نہ ہوتا کہ انگروما میں میرے صحیح و سلامت زندہ رہنے کے امکانات قوی ہیں تو حالات مختلف ہوتے، ہر چند کہ میں نے مشروبِ حیات نہیں پیا تھا مگر میرے جسم پر سحر کا ایک خول چڑھا ہوا تھا جو آسانی سے نہیں توڑا جا سکتا تھا۔ یہ حقیقت انگروما کے لوگوں کو معلوم تھی۔ وہ میرے گلے میں لٹکے ہوئے تو اور بھی برتت اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ صبح اٹھ کے میں نے فلورا کو جھونپڑی میں چھوڑ دیا اور انگروما کے معظموں، عالموں اور ساحروں سے ملاقات کرنے چلا گیا۔ میں جہاں جہاں گیا وہاں وہاں انھوں نے میری تعظیم کی۔ میں نے حسبِ سابق آقا بلا اور جاملوش کے بارے میں انھیں ہموار کرنا چاہا۔ انھوں نے مسکرا کے میری بات سنی، ان کا یہ شفقت کارویہ بڑا بے رحم تھا۔ میں نے دلیلوں سے انھیں سمجھانے کی کوشش کی، انھوں نے بھی دلیلوں ہی سے مجھے قائل کرنا چاہا۔ قائل ہونے نہ ہونے کی یہ کشمکش میرے منصوبے کے مطابق تھی۔ میں اس دن صبح اگر گروٹا کے سامنے یہ اعلان کرتا کہ میں تمھارے موقف کی تائید کرتا ہوں تو وہ کبھی یقین نہ کرتا۔ مجھے رفتہ رفتہ ہی یہ احساس دلانا تھا کہ میں ان کی طرف مائل ہو رہا ہوں اور بڑی مشکل سے مائل ہو رہا ہوں۔ اس دن شام کو جارکا کی مشترکہ عبادت کے دوران میں (بھی) میں نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ میں نے انگروما کی دو سیاہ فام لڑکیوں کو اپنے خنجر سے ہلاک کر دیا اور ان کے سر ایک نیزے پر لٹکا دیے۔ وہ میری تو بہ تو دہشتیں دیکھتے رہے اور خاموش رہے۔ ایک بار پھر میں نے ان کے سامنے ملکہ آقا بلا کی تعریف و توصیف میں ایک پُراثر بیان دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں رات کو جنگل میں نکل گیا۔ میں نے جنگل میں گوریے کی طرح آگ لگا کے سحر جگایا اور کئی مقدس جانور ہلاک کیے۔ صبح انگروما میں میں اپنے شکار کیے ہوئے جانوروں کے ساتھ حاضر ہوا تو وہ سب دنگ رہ گئے۔ گوریے نے ایک کے ہر ہیکا کا مغز چاٹ لیا اور اس کی آنکھیں نکال لیں۔ انھیں یقین نہیں آتا تھا کہ میں صرف ایک رات میں اتنے جانوروں کا شکار کر سکتا ہوں اور وہ جانور بھی کون سے؟ سحر کامل کے لیے جن کا خون کھالیں، جگر گردے کام کی چیز ہوتی تھیں۔ جن کی کھوپڑیاں اور ڈھانچے وہ دیواروں پر سجاتے تھے اور ان کے ذریعے اپنی عبادت گاہ سے بلائیں دور کرتے تھے۔

ایک طرف انگروما کے لوگوں کے دلوں میں اپنی اہمیت کا احساس، دوسری طرف انکار، ایک طرف انحراف اور دوسری طرف دلیل سننے کی آمادگی۔ میں تو تبدیلیاں کرتا، بیانات دیتا، اعتراف کرتا اور رفتہ رفتہ آمادگی ظاہر کرتا رہا۔ اس کام کے لیے مجھے وقفے کی ضرورت تھی کیونکہ یہی عمل ایک فطری عمل تھا۔ میں ان کی دانست میں اچانک منقلب نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے ان کے کئی اہم مجسمے توڑ دیے، متعدد لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ میں نے ان کے بہت سے عالموں کو مناظرے کی دعوت دی اور

برسرِ عام آقا بلا کا نام احترام سے لیا۔ پھر میں کئی کئی روز بستی سے دُور رہنے لگا۔ میں دُور دراز علاقوں میں نکل گیا اور انگروما کی اصل طاقت کا اندازہ کرتا رہا۔ ہر بار میں اپنے سفر سے واپس آ کے انھیں چونکا دیا کرتا تھا۔ میرے ہاتھ میں کبھی کسی انسان کی کھوپڑی ہوتی، یا گلے میں متعدد سانپ لٹکے ہوتے، یا درندے میرے عقب میں چلتے۔ میں اس درمیان میں خود اپنے ساحرانہ تجربوں میں منہمک رہا اور یہ یقین حاصل کرتا رہا کہ جارا کا کا کی اعانت میری شریکِ حال ہے اور تاریک براعظم کی نادیدہ طاقتیں میرا ساتھ دے رہی ہیں۔ میں نے ہر بیکا کی آنکھوں سے مدد حاصل کر کے سمندر میں تاریک براعظم کی ایک کشتی کا رُخ بھی انگروما کی طرف موڑ لیا اور جب کشتی کے لوگوں کو میں نے انگروما کے لوگوں کے سامنے پیش کیا تو وہ میرے احترام میں سرنگوں ہو گئے۔ ادھر فلورا دن میں جب اپنی جھونپڑی سے نکلتی تو ساری نگاہیں اس کی جانب مرکوز ہو جاتیں اور وہ کبھی گروہٹا کبھی گورمے کبھی کسی اور سربرآوردہ شخص سے میرا ذکر چھیڑتی کہ میں راتوں کو سحر پھونکتا رہتا ہوں اور نہ جانے کیسی کیسی پُراسرار حرکتیں کرتا رہتا ہوں، وہ انھیں اعتماد میں لے کے اصرار کرتی کہ مجھ جیسے نادرہ کار شخص کی طرف سے بے توجہی برتنے کے بجائے اُسے اپنی جانب کھینچنا چاہیے بصورتِ دیگر میں کسی وقت بھی انگروما کے لیے خطرہ بن سکتا ہوں۔ رات کو میں فلورا کو دن بھر کی رُوداد سُناتا تو وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ لیتی، پھر خود اپنی دن بھر کی سرگزشت سناتی، طرح طرح کی تجویزیں پیش کرتی رہتی۔

پھر ایک دن میں اُس غار کے نزدیک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں انگروما کے ساحروں نے روحیں قید کر رکھی تھیں۔ میں نے اُس کے اِردگرد بے شمار عاملوں کے غار دیکھے جو عام انسانی آنکھ سے پوشیدہ تھے اور اسی لیے پہلی مرتبہ مجھے نظر نہیں آئے تھے۔ وہ اس غار کے نگہبان تھے۔ اُن کی پروا کیے بغیر میں نے غار کا دہانہ کھولا اور اندرونِ غار کئی تہہ بہ تہہ دہانے کھولتا ہوا اس میں داخل ہو گیا۔ الاماں وہاں دھوئیں کے ہزار ہا مرغولے تیر رہے تھے میرے پہنچنے کے بعد وہ شکلیں اختیار کرنے گئے اور حسرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں کسی خوف کے بغیر کئی ساعتوں تک ان کے درمیان رہا اور اس تمام عرصے میں جاملوش کے علاقے کے سب کیے ہوئے عمل پڑھتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سب میرے سامنے سر جھکائے کھڑی ہیں میرے اندر پہنچتے ہی غار کے تمام دہانے بند ہو چکے تھے لیکن مجھے اس کا کوئی خوف نہیں تھا کہ میں باہر کیسے جا سکوں گا اور روحیں فرار کے لیے میرے ساتھ ساتھ چلیں گی تو میں انھیں کس طرح روک سکوں گا؟ میرے ہاتھ میں زارشی کا تحفہ شپالی تھا۔ میں اپنے اِردگرد شعلے لگاتا ہوا غار کے دہانے عبور کر سکتا تھا اور یہی ہوا۔ جس رکاوٹ کا اندیشہ تھا وہ میرے مستعد چوبی اثر سے اور شپالی کی وجہ سے دُور ہو گئی۔ اس کے بعد میرا یہ معمول ہو گیا کہ میں صبح سویرے روحوں کے غار میں چلا جاتا اور شام ہوتے واپس آتا۔ شام کو میں حسبِ معمول جارا کا کا کی مشترکہ عبادت میں شریک ہوتا۔ اب میں بظاہر اُن کی باتیں توجہ سے سنتا تھا اور بہت کم کلام کرتا تھا۔ عموماً خاموش رہا کرتا تھا۔ جب خاصے دن گزر گئے اور میں بظاہر انگروما کی زمین میں آہستہ آہستہ

پوجنے لگا۔ میں نے اعتراضات ترک کر دیے اور ایک بہترین سامع کی حیثیت سے سننا شروع کر دیا تو انگروما میں میرا احترام بڑھ گیا۔ اب یہ بھی ہونے لگا کہ گاہے گاہے انگروما کے چند ساحروں کی ٹولی انگروما کے جنگل میں روانہ ہوتی اور میرے ساتھ مشترکہ سحر پھونکتی ہم کسی نئے سحر کا تجربہ کرتے تو وہ خوش ہو کے میرے نزدیک ہو جاتے۔ قریب تھا کہ میں انگروما میں منقلب ہونے کا ایک رسمی اعلان کر دیتا کہ مجھے اچانک شوطار یاد آنے لگی۔ اب تک میں نے شوطار کو انگروما کی بستی میں نہیں دیکھا تھا اور فلورا کی آمد کے بعد اس کی طلب بھی نہیں کی تھی۔ میں اصل میں انگروما میں اپنی ذات کا حصار قائم کرنے میں ایسا منہمک تھا کہ مجھے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ فلورا کی آمد کے بعد اور اس کے اشاروں پر میں روز ایک قدم آگے بڑھ جاتا تھا۔ شوطار کی مسلسل روپوشی نے میرے شوق کو اکسایا۔ وہ میرے سامنے کیوں نہیں آتی اور انگروما کی عام نظروں سے اسے پوشیدہ کیوں رکھا گیا ہے؟ جب کہ انگروما میں ایک عمدہ معاشرہ قائم ہے اور ایک عام شخص کا بھی وہی احترام کیا جاتا ہے جو ایک عالم کا — میں نے سوچا مجھے شوطار کو طلب کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے گروہٹا نے مجھے اس کی پیش کش کی تھی۔ شوطار کا خیال آیا تو اسمار میں اس کی شان و شوکت، جاہ و جلال، حسن و جمال یاد آ گیا۔ وہ آقا بلا کے بعد سب سے یکتا تھی۔ شوطار اسمار میں میرے ہاتھوں اپنی اندوہناک شکست کے اندیشے سے انگروما آ گئی تھی۔ یہ منظر دیدنی ہوگا کہ اب وہ مجھے دیکھ کے کیا رویّہ اختیار کرے گی؟ اسمار میں اس کے ساتھ میں نے بہت دلکش وقت گزارا تھا۔ وہ اپنے

مولانا حالی

کے خاندانی مُلازم نانو خاں کے ساتھ بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ مٹی کا تیل نیا نیا چلا تھا۔ تیل کی کُپی ٹپکتی تھی۔ اس لیے ایک رکابی میں رکھی تھی۔ کسی نے کُپی اُٹھالی اور نانو خاں رکابی میں ٹپکے ہوئے تیل کو پگھلا ہُوا گھی سمجھے، جھٹ اُٹھایا اور پی گئے۔ بُو آئی تو پتہ چلا کہ گھی کے دھوکے میں مٹی کا تیل پی گئے ہیں۔ روتے دھوتے مولانا حالی کے پاس پہنچے اور بولے "بس میاں ہم تو مر گئے۔ پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔"

انھوں نے پوچھا تو سارا حال بتایا۔ مولانا بھی مٹی کے تیل کی خاصیت سے ناواقف تھے۔ چنانچہ بے حد گھبرائے۔ فوراً حکیم صاحب کو بلایا اور نانو خاں کی تیمارداری میں لگ گئے۔

اُس وقت مولانا حالی نواب لوہارو کے ہاں ایک دعوت میں مدعو تھے۔ دیر ہُوئی تو نواب صاحب کا آدمی بُلانے آیا۔ مولانا حالی نے انھیں معذرت لکھ بھیجی۔

"افسوس ہے، حاضر نہیں ہو سکتا۔ نانو خاں مٹی کا تیل پی گیا ہے۔ میں اس کی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔"

اس واقعے سے ظاہر ہے کہ مولانا حالی اپنے ملازموں کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔

(یادگارِ حالی)

بے مثال حسن کے علاوہ غیر معمولی طاقتوں کی حامل تھی۔ اُسے جاملوش کا تعاون حاصل تھا لیکن میں نے اُس باجبروت ملکہ کو اسمار کے تخت سے اکھاڑ دیا تھا۔ ممکن ہے، اب وہ ریماجن کے قریب ہو؟ شوطار کی ذہانت سے کوئی بات بعید نہیں تھی، وہ زیر ہونے والی عورت نہیں تھی۔

گرد وٹا میرے اچانک مطالبے پر کچھ پریشان سا ہوگیا مجھے فلورا کی طرح اُسے بھی طلب کرنا پڑے گا معزز گرد وٹا!" میں نے اس کی خاموشی پر ناراض ہو کے کہا۔

"نہیں۔" وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔ "مگر وہ بہت دور ہے۔"

"اب تم یہ کہو گے کہ وہ مقدس ریماجن کی تحویل میں ہے؟"

گرد وٹا نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "یہ بات نہیں ہے، البتہ اسے مقدس ریماجن کا خصوصی تعاون ضرور حاصل ہے۔"

"تو کیا اُس سے میری ملاقات ناممکن ہے؟ صاف صاف بات کرو۔"

"میں کوشش کروں گا معزز جابر بن یوسف کہ وہ جلد ہی تم سے ملاقات کرے۔ انگرو ما میں اس کا درجہ کچھ کم نہیں ہے اور اس عرصے میں اس نے مقدس ریماجن سے خصوصی تعلق پیدا کر لیا ہے کیونکہ وہ ایک ذہین اور عالم عورت ہے۔"

"اور حسین بھی۔" میں نے لقمہ دیا۔ "میں اس کا کب تک انتظار کروں؟"

"تم اب انگرو ماہی میں ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ اتنے دنوں میں تمہارے اندر خاص تبدیلی آئی ہے۔ کیا تم کہیں واپس جا رہے ہو جو تمہیں اتنی عجلت ہے؟"

"نہیں۔" میں کسی قدر مجبور ہو کے بولا۔ "اب تم لوری پر کب حملہ کر رہے ہو؟" میں نے موضوع بدل کے کہا۔

"بہت جلد۔" گرد وٹا عزم سے بولا۔ "ہماری نگاہیں تاریک برِ اعظم کے ہر گوشے پر لگی ہوئی ہیں۔ ہم انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔"

"فرض کرو اگر تم کامیاب ہو گئے تو تاریک برِ اعظم کی کیا حالت ہوگی؟"

"ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔" وہ پُرامید لہجے میں بولا۔ "اُس وقت سارا تاریک برِ اعظم ایک خوب صورت جنگل میں تبدیل ہو جائے گا۔ جہاں لوگ پرندوں کی طرح آزادانہ چہچہائیں گے۔"

"اور آفابلا کا کیا ہوگا؟"

"ہم اُس کا چہرہ مسخ کر دیں گے ویسے مقدس جاراکا کا ہی اُس کے لیے سزائیں تجویز کرے گا۔"

"کتنے دلکش خواب ہیں۔" میں نے زیرِ لب کہا۔ "میں جاراکاکا سے آفابلا کو حاصل کر لوں گا۔"

"ممکن ہے وہ تمہیں آفابلا بخش دے۔" گرد وٹا سرشاری سے بولا۔ "تمہارے اندر واقعی تبدیلی آگئی ہے۔"

"ہاں ۔۔۔ لیکن۔" میں نے بھیڑ بھیڑ کے کہا۔ "مجھے آفابلا سے اب تک کوئی بغض محسوس نہیں ہوتا البتہ میں جاملوش کے بارے میں تمہاری رائے سے متفق ہوتا جا رہا ہوں۔"

"معزز جابر۔" وہ میرا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے جوش میں بولا۔ "مجھے یقین ہے، مجھے یقین ہے، ایک دن تم آفابلا سے بھی نفرت کرنے لگو گے کیونکہ وہ بھی اسی قدر مکروہ ہے، وہ ظالم ہے، اس کا حسن فریب ہے۔ وہ اندر سے سیاہ ہے۔"

"وہ ظالم ہے تو اسے ظلم کی اجازت ہے کیونکہ اس کا حسن دنیا میں سب سے اعلا ہے۔"

گرد وٹا نے شوطار کے سلسلے میں تاخیر کر کے میرا شعلۂ تجسس اور بھڑکا دیا لیکن مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اسی رات جب میں فلورا سے گفتگو کر رہا تھا تو یکلخت اُٹھ بیٹھا۔ حجرے میں وہ خوشبو مہکنے لگی تھی جو شوطار سے مخصوص تھی۔ اسمار کی سابق ملکہ شوطار میرے حجرے میں پوری تمکنت سے جلوہ گر تھی۔ وہ مجھے چمکتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، جیسے کہہ رہی ہو۔ آخر تمہارا بھی وہی حشر ہوا نا جو میرا ہوا۔ تم بھی اسمار کے تخت سے دست بردار ہو گئے۔ وہ نہ میرا رہا، نہ تمہارا۔ مشعل کی روشنی اسمار کے حسن کے آگے ماند تھی۔ فلورا ٹکٹکی باندھے وہ حسین مجسّمہ دیکھ رہی تھی۔ "آؤ آؤ ملکۂ شوطار! معزز شوطار! میں اپنے اس حجرے میں تمہارا خیر مقدم کرتا ہوں۔"

"جابر بن یوسف!" وہ کرّوفر سے بولی۔ "تم نے مجھے کیوں طلب کیا ہے؟"

"تمہاری دید کے لیے آنکھیں سُلگ رہی تھیں۔ مجھے افسوس ہے، اسمار میں تمہارے ساتھ بدترین واقعات پیش آئے مگر تم جانتی ہو گی کہ میری حیثیت ایک غلام کی سی تھی۔ مجھے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا تھا لیکن میں تمہاری ذہانت اور حسن اب تک نہیں بھولا۔ تم نے اچھا کیا کہ اسمار میں ایک ذلت آمیز شکست سے بچ کے انگرو ما میں پناہ لے لی۔"

"میری شکست عارضی ہے۔" وہ طنطنے سے بولی۔ "میں ملکۂ آفابلا سے اس کا انتقام ضرور لوں گی۔"

"میں بھی ایک زمانے تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ وہ مجھ پر فریفتہ ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے لیے تمہیں تخت سے بے دخل کیا مگر وہ بڑی ظالم نکلی۔ اُس کے خوب صورت پاؤں کے چند بوسے ہی مجھے اپنی جدوجہد کے معاوضے کے طور پر مل سکے۔ پھر درمیان میں جاملوش آگیا اور وہ فضا میں تحلیل ہو گئی۔ میں تشنہ کام ہی رہا۔ پھر بھی جنگ ہوئی تو میں اس کی طرف سے باغیوں کے ساتھ لڑا۔ میرا خیال تھا کہ اس بار وہ مجھے اپنے قرب سے نوازے گی۔ وہاں بھی جاملوش موجود تھا۔ پھر میں انگرو ما آگیا۔ یہاں آکے بھی میں نے اسی کا چرچا کیا لیکن وہ سب ایک سراب تھا۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔"

شوطار کے چہرے پر کئی رنگ آکے گزر گئے۔ "تم ایک لسّان شخص ہو معزز جابر! تمہاری باتوں پر یقین نہیں آتا۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "تم سچ کہتی ہو تمہیں میرے بیان پر شبہ ہی کرنا چاہیے مگر اس وضاحت کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میں اپنی باتیں تم سے بزورِ طاقت بھی منوا سکتا ہوں۔ میں نے تمہیں یہاں طلب کر لیا ہے، تمہارے حسن کی شراب میرے سامنے ہے، میں تمہاری اجازت کے بغیر اُسے پی سکتا ہوں۔ تمہارا حسین جسم میرے ارادوں کا تابع ہے۔ تم سے اسمار کا فاتح بات کر رہا ہے جس نے اسمار کی عظیم عبادت گاہ میں مقدس جاراکاکا کے لیے ان گنت دوشیزاؤں کی قربانیاں



پیش کی ہیں میرے گلے میں تمہاری فضیلت کی سند موجود ہے۔" یہ باتیں میں نے کسی قدر تلخی سے کہیں پھر نرمی سے بولا۔ "مگر میرا یہ معذرت خواہانہ لہجہ کس بات کی دلالت کرتا ہے؟ کیا مجھے تمہارے سامنے اظہارِ ندامت کرنے کی ضرورت ہے؟"

شوطار کی صراحی دار گردن میں میری باتوں سے خم پیدا ہوا۔ فلورا چپ چاپ میری زبان کا گداز محسوس کر رہی تھی اور شوطار کے خیرہ کُن جمال میں کھوئی ہوئی تھی۔ شوطار کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھے اور اُس کے بدن سے جیسے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ "اب ہم سب ایک ہیں، انگرد ما میں نہ تم ملکہ ہو اور نہ میں اسمار کا فاتح، نہ میں آقا بلا کا فرستادہ ہوں، تم اس کا عکسِ جمیل ہو۔ میں جب تمھیں دیکھتا ہوں وہ یاد آجاتی ہے۔ تمھیں میری باتوں پر یقین کرنے کے لیے اور کون سی دلیل کی ضرورت ہے؟" میں نے اس کے مرمریں بازو پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"جابر بن یوسف! کیا تم ہمارے ساتھ ہو؟" وہ غیر یقینی انداز میں بولی۔

"تمھیں جارا کاکا کی قسم۔ کیا تم شبہ کرتی ہو؟" میں نے بے تابی سے کہا۔ "مجھے تمہاری باہوں کی ضرورت ہے۔ میں مدت سے کسی کے گداز کو ترس رہا ہوں۔"

"تمہارے پاس پہلے سے ایک خوب صورت عورت موجود ہے۔"

"میں نے تمہارے لبوں سے رس نچوڑا ہے اور اسی ذائقے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔" میں نے فلورا کا خیال کیے بغیر کہا۔ "تمہارے حسنِ جہاں تاب کے سامنے یہ عورت کیا درجہ رکھتی ہے؟"

میں نے فلورا کی طرف دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس پر میرے ان دل آزار جملوں کا کیا اثر ہوا؟ "وہ ایک حسین عورت ہے۔" شوطار فلورا کی طرف دیکھ کے ایک ادا سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"کوئی شبہ نہیں لیکن تمہارے اندر ایک باطنی حسن بھی تو ہے۔ تمہاری باتیں شیریں، انداز تمکنت کا، زلفیں معطر۔ تمہارا بدن اپنی طرف کھینچنے کی طلسمی قوت رکھتا ہے۔ تم ایک سحر ہو۔ میں اسی کا اسیر ہو گیا ہوں۔"

"آؤ—" ایک اندازِ دل رُبائی سے اس نے کہا۔

وارفتگی سے اس نے اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دیے۔ "میرے ساتھ چلو۔"

میں خود بھی فلورا کی موجودگی میں گریزاں تھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس کی نگاہوں میں حسرت تھی اور لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ۔ اُس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے مجھے الوداع کہا۔



شوطار انگرد ما کی بستی سے خاصی دُور ایک نیم پختہ مکان میں قیام پزیر تھی۔ یہ مکان اِرد گرد سے اُونچے اور گھنے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا چشمہ جاری تھا۔ شوطار یہاں بھی کسی ملکہ کی طرح رہتی تھی۔ سیاہ فام کنیزیں اس کی خدمت گزاری کے لیے مامور تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شوطار کا کام یہاں شب و روز جارا کاکا کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ جارا کاکا کی بے شمار مورتیاں ہر کمرے میں اہتمام سے رکھی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے گئی جو ان سب میں نسبتاً بہتر تھا۔ شوطار کی رفیع الشان ملکہ کا یہ حال میرے سبب ہوا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں انگرد ما

میں اتنے دن اس کی حسین صحبت سے دُور رہا۔ جیسے ہی وہ پتھر کی ایک چوکی پر بیٹھی میں نے ایک ملکہ کی طرح اُسے تعظیم دی اور اس نے ایک پسندیدہ، بہادر اور ذہین شخص کی طرح مجھ سے تپاک کا سلوک کیا۔ وہ کچھ تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے خود کو سر بسر تشنہ شخص قرار دیا۔ اس وقت وہ اسمار کی کوئی برتر عورت تھی اور میں اسمار کا کوئی کم تر مرد۔

وہ میرے قریب بیٹھی تو کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بدن کی لطافت نے مجھے مسحور کر دیا۔ میں نے اپنے بازو اس طرح وا کر دیے جیسے میں ایک سمندر ہوں، وہ میری اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جائے، جیسے میں ایک مقناطیس ہوں، وہ میرے اندر پیوست ہو جائے۔ میں ایک خشک زمین ہوں جو اس کے ابرِ کرم کے لیے ترس رہی ہے۔ میں ایک آگ ہوں جس پر قابو نہ پایا گیا تو وہ گرد و پیش جلا دے گی۔ ایک تو شوطار کا حسن، توبہ شکن حسن، اُس کا سراپا، رنگ و نور کا پیکر۔ دوسرے میں نے یہ ساری حالت اپنے اُوپر طاری کرنے کی دانستہ کوشش بھی کی۔ میں نے شراب پی اور یہ یقین بھی کیا کہ میں نے شراب پی ہے۔ میں نے خود کو اس کے حسن کی بے پناہ ترغیب دی، نتیجتہً میرے شوق کا کوئی عالم نہ رہا۔ پھر سب کچھ میرا ہو گا۔ میں نے اُس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے سحر آگیں لب میری ملکیت میں آ گئے۔ اس کے مرمریں بازوؤں پر مجھے تصرف حاصل ہو گیا۔ اس کے دہکتے رخسار پر میری وحشتوں نے نقش ثبت کیے اور اس کا بدن، آہ وہ ایک ترشا ہوا درخت جو پھولوں سے لدا ہوا ہو، وہ ایک ساز جسے جہاں سے چھیڑو، دل میں اُتر جائے۔ اس کا بدن۔ ایک خوش رنگ زمین جہاں کی فضاؤں میں عطر بسا ہوا، جہاں سبز لوچ بہار پھیلے ہوئے ہوں اور میٹھے پانیوں کے چشمے اُبل رہے ہوں۔ اس کا بدن ایک جیتی جاگتی جنت۔— وہ میرے اندر سما گئی کیونکہ میں اُس کے بدن کے فن کا سچا پرستار تھا۔ وہ میرے پہلو میں گم ہو گئی۔ میری پزیرائی کے لیے اُس کے عالی شان جسم کا ہر گوشہ مستعد ہو گیا۔

صبح دم اسمار کی ملکہ شوطار اور میرے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں تھی۔ ہم نے تازہ مشروبات پی کے ہلکے پانی سے اپنے جسم تازہ کیے اور درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گئے۔ شوطار کو میری قلبِ ماہیت کا مکمل یقین ہو چکا تھا چنانچہ اس نے آقا بلا کے خلاف زہر اُگلنا شروع کیا۔ میں ایک طالبِ علم کی طرح اُس سے پیچیدہ سوالات کرتا رہا۔ وہ صدیوں تک انتظار کر سکتی تھی۔ اُس نے مشروبِ حیات پیا تھا۔ اس نے ریاجن کا ذکر بڑے احترام سے کیا۔ وہ انگرد ما کی اُبھرتی ہوئی سرکش طاقتوں سے بڑی مطمئن تھی۔ اس گفتگو کے بعد میں نے چند نجی سوال کر ڈالے کہ کہیں تاریک برِ اعظم پر قبضے کے بعد انگرد ما کے موجودہ حاکم بدل نہ جائیں اور وہی صورت نہ پیدا ہو جائے جو اب سلطنتِ آقا بلا میں ہے۔ وہ میرا اندیشہ ایک پختہ کار سیاست داں کی طرح رَد کرتی رہی۔ میں ایک نو آموز شخص کی طرح اس کے درس دل میں اُتارتا رہا۔ پھر میں نے اپنی خود غرضی کا دانستہ اظہار کرنے کے لیے ایک سوال کیا کہ آقا بلا کے زوال کے بعد میرے ساتھ اس کا رویّہ کیا ہو گا؟ وہ تو پھر بھی کسی بڑے منصب ہی پر فائز کی جائے گی مگر کوئی اُسے مجھ سے چھین تو نہیں لے گا؟ اس نے اپنے مخصوص شاہانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے تم پسند ہو۔ تم جری، ذہین اور سرکش ہو۔ تم ایک ضدی بچے ہو۔" وہ مسکرا کے بولی۔

"اب میں کیا کروں؟" میں نے ایک ضدی بچے کی طرح پوچھا۔

"تم" — وہ انتہا سے بولی "تم کیا نہیں کر سکتے؟ کیا تم اسی طرح عورتوں کی آغوش میں بیٹھے رہو گے؟ اور جو کچھ تم نے حاصل کیا ہے اسی پر قناعت کرو گے؟ تم جارا کاکا کی مہربانی سے مطمئن ہو گئے ہو؟ تمہیں کچھ اور نہیں کرنا ہے؟ ہمارا مقابلہ جاملوش جیسے بڑے ساحر آفابلا جیسی طاقت و رعونت اور بے شمار ساحروں سے ہے۔"

"انگروما کی بستی کے عالم مجھے بالکل متاثر نہیں کرتے۔ وہ تو بڑے کم علم اور کمزور ہیں۔" میں نے منہ بنا کے کہا۔

وہ حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ لوگ تو بونے ہیں۔"

"کیا تم صرف بستی ہی میں رہے ہو؟ تم نے انگروما کے ممنوعہ علاقے نہیں دیکھے؟" وہ میری جہالت پر افسوس کر رہی تھی۔

"انھیں مجھ پر یقین نہیں تھا کہ میں ان کا حامی ہوں۔"

"اوہ—" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ "انھوں نے ایک اہم شخص کو کیسے نظر انداز کیا؟" پھر وہ میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میں نے اب ان کا شک دور کر دیا ہے۔ مجھے بتاؤ شوطار کہ میں ان کے کیا کام آسکتا ہوں؟ مجھے چند باتوں کی تفصیل درکار ہے۔"

وہ میرے استفسار پر ریماجن کے تقدس اور انگروما میں اس کے پر اسرار علاقے کے متعلق تفصیل سے بتانے لگی، میں پوری توجہ سے سنتا رہا، جیسے جیسے پیچ میرے سامنے وا ہوتے گئے، میرا جوش بڑھتا گیا۔ مجھے اپنے سامنے ایک تابناک دنیا نظر آنے لگی۔ شوطار نے سب اسرار سے پردہ اٹھا دیا تھا اور میں آسانی سے قیاس آرائیاں کر سکتا تھا۔ اب تک انگروما کے طور طریق دیکھ کے میری حالت تذبذب کی تھی۔ شوطار نے میری یہ کیفیت دور کر دی۔ میں نے واپس بستی میں جانے کا ارادہ موقوف کیا، فلورا میرا انتظار ایک صدی تک کر سکتی ہے اور اسے اب کوئی پریشان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی طرف سے مجھے اطمینان تھا۔ میں شوطار کے مکان میں ایک رات اور ٹھہرا اور اس رات مجھے ریماجن سے اس کے خصوصی ربط و ضبط کا اندازہ بھی ہوا۔ جب میں وہاں سے چلا تو مجھے شوطار کا اعتماد حاصل تھا۔ جاملوش سے میں پوری طرح بدظن ہو چکا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے شوطار کو متاثر کیا یا شوطار نے مجھے؟ اس وقت مجھے سرنگا کا چہرہ بار بار یاد آرہا تھا۔

*

میں نے آبادی کا راستہ چھوڑ دیا اور چلتا رہا، چلتا رہا۔ انگروما کے دور دراز فاصلے میرے ارادوں سے مسخر ہوتے رہے۔ مجھے ریماجن کا علاقہ نظر نہیں آیا۔ یہی حال جاملوش کا علاقہ تلاش کرنے میں ہوا تھا۔ راستے میں زاہدوں اور عابدوں کے کئی قافلوں سے میرا سامنا ہوا۔ میں ان سب کو نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا تا آں کہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا، جہاں انگروما کے برگزیدہ بوڑھے ایک خوف ناک اور تاریک غار میں سر جوڑے محو ریاضت تھے۔ اس غار کے قریب میرے قدم رک گئے تھے۔ میں بے دریغ اندر داخل ہو گیا اور ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ اپنے حلقے میں میری اس شمولیت سے بے خبر تھے۔ ان میں کئی کا گوشت ہڈیوں سے اپنا رشتہ منقطع کر کے جھولنے لگا تھا۔ ان کے درمیان دو چھوٹے مجسمے رکھے ہوئے تھے، مسخ شکل میں۔ میں نے انھیں پہچاننے کی کوشش کی، ان میں سے ایک جاملوش کا مجسمہ تھا اور ایک آفابلا کا۔ نیچے زمین سے دھواں اٹھ رہا تھا اور مجسمے دھوئیں سے کالے ہو گئے تھے۔ ان سب کے گلوں میں جارا کاکا کی کھوپڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ غار میں سورج کے طلوع و غروب کی خبر کسی کو نہ تھی۔ سب غرق تھے۔ جیسے وہ کسی کرشمے کے منتظر ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں کسی غلط جگہ تو نہیں آگیا ہوں؟ میں نے وہاں ایک جسارت کی کہ جاملوش کا مجسمہ اٹھا لیا۔ وہ بہت بھاری تھا۔ اتنا بھاری کہ میرے ہاتھ لرزنے لگے۔ وہ میرے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچا۔ حلقے میں بیٹھے ہوئے ساحر اضطراب سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے اپنی تمام طاقت صرف کی لیکن مجسمہ توڑنے میں ناکام رہا— تمام ساحر اسے میرے ہاتھ سے چھیننا چاہتے تھے۔ میں قہر کی تصویر بنا اس چھوٹے سے مجسمے سے جنگ کر رہا تھا۔ اس کے دھوئیں کی کالک سے میرے ہاتھ سیاہ ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا اسے زمین پر پھینک کے ریزہ ریزہ کر دوں—

تمام عابد مجھ پر جھپٹنے لگے— ان کی آنکھوں میں میرے لیے شدید نفرت تھی لیکن وہ سب اچانک مضطرب ہو گئے۔ اسی وقت مجھے ایک سایہ اپنے سر پر نظر آیا اور کسی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں نے چہار اطراف دیکھا۔ وہ سرنگا کی دیوی تھی— مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہو: "تم ٹھیک جگہ آگئے ہو۔"

سن رسیدہ بوڑھے آنکھیں پھاڑ کے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ میں نے مجسمہ اور مضبوطی سے تھام لیا۔



تاریک برِاعظم کا انسو — عرب نوجوان جابر بن یوسف الباقر کی حیرت انگیز سرگزشت کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے

اِس ماہ کی خاص کہانی — اردو کے منفرد افسانہ نگار سید رفیق حسین کے قلم سے

بستیوں میں رہنے والے ملبوس اور جنگلوں میں رہنے والے بے لباس جانور ہی سید رفیق حسین کا موضوع رہے ہیں

زخمی ہاتھی

دن ڈھلتے ہی جنگل کے جانور بیدار ہو کر اپنی اپنی پوشیدہ نشست گاہوں سے نکلنے لگے اور مالا کا وہ جنگل آباد ہو گیا جو دن بھر چوپایوں سے خالی نظر آتا تھا۔ گو چڑیوں کے بسیرا لینے سے خاموشی ضرور چھا گئی لیکن سُنسان سال بنی میں اب جابجا حرکت کرتے ہوئے چوپائے نظر آنے لگے۔ چونکہ دن کی ہلکی ہلکی روشنی اب بھی موجود تھی اور جنگل کے واسطے ابھی بہت سویرا ہی تھا اس لیے سُور، چیتل اور نیل گائے ایسے ہی پنج ذات جانوروں کی صورتیں فی الحال نظر آ رہی تھیں جو پوری طرح رات نہ ہونے کی وجہ سے قدرے بے خوف اِدھر اُدھر خوراک کی جستجو میں جا رہے تھے۔ اس امن اور خاموشی کے عالم میں ایک بھاری مست اکرّ سُور کبھی کبھی اپنی بدطبیعتی کی وجہ سے تھو تھو، خوک خوک، تھو تھو۔ خوک خوک کر کسی پاس آنے والے جانور پر دوڑ پڑتا تھا اور اس کا دُور تک پیچھا کرنے کے بعد پھر واپس آ کر بھاری تھوتھنی سے موسل کی جڑیں کھودنے میں لگ جاتا تھا۔ سال بنی کے مشرق کی طرف گھنے سال اور نیچے گھنی جھاڑیوں نے بالکل ہی اندھیرا کر رکھا تھا۔ مغرب کی طرف ڈوبتے ہوئے سورج کی ہلکی ہلکی روشنی اس لیے اب بھی



قارئین! اگر کسی بڑے نے کوئی رائے دی ہو تو بہتر ہے پہلے اُسے پیش کر دیا جائے۔ سیّد رفیق حسین کے بارے میں ہمارے بزرگ جناب شاہد احمد دہلوی کی رائے کیا ہے؟ پہلے آپ اِسے پڑھ لیجیے:

"کوئی چار سال کی بات ہے۔ ایک دِن ساقی کی ڈاک میں ایک مسوّدہ آیا جسے دیکھ کر ہی وحشت ہونے لگی، یہ مسوّدہ کھلا کھلا اور بڑے ہی بے ڈھنگے خط میں لکھا ہُوا تھا۔ مضمون نگار کا نام دیکھا تو وہ بھی پہلے کبھی نہیں سُنا تھا۔ خیر طبیعت پر جبر کر کے اُسے پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے مضمون پڑھتا جاتا تھا جبر و اِکراہ رُخصت ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب مضمون ختم ہُوا تو میں حیران تھا کہ یہ کیسا جواہر پارہ اِس بد نما پلندے کی صُورت میں میرے ہاتھ لگا! اگر میں دل کا کہنا مان لیتا تو ایک جوہرِ قابِل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رُوپوش ہو جاتا کیونکہ یہ لکھنے والے کا پہلا افسانہ تھا جو بہت جھجکتے جھجکتے "ساقی" کے لیے بھیجا گیا تھا اور اِس تاکید کے ساتھ کہ اگر پسند نہ آئے تو مسوّدہ ضائع کر دیا جائے۔ یہ افسانہ تھا "کفّارہ" اور لکھنے والے کا نام تھا سیّد رفیق حسین۔ افسانہ چھپا، اِشتیاق سے پڑھا گیا اور آیندہ کے لیے ناظرین کو مشتاق بنا گیا اور پھر "کلوا" اور "بیرُو" شائع ہونے پر تو رفیق حسین نے گویا جھنڈے ہی گاڑ دیے۔

اِن کے افسانوں میں جانوروں کی نفسیات کے علاوہ جو بجائے خود ہر افسانے کی ایک نادِر خوبی ہے۔ ایک اور خوبی بھی ہے۔

اِنسانی سرشت کی تحلیل کہانی کے پیرائے میں اور یہ دونوں خوبیاں رفیق حسین کے ہر افسانے میں آپ کو متوازی نظر آئیں گی لیکن اِس ہنرمندی اور سلیقے کے ساتھ کہ کہیں بھی یہ دو رنگی افسانے کی وحدتِ تاثّر میں فرق نہیں آنے دیتی بلکہ یہ تقابلی مطالعہ ہی رفیق حسین کی وہ خصوصیت ہے جو انہیں فن کاروں سے اُٹھا کر حسن کاروں میں جگہ دیتی ہے۔"

شاہد احمد دہلوی — دہلی ۵ مارچ ۱۹۴۴ء

شاہد بھائی کی رائے کے بعد مزید کچھ کہنا بے ادبی ہو گی۔ سیّد رفیق حسین آپ کے لیے کوئی نئے ادیب نہیں ہیں۔ اُن کی ایک خوبصورت کہانی آپ سب رنگ میں پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ — مدیر



موجود تھی کہ اُدھر ہی پاس لگا ہوا سال بنی کا کنارہ تھا۔ جس کے اختتام پر بیلوں کے جالوں سے ملے ہوئے کٹھر رُوکھ کی اونچی اور کانٹے دار جھاڑیوں کے نیچے درختوں کی تھوڑی سی چوڑائی کے بعد مالا ندی کا چوڑا پاٹ اپنی کیچڑ، ٹولدل اور چھچلے پانی کو ہاتھی چھپواں گھاس میں چھپائے ہوئے ساکت اور بھورا پھیلا ہوا تھا۔ ندی کے اس پاٹ میں بلکہ اس اُونچی گھاس کے سمندر میں جا بجا انتہائی گھنے چھوٹے چھوٹے جنگل کے ٹاپو بھوری گھاس سے نکلے ہوئے دُھندلے پڑ رہے تھے۔

بنڈیلے کو مالا کی گھاس کی طرف سے کچھ آہٹ معلوم ہوئی۔ زمین میں گھُسی ہوئی بھاری تھوتنی وہیں مٹی میں دھنسی کی دھنسی رہ گئی۔ کانوں نے آہستہ آہستہ جنبش جاری رکھی۔ آواز پھر بند ہو گئی تھی۔ کچھ دیر اسی حالت میں انتظار کرنے کے بعد ناک دوبارہ مٹی میں جھٹکے سے دھنسائی ہی تھی کہ گھس گھس۔ کھساک آواز آئی۔ بنڈیلا جڑ کھودتے میں رُکا اور پھر سر گھمائے بغیر بدن کے ایک ہی جھٹکے میں پوری جان سے گھوم گیا۔ مالا کی طرف رُخ کر کے پتلی دُم کی جلیبی بنا کے ساکت کھڑا ہو گیا۔ چند جانوروں کی اُونچی اور سُوکھی گھاس میں سے نکلنے کی آواز برابر آ رہی تھی۔ نگاہ کے کمزور سُور نے سرسراہٹ کی آواز ہی سے آنے والے جانوروں کو تھوڑی سی غلطی کے ساتھ پہچان لیا۔ وہ سمجھا کہ پھر کوئی بدتمیز نیلا مع اپنی گایوں کے واپس آ رہا ہے۔ اُس روز کئی نیل گائے اسے ستا چکے تھے۔ دو دو قدم اور دو دو قدم رُکتا ہوا چمکتی ہوئی سفید بل کھائی ہوئی کھاپوں سے مرصّع تھوتنی کو جھٹکے دیتا ہوا چلا۔ سامنے بل پر بل کھائے ہوئے جنگلی بیلوں کے موٹے ننگے تنے رسّوں کی طرح جھولوں کی صورت سے لٹکے ہوتے، اونچے درختوں سے جھاڑیوں پر اور جھاڑیوں سے درختوں پر پھیلے ہوئے جال سا بنائے ہوئے تھے اور وہیں ایک جھاڑی کے برابر لٹکی ہوئی بیل کے نیچے مالا کی ترائیوں، دلدلوں اور مالا کی ہاتھی چھپواں گھاسوں کا اصل باشندہ ازبردست گوند موٹے شاخ دار سینگوں کی پرچھائیاں بلند کیے پیچھے رُکتی ہٹکتی آنے والی مادیوں کے انتظار میں کھڑا تھا۔

کم عمر نر، بچھڑے اور مادینیں ایک ایک کر کے اونچی گھاس میں بنی ہوئی پتلی پگڈنڈی میں سے نکل کر، چوکنّی چاروں طرف دیکھتی، رُکتی، اپنے بچوں کو ساتھ لیتی بڑھ رہی تھیں اور ایک ایک دو دو کر کے نر کے پیچھے جمع ہو رہی تھیں۔ نر گوند، جنگل کا سب سے بڑا چوپایہ۔ اپنے جُثّے اور اپنی طاقت

پر مغرور گوند۔ نتھنے پھُلائے، کانوں کی کٹوریاں آگے گھمائے، دُم کی تھاپی تیزی سے ہلاتا، جھُنجلایا ہوا کھڑا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون گستاخ اور بدتمیز راستے میں ہے؟ سامنے سال بنی میں نیچے نیچے پودے اور جھاڑیاں اور گھاس تھی لیکن کوتاہ قد سُوران میں پنہاں نہ تو خود نظر آتا تھا اور نہ اپنی کمزور بینائی کی وجہ سے خود گوند کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ اب بھی نیل گائے سمجھے ہوئے آگے بڑھتا رہا اور مادینوں کی چاپ کے جب قریب آگیا تو "تھو تھو خوک، تھو تھو خوک" کی جھڑکیاں آمیز آواز نکالتا ہوا لپکا اور چھوٹی جھاڑیاں اور گھاس سٹرسٹراتا پھڑپھڑاتا نکلا۔ گوند سے پندرہ گز کے فاصلے پر ہوگا کہ دفعتہً اس نے اپنی غلطی محسوس کرلی۔ سامنے زبردست گوند سینگوں کی چمکتی ہوئی سفید نوکیں برچھیوں کی طرح تانے بے خوف کھڑا اُسے حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ نیلے اور جھانک ڈرا دھمکا کر بھگائے جاسکتے تھے لیکن گوند؟ گوند؟ توبہ۔ توبہ! بڑھتا ہوا سور کھٹ سے رُکا۔ سٹ سے پورا جسم گھما اور نوک دُم تھو تھو۔ تھو تھو کرتا ہوا بھاگا اور بھاگتا ہی چلا گیا۔

مغرور گوند اکڑتا ہوا خاموش آگے آگے راستے سے آگاہی کرتا ہوا بڑھا اور اس کے پیچھے نوعمر بچھڑے اور نازک تندرست چکنی مادینیں بیٹھے اور شانیں پھڑکاتی، پیر جھٹکتی، گردنیں لچکاتی، پھڑکتی، ٹھٹکتی، کودتی، اُچکتی آپس میں چہُلیں کرتی بڑھیں اور اس طرح مالا کے گوندوں کی ڈاروں میں سے ایک ڈار سال بنی میں چلی جس کے سامنے پڑجانے والے چیتل، پاڑے سُور اور نیل گائے از خود راستہ چھوڑنے لگے۔ گوندوں کی ڈار نے زبردست نر کی حفاظت میں آہستہ آہستہ اطمینان کے ساتھ سال بنی کے مشرق کی طرف بڑھنا شروع ... ڈیڑھ میل کی چوڑائی پار کرکے موٹر روڈ کے قریب جنگل میں چھُپی ہوئی ایک نمکیاری پر پہنچ کر بچے، بچھڑے، بچھڑیاں اور مائیں گڈھا چاروں طرف سے گھیر کے گردنیں نیچی کرکے وہاں کی نمکین مٹی چاٹ چاٹ کر سب مزے لینے لگے۔ بڑے نر نے کچھ دیر علیحدہ ہی کھڑے رہ کر جنگل میں چاروں طرف پھر نظر دوڑائی اور جب ہر طرف سے اطمینان ہوگیا تو آہستہ سے بڑھ کر جھُکی ہوئی مادینوں کے پیچھے ہی سے مٹی چاٹنے کو گردن بڑھائی تھی کہ سال بنی کے مالا کی طرف کے حصے سے دبی ہوئی آواز آئی "پُرّ رررر، پھُر، پُرّ رررر"۔ گوند نے اور اس کے ساتھ ساری ڈار نے گھبرا کر اُس طرف دیکھا۔ اندھیری رات اور پھر اندھیرا گھنا جنگل، جانوروں کے لیے سُہانی روشنی سے پُر تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک سیاہ پہاڑ ایسا ہاتھی دو سفید دانت ان کی طرف کیے، سونڈ لمبی پھیلائے انھیں اپنی آمد کی اطلاع دے رہا تھا۔

آدھے منٹ تک ہر گوند پتھر کی مورتی کی طرح ساکت کھڑا بغیر پلک جھپکائے اس سیاہ پہاڑ کو دیکھتا رہا۔ پھر یک بارگی سب کے سب چونکے اور بے ترتیبی سے بھاگ پڑے، بھاگتی ہوئی مادینوں نے ایک قطار بنا کے نر کو اس کے بیچ میں لے لیا۔

امن اور سکون کی حالت میں نر آگے آگے اُن کے واسطے راستے کے خطرات سے آگاہی کرتا چلتا تھا لیکن راستہ دیکھے بغیر اور راستے کے حالات معلوم کیے بغیر بے تحاشا بھاگنے کی حالت میں نسل کا سلسلہ قائم رکھنے والے نر کے بجائے مادینیں خود اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر نر کو بیچ میں لے کر بچالے جانے کے لیے بھاگ پڑیں۔ یہی جنگل کے تمام چوپایوں کا اصول ہے البتہ انھوں نے اتنا ضرور کیا کہ پاس لگی موٹر روڈ پر پہنچ کر چلتی ہوئی ہوا کے مخالف جنوب مشرق کی طرف اپنا رُخ کرلیا تاکہ اگر سامنے گھنے بلّی کے جنگل میں کوئی دشمن ہو تو اس کی بُو انھیں آجائے۔

اور جب گوند بھاگ گئے تو نر ہاتھی نے ہلکی سی پیپ پرررررر پالپو کی آواز نکال کر پیچھے پیچھے آنے والے غولوں کو راستہ محفوظ ہونے کی اطلاع دی۔ جس کے تھوڑی ہی دیر بعد سیاہ تودے پنکھے ایسے کان اور اژدہے ایسی سونڈیں ہلاتے جابجا درختوں کے تنوں سے کتراتے ہوئے نکلنا شروع ہوئے۔ ان میں نر، مادینیں اور بچے سبھی تھے۔ ہلتے جھُلتے پہاڑ چڑپڑ، کھڑبڑ ڈالیاں توڑتے، جھاڑیاں توپتے، سونڈوں میں ڈالیاں گھماتے، ستون ایسے پیر ہلاتے بڑھتے چلے آئے اور موٹر روڈ پار کرکے دوسری طرف کے بلّی کے جنگل میں گھس کر اس کے بیچ میں چھُپی ہوئی پٹیلا جھیل کی طرف بلیاں توڑتے، درخت چرچراتے، خوش ذائقہ پٹیلا کھانے کے لیے بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ تر پٹیلے کی بُو انھیں آنے لگی۔ ان میں سے ایک اسکاؤٹ نے آگے بڑھ کر گھنے ساکھو میں سے سر نکال سبز لہلہاتے پٹیلے کا تختہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا، پھر سونڈ کی اُٹھی ہوئی نوک چاروں طرف گھما کر بولی کانوں کے پنکھے ہر ہر طرف گردش دے کر آوازوں کا پتہ چلایا اور جب ہر طرح اطمینان ہوگیا تو اپنا غول بڑھانے کے لیے ہلکے سے بگل میں اطلاع دی۔ پیپ پرررررر پالپو۔ ساتھ ہی عاؤں وا آوا داعال خوں۔ شیر کے ڈانٹنے کی کرخت آواز آئی۔ زمین ہل گئی، جھاڑیاں لرزیں، درخت تھرّائے، ہاتھی بُری طرح گھنے پٹیلے بلّی کے جنگل توڑتے کچلتے واپس بھاگے۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ پچھلی رات کا چاند نمودار ہوکر اُداس ٹپکاتے گھنے ساکھو کے سُتواں سیدھے درختوں سے جھانکتا ہوا اپنی زائل ہوتی ہوئی ہلکی روشنی چھچلی خشک جھیل میں اُگے ہوئے نیچے گھنے پٹیلے پر ڈال رہا تھا اور اونچے، گھنے، ساکت، خاموش سیاہ جنگل سے چاروں طرف گھرے قدرے روشن پٹیلے کے ایک کنارے جنگل کی ٹیٹری بانس ڈیڑھ بانس اونچی پھُرپھُراتی ہوئی بول رہی تھی "ٹٹ ٹیٹ ٹیٹی ٹیٹی۔ ٹٹ ٹیٹ۔ ٹیٹی ٹیٹی، ٹیٹی"۔ لیکن جوں ہی شیرنی نامعقول ہاتھیوں کو ڈانٹ بتا کر اونچے درختوں میں سے نکلی، ٹیٹری "ٹٹ ٹیٹ ٹیٹی، ٹیٹی، ٹیٹی" کی آخری چیخ بھرتی ہوئی پھیلے پٹڑے کے شمال کی طرف نیچی نیچی اُڑتی چلی گئی اور وہیں غائب ہوگئی۔ دس فٹ لمبی دھاریوں دار شیرنی، خود لچکتی، دُم لچکاتی پٹڑے میں کچھ دور گئی اور پھر رُک گئی۔

کوپن ہیگن میں

مسلم کمرشل بینک

۶۔ وسٹر فریماگس گیڈ ۔ ۱۶۰۶ کوپن ہیگن

at 6, Vester Farimagsgadc, 1606 Copenhagen



کوپن ہیگن میں مسلم کمرشل بینک کے دفتر کے افتتاح کیساتھ یورپ میں ہمارے دفاتر کی تعداد دس تک پہنچ گئی ہے۔

یہ یورپ، مشرق وسطیٰ اور خلیج کی ریاستوں میں مقیم پاکستانیوں کی خدمت کے لئے ہماری بین الاقوامی توسیع کے منصوبے کا ایک حصہ ہے۔

خدمت میں پیش پیش

مسلم کمرشل بینک



MCB-16-74-UD.

Ravi-Delmon Ltd.

وہاں سامنے جنگل سے سوا سو گز کے قریب، دُور تک پھیلے ہوئے پیڑ سے میں شیرنی کے لیے عجیب مسرت انگیز نظارہ تھا۔ شیرنی کے دو نوعمر بچّے گوند کی ایک اُدھ مری کی ہوئی مادہ پر چپٹے ہوئے تھے۔ ایک گری ہوئی مادہ کی پیٹھ کے پاس کھڑا ہوا اپنے دونوں اگلے پنجے اس کی کمر پر جمائے، برابر اٹھنے کی کوشاں گوند کو پھر گرا گرا دیتا تھا اور دوسرا موٹی گردن چھوٹے جبڑوں میں دبائے اپنی پوری طاقت سے اسی طرح جھٹکے دے رہا تھا جس طرح پورا شیر دو ہی جھٹکے دے کر گردن کی گرّسی گرّسی الگ کر دیتا ہے۔ شیرنی نے پہلے ہی سے اپنے بچّوں کو شکار کی تعلیم دینے کے لیے گوند کی گردن توڑ کے اسے ادھ مرا سا کر دیا تھا۔ اس کا سر گردن پر جھول رہا تھا لیکن پھر ذبح کیے ہوئے مرغے کی طرح ڈگمگاتا سر اُٹھا کے وہ اُٹھ بھاگنے کے لیے کوشاں تھی۔ جیسے ہی پیٹھ پکڑے پکڑے گرانے والا بچّہ اُدھر سے کچھ ہٹ پیٹھے پر منہ مارنے میں مشغول ہوا السمل گوند نے پھر زور کیا۔ چاروں ہاتھ پیروں پر بیٹھ گئی۔ جو بچّہ گردن میں چپکا تھا وہ گردن میں لٹکنے لگا۔ گرفت چھوٹ گئی جھٹ چار گز پیچھے ہٹ کے داؤ لگا یا جست کے لیے دبک کے گوند کے بھاگنے کا منتظر ہو گیا پیٹھے پر کے بچّے نے اگلے پنجے کے ناخنوں اور دانتوں کے کیلے وہیں گھسا دیے تھے۔ جیسے ہی گوند ڈگمگاتی ہوئی کھڑی ہوئی اس نے پچھلے پیروں کے پنجے بھی اونچے کر کے ران پر جما لیے اور چھپکلی کی طرح چمٹ گیا بچّہ گو تازی کتّے کے برابر تھا لیکن گائے کے قد کی گوند کے لیے اس کا وزن کیا چیز تھا۔ موت کے آخری جھٹکے، بھڑکے ہوئے گرم خون کا جوش۔

بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

خون میں لت پت، نتھنوں سے دھاریں چلتی ہوئی، دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گرتا ہوا سر اٹھی ہوئی گردن پر۔ گوند دو نہایت مخدوش دولتیاں چلا کر دُلکی بھاگی۔

تماشا دیکھتی ہوئی شیرنی نے فوراً جہاں کھڑی تھی، وہیں کے وہیں بدن سکیڑ کے سینہ اور پیٹ زمین سے ملا کے چاہا کہ گوند پر جست کرے لیکن دوسرا بچّہ بجلی کی طرح ہوا میں معلّق نمودار ہوا۔ اس کی دُم اور پیر پیچھے پھیلے ہوئے تھے۔ اگلے ہاتھ گردن کے متوازی آگے پھیلے ہوئے تھے وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح بھاگتی ہوئی گوند کی کمر پر گرا۔ دھماکے کی آواز آئی گوند پھر زمین پر دراز ہاتھ پیر چلا رہی تھی اور دونوں بچّے پھر پچھلے پیروں کی زد سے بچے، اس پر چپٹے ہوئے تھے۔ شیرنی نے اطمینان کا سانس لیا۔ سیدھی کھڑی ہوئی اور انتہائی غرور کے ساتھ آہستہ آہستہ بچّوں کی طرف بڑھنے لگی۔

لیکن جنگل سے چاروں طرف گھرے ہوئے ٹیلے کے مغرب سے چلتی ہوئی ہوا میں بُو آئی اور پھر آہٹ ہوئی۔ قدم بڑھاتی ہوئی شیرنی اُٹھا ہوا اگلا پیر اُٹھائے ویسے ہی رُک گئی۔ نہ خود گھومی نہ سر گھمایا۔ ویسے ہی خاموش کھڑی رہی۔

ہلکی ہوا میں مُشکِ ہند کی بُو تھی۔ بھاری پیروں کے پھساکوں کی آواز تھی۔ پھر گستاخ بدتمیز ہاتھی اس طرف کی جرأت کر رہے تھے۔ ملکۂ دشت برہم ہوئی۔ آنکھوں میں بجلیاں، پنجوں میں خنجر ہائے خم دار نمودار ہوئے۔ گھومی ہوئی دُم سیدھی پھیل گئی۔ خون خوار دہانہ زمین سے مل گیا اور دہاڑا۔ بھاری گھٹی ہوئی ہر طرف پھیلی ہوئی دہاڑ نے چاروں طرف کے جنگلوں کو کپکپا دیا۔ شیرنی غلطی پر تھی۔ اس مرتبہ ہاتھیوں کا غول نہیں تھا بلکہ صرف ایک ہاتھی تھا۔ ایک کانا ہاتھی مست دیوانہ، ڈیڑھ دانت کا، پہاڑ قامت، خونی اکڑ ہاتھی۔ وہ ہاتھی جو آدھا دانت لڑائیوں کی نذر کر دینے کے باوجود تمام ہاتھیوں کو شکست دے چکا تھا۔ وہ ہاتھی جو ایک آنکھ گولی سے ضائع ہو جانے کے باوجود تمام شکاریوں کو ہرا چکا تھا۔ وہ ہاتھی جو دُنیا کے تمام جان داروں سے برسرِ جنگ، ہر ہستی کے خون کا پیاسا پھرتا تھا۔ اس کے ساڑھے گیارہ فٹ کے قد میں نہ صرف بے اندازہ قوت پنہاں تھی بلکہ ڈیڑھ سو برس کی زندگی نے قوت کے اجتماع کے ساتھ ایک صدی سے اوپر کے تجربوں سے جابر، ظالم، بے رحم، چالاک اور مکّار دماغ بھی اسے عطا کیا تھا۔ وہ جس قدر جثّے کا مالک تھا اسی قدر اپنا وزن استعمال کرنے کے طریقوں سے بھی آگاہ تھا۔ شیرنی کی جنگل دہلا دینے والی دہاڑ اس نے سکون اور اطمینان کے ساتھ سونڈ کی نوک منہ میں دبائے ہوئے اور اُٹھے ہوئے پچھلے ایک پیر سے دوسرا پیر کھجاتے ہوئے سُنی۔ اس کی بائیں طرف کی پھوٹی ہوئی آنکھ اپنے دید سے خالی گڑھے پر مچ مچاتی آنکھ میں دائمی سیاہ بہنے والے آنسوؤں سے مستک پر ایک کالی لکیر بنی ہوئی تھی۔ سالم آنکھ کے چھوٹے سے گول ڈھیلے نے چاروں طرف اوپر اور نیچے کئی چکّر کھائے۔

کانا ہاتھی گھوما اور آہٹ کیے بغیر آہستہ آہستہ واپس لوٹا۔ پیڑ سے قریب دو گنا دور جا کر آہستہ سے دبی ہوئی پُر زور دُر دُر آواز نکالی اور اس کے بعد گھنے ساکھو کے اندر ہی اندر پیڑ سے دور ہٹتا ہوا، نصف دائرے میں چکّر کھا، جھیل کے مغرب کی طرف پہنچ کر احتیاط سے دبے پاؤں کنارے کے پاس آ کر ایک بہت موٹے درخت کی آڑ میں رُک کر انتظار کرنے لگا۔ یہاں تک کہ بے خبر شیرنی مری ہوئی گوند کو کمر سے مُنہ میں اُٹھائے، پیڑ سے سال بنی میں داخل ہوئی۔ بھاری گوند شیرنی نے اس طرح منہ میں اُٹھا رکھی تھی جیسے بلّی چوہا اُٹھا لیتی ہے۔ البتہ اس کی گردن اور پیر لٹکتے ہوئے زمین پر گھسٹ رہے تھے اور دونوں بچّے گھسٹتے ہوئے اعضا کو کبھی اِدھر سے اور کبھی اُدھر سے پکڑ کر گھسیٹتے اور جھٹکے دیتے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ شیرنی ان کی اس بے موقع کارگزاریوں سے قدرے جھنجلائی۔ ہلکے ہلکے غراتی دائیں بائیں کتراتی۔ اونچے سال بنی کے نیچے چھدری اُگی ہوئی جھاڑیوں میں چلی آ رہی تھی کہ دفعتہً اسے درختوں کے چار تنے اپنی جگہیں چھوڑ تیزی سے حرکت کرتے معلوم ہوئے اور قبل اس کے کہ وہ گوند کو رکھ کر اوپر دیکھنے کے لیے سر اٹھائے ایک تیز دل بھیانک چنگھاڑ سے کان کے پردے تھرتھرانے لگے۔ شیرنی کی اٹھتی ہوئی نگاہیں سامنے کھڑے ہوتے ہاتھی پر گزوں اُٹھتی

چلی گئیں۔

شیرنی نے دیکھا وہاں سیاہ بے ہنگم بھوت گزوں اونچے سر سے گزوں اونچی سونڈ اٹھائے دیوار کی طرح سامنے کھڑا، اٹل، جنگ کا پیغام دے رہا تھا شیرنی کے سامنے اس کا شکار اور دائیں بائیں اس کے نوعمر اور ناتجربہ کار بچے تھے۔ خطرہ اور فوری خطرہ سامنے تھا۔ خون میں ہیجان آیا، رگیں تھرائیں، پٹھے سکڑے اور آناً فاناً، قہر کا شعلہ تھا کہ جرأت کی بجلی تھی، جو زمین سے چیختی اور پہاڑ ایسے دشمن کے بانسوں اٹھی ہوئی سونڈ تک پہنچی۔ ہوا میں معلق شیرنی چاہتی تھی کہ گرفت میں لا کر وہ اٹھی ہوئی سونڈ جبڑوں سے چبا ڈالے اور پنجوں سے چیر پھاڑ کر ڈالے لیکن اٹھے ہوئے سونڈ کے اژدہے نے ناگن کی طرح بل کھایا۔ موت کا سیاہ لٹھا سامنے سے لپکا، بازو میں آیا اور کئی من کا مکا شیرنی کی پسلیوں پر گھم سے پڑا۔ شیرنی دھپ سے زمین پر گری، ہاتھی لپکا۔ سیدھے پیر کی فنا کن ٹھوکر چلائی مگر وہاں جگہ خالی تھی۔ پھرتی کا مجسمہ شیرنی کندھے پر چمٹی سخت کھال میں دانت اور ناخن گھسا رہی تھی۔ ہاتھی نے جھرجھری لی اور دو جھٹکے اپنے بدن کو اس قدر سخت دیے کہ شیرنی کی گرفت چھوٹ گئی۔

وہ پھر تین گز پر گری اور ساتھ ہی کچل کر نقش زمین کر دینے والا سولہ من کا پیر اسٹیم ہیمر کی طرح اس جگہ پڑا جہاں شیرنی گری تھی مگر پھرتیلی شیرنی ہٹ چکی تھی اور خیال کی تیزی کے ساتھ اب کے پٹھا بھنبھوڑ رہی تھی۔ ہاتھی نے پھر اپنے بدن کو سخت جھٹکے دیے لیکن بیکار، شیرنی کے دانتوں کے پیش قبض اور ناخنوں کے نشتر سخت کھال میں انچوں پیوست کر دیے تھے۔ ہاتھی کرب اور تکلیف کے باوجود لمحے بھر کو خاموش ہوا۔ پھر اطمینان کے ساتھ نصف دائرے میں گھوما تنہا مکار آنکھ نے اپنا کام کیا یعنی ایک زبردست درخت تاک لیا۔ ہاتھی آہستہ آہستہ اس کی طرف کھسکا اور پھر قریب پہنچتے ہی پھرتی سے جھپٹا چار فٹ موٹے درخت کے تنے اور سینکڑوں من بھاری ہاتھی کے جسم کا ایک شکنجہ تھا جس کے بیچ میں شیرنی کی ہڈیاں اور پسلیاں چرچرا رہی تھیں۔ آخری جاں گسل چیخ شیرنی کے منہ سے نکلی۔ جنگل گونج گیا۔

کانا ہاتھی بڑی دیر تک شیرنی کی لاش درخت اور اپنے جسم سے دبائے رگڑ رگڑ کر کچلتا رہا اور جب بالکل اطمینان ہو گیا تو شیرنی کی چپٹی لاش پہلے پیر سے ٹھکراتا رہا اور پھر پیر سے دبا کے اور سونڈ سے پکڑ کے چاروں ہاتھ پیر چیر چیر کر ادھر ادھر اچھال دیے اور اس پر بھی جب جلال کا جذبہ ٹھنڈا نہ ہوا تو لوتھ دھڑ فٹ بال کی طرح ٹھکراتا ہوا سال بنی کے مشرق کی طرف چل دیا اور مزرعہ سے ملے ہوئے جنگل کے کنارے کٹان کے ایک ٹکڑے میں پہنچ گیا جہاں کٹان اور سلیپر چیران کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ دو تین درخت گرائے جا چکے تھے اور دو تین آرہ کش بھی اگر شگون کے طور پر کام شروع کر چکے تھے لیکن چونکہ ابھی پوری طرح مدد نہیں آئی تھی اس لیے یہاں کانے ہاتھی کو چند نامکمل منڈیوں کے سوا برباد کرنے کے لیے اور کچھ نہ ملا۔ انھی کو دل بھر کر روندنے کے بعد تھوڑا سا پھونس سر پر اچھال اور تھوڑا پھونس منہ کے ایک کونے میں دبا چھپروں کی لکڑیوں میں سے ایک لکڑی سونڈ میں لے آگے مزرعہ میں لہلہاتے گیہوں چرنے چل دیا۔

ہر شب کے معمول کے مطابق دس بارہ میل کی چہل قدمی کے بعد چیران کے ٹکڑے سے نکل کے کانا ہاتھی صبح تین بجے کے قریب پیرپا گاؤں کے جنوب کی طرف جنگل کے کنارے آنکلا۔ جنگل سے باہر مزرعہ زمین کے کنارے کنارے میلوں لمبی کانٹے دار ڈالیوں، ٹہنیوں اور جھاڑیوں سے بنائی ہوئی دیوار اس کے لیے کوئی رکاوٹ ہی نہیں تھی۔ سونڈ نیچے ڈال کر آہستہ سے جھانکڑ کی دیوار گزوں کھینچ کر ایک طرف پھینک دی اور پھر گز بھر اونچے ہرے لہلہاتے گیہوؤں میں کھڑے ہو کر ایک ایک وقت میں بوجھ بوجھ کے پودے سونڈ میں لپیٹ بھر بھر جڑوں سمیت نوچنے شروع کر دیے اور وہ پولے سونڈ میں ہلا ہلا کر اگلے پیر مارتے ہوئے جڑوں کی مٹی جھٹک کر دہرا کر کے منہ میں رکھنے اور مزے لے لے کر کھانے شروع کر دیے۔ اس وقت وہ اس قدر خودی کے گھمنڈ میں کھویا ہوا تھا کہ تھوڑی دیر پیشتر شیرنی ہلاک کرنے کا کارنامہ بھی اپنی طاقت کا ادنا کرشمہ سمجھتے ہوئے ایک معمولی واقعے کی طرح فراموش کر دینے کے لیے کوشاں تھا۔ وہ دنیا کی تمام طاقتوں سے بے خوف کھیت میں کھڑا گیہوں کے پولوں پر پولے نوچتا، جھٹکتا اور چرچر کھاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے پیروں میں اور اس کی پشت پر گزوں کھیت سبز گھنے پودوں سے خالی ہو کر پیروں کے گول گول گڑھوں سے گُندھ چکا تھا۔

شامت جو آئی تو اس سے کچھ دور مچان پر سوئے ہوئے ایک رکھوالے کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چرمر آوازیں سنیں۔ سمجھا کہ سور گھس آئے ہیں۔ صبح ہونے کو تھی۔ سردی پڑ رہی تھی۔ رضائی اور کملیا میں لپٹا پڑا تھا۔ ویسے ہی پڑے پڑے آواز لگائی "دھوا لالالا۔ دھوآآ" اور پھر خراٹے لینے لگا۔



مکار ہاتھی اس آواز کے سنتے ہی گم ہو کر رہ گیا۔ کئی منٹ آدھا پولا منہ میں اور آدھا سونڈ کی نوک میں پکڑے کھڑا رہا۔ پھر پولا منہ سے نکال کے وہیں پھینک، سونڈ کی نوک بو لینے کے لیے آگے بڑھائی۔ کان کھڑے کیے اور آہستہ آہستہ مچان کی طرف بڑھا۔ پاس پہنچ کے پھر خاموشی سے خراٹے سنے۔ ایک ایک قدم کر کے مچان تک گیا۔ لمبی سونڈ اٹھا کر مچان پر رکھی۔ آہستہ سے سوتے ہوئے آدمی کے پیر لحاف کمبل اور گاڑھے کی سوزنی سمیت لپیٹ کر سٹر سے اسے کھینچ لیا۔ ہوا میں دو بڑے بڑے جھکولے دے کر سٹرا سٹر دو دفعہ زمین پر پٹکا اور پھر پیر میں دبا کر چرا چر لحاف کمبل وغیرہ چیر ڈالے۔

آدمی ان میں اب نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی جھکولے میں تکیے کی طرح اپنے غلاف سے نکل کے دور جا گرا تھا۔ شکاری کلوا پاسی کا لڑکا بدّل گو ابھی نوجوان

ہی تھا لیکن بچپنے سے اب تک جنگل کی آغوش میں رہا تھا۔ نو دس برس کی عمر سے شکاریوں کے ساتھ جانے اور جنگل میں مویشی چرانے سے اس کے حواسِ خمسہ، حواسِ عشرہ میں تبدیل ہو چکے تھے۔ جیسے ہی ہاتھی نے اپنی سونڈ میں لپیٹ کر اس کے پیر کھینچے، کسی نامعلوم حِس نے اسے خطرے کی اہمیت سے آگاہ کر دیا۔ اس نے سانس کھینچ لیا، بدن ڈھیلا چھوڑ دیا اور جب وہ بستر کے تول سے نکل کے بھدسے کھیت سنچائی کی دلدل میں گرا تو اس نے چوں تک نہ کی بلکہ ویسے ہی بے حس پڑا ابر آواز غور سے سُنتا رہا۔ جھر اجھر کپڑے چیرنے

اور پھاڑنے کی آوازیں سُنیں۔ پھر پھنکار سے ملتی اطمینان کی سانس سنی اور اس کے بعد پیروں کے پھسا کے سُننے اور جب یہ پھسا کے کافی دُور سے آنے لگے تو پھر کیچڑ میں اوندھے پڑے پڑے آہستہ آہستہ دونوں ہاتھوں کے بَل اونچے ہو کر صبح کی ہلکی روشنی میں سیاہ دَل، دیو قامت ہاتھی کو جنگل میں گھستے اور غائب ہوتے دیکھا۔

جب یہ کسرتی گبرو جوان کیچڑ میں پڑے پڑے ہاتھوں کے بَل اگلا دھڑ اُٹھائے ہوئے گیہوں کے پودوں کے اُوپر سے ہاتھی کو دیکھ رہا تھا تو وہیں پاس کے پچاس قدم پیچھے مُنڈیر پر کھڑا ہوا گاؤں کا ایک اور لڑکا جھلّیّ اس کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس ہم عمر، کمزور، بُزدل اور مکّار جھلّیّ نے مسکراتے ہوئے آواز دی "ارے دادا! تم اتّے نکے ہو۔ آئے جاؤ۔ نکس آؤ میں ٹھاڑا ہوں۔"

بدّل نے سر گھما کے جھلّیّ کو دیکھا۔ تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی گو کمر میں سخت جھٹکے کی وجہ سے بہت تکلیف تھی لیکن فوراً "ٹھاڑا ہوات ہوں۔" جھلّیّ بڑی تیزی سے مُشتہر کرنے کے لیے گاؤں کی طرف روانہ تھا۔

جوں توں بہادر بدّل گاؤں پہنچ گیا۔ کمر کی مالش کی گئی۔ سکائی ہوئی۔ دو چار دن میں ٹھیک ہو گیا لیکن اس کی بیکار بدنامی ہو چکی تھی جس کا علاج اس کے پاس نہیں تھا۔



میجر بوسٹ کچھ عرصے افریقہ میں رہ چکے تھے اور اُن کی محبوبہ منگیتر لوئس غرور سے مسکراتی ہوئی حاضرین کی طرف دیکھ دیکھ کر اُن کے قصّے سُنایا کرتی تھی۔ اس لیے میجر بوسٹ کے لیے کلب میں بیٹھ کر افریقہ اعظم کے بے پایاں جنگلوں میں مہیب وحشی جانوروں کے خطرناک شکار کے قصّے بیان کرنا ضروری تھا جنھیں سُننے سے دل کانپ جائے، رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور عقل خبط ہو جائے اور جب ایسا ہوتا ہی تھا تو ایک دن ایسا بھی ہوا کہ ٹھیک اُس وقت جب میجر ہاتھیوں کے شکار کا ایک ایسا واقعہ بیان کر چکے تھے جس میں ان کے دو بندوق بردار چار قلی چھ کے چھ ہاتھیوں کے پیروں میں رُندے کے اور سونڈوں سے چیر کے ختم ہو گئے تھے اور آٹھ دس حاضرین جن میں دو اور لیڈیز بھی تھیں، ششدر خاموش بیٹھے تھے تو ایک نو عمر لفٹیننٹ

نے اُٹھ کر جیب سے "ٹائمز آف انڈیا" کا ایک تہہ کیا ہوا صفحہ نکالا اور اسے اطمینان سے کھول کر سیدھا کیا اور پھر کہا "آپ لوگ سُنیں، پرسوں کے اخبار میں ایک اشتہار تھا۔ شاید آپ لوگوں کو اس سے دلچسپی ہو۔" اس نے کنزرویٹر آف فارسٹس یو۔ پی کا وہ اشتہار پڑھا۔ جس میں پیلی بھیت ڈویژن کے کانے خونی ہاتھی کے مارنے پر پانچ سو روپے کا انعام مُشتہر کیا گیا تھا۔

چنانچہ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن میجر بوسٹ اپنی چھ بندوقوں اور چار ملازموں اور تین بیل گاڑی سامان کے ساتھ، ملازموں کو ہندوستانی کُتا کہتے، خود سفید فاکس ٹیریر کی زنجیر تھامے، مالا اسٹیشن پر اترے۔ افسرانِ بالا کے حسبِ ہدایت فارسٹ گارڈ قلیوں اور بیل گاڑیوں کے ساتھ موجود تھا۔ اسٹیشن سے سامان لادا گیا اور جنگل کی کوٹھی میں اُتار دیا گیا۔ جہاں صاحب بہادر نے تمام تر اطمینان اور آسائش کے ساتھ سکونت اختیار کر لی اور صبح سے شام تک اسپراگس، سارڈین، ساسیجز، فروٹ سیلڈ، سینڈوچز، کریم وغیرہ ایسے اقسام کے ڈبّے کھلنے اور خالی ہو ہو کر پھکنے لگے اور دودھ، انڈے، مرغی تازہ مچھلی، ڈبل روٹی اور ڈاک کی فراہمی کے لیے طرح طرح کے پیادے اطراف میں دوڑنے لگے اور میجر بوسٹ خود اخبار پڑھنے، خطوط دیکھنے، ان کے جوابات لکھنے، شیو کرنے، بال بنانے، کئی کئی غسل کرنے اور متعدّد لباس پہننے جیسے اہم مشاغل میں مصروف تھے جن میں بار بار کے ناشتے اور کھانے بھی شامل تھے۔ اس کے باوجود صبح اور شام ایک دو گھنٹے شکار کے لیے نکال کر اکثر چکتی ہوئی مرغیاں اور جنگل سے جھانکتے ہوئے چیتل مارنے لگے۔ اسی طرح آٹھ دن گزر گئے اس عرصے میں ایک دن ایک کالا تیتر بھی انھوں نے مار لیا تھا اور کوٹھی سے چار میل کے فاصلے پر ایک کھیت میں مہینے بلکہ سوا مہینے پُرانے ہاتھیوں کے پیروں کے نشان بھی دیکھ آئے تھے۔ غالباً شکار کے لحاظ سے میجر بوسٹ کی سرگرمیاں بس اسی حد تک محدود رہتیں اور چار دن اور گزر جانے کے بعد وہ ایک دفعہ پھر ڈیم فول کی بوچھاریں نجی نوکروں، فارسٹ گارڈوں اور ریلوے ملازموں پر اُڑاتے ہوئے مالا اسٹیشن سے روانہ ہو کر بریلی پہنچ جاتے لیکن اتفاقاً بدّل کو پتہ چل گیا کہ ایک لال کُرتی کا لال مُنہ والا صاحب کوٹھی میں شکار کھیلنے کے لیے ٹھیرا ہے۔ یہ تو خار کھائے بیٹھا ہی تھا۔ دوسرے ہی دن صبح چار بجے بلّم ہاتھ میں لے کے گھر سے چل دیا اور مالا ندی کے کنارے کنارے پیروں کے نشان دیکھتا ہوا میلوں نکل گیا۔ دن چھپے گھر واپس آیا تو باپ نے پوچھا "ارے کہاں رہا رے؟"

بدّل بولا "کوٹھی میں جو صاحب ٹھیرا ہے، اس نے شکار کھلانے کو رکھ لیا ہے۔ مرغی، جھانک مارتا ہے۔"

اب صرف اس اُمید پر کہ شاید ان ایام میں کانا ہاتھی پھر اس طرف نکل آئے، یہ روزانہ مالا کے کنارے کنارے کھوج میں روانہ ہو جاتا۔ آخر چوتھے روز گاؤں سے چار میل کے فاصلے پر کانے ہاتھی کا کھوج مل گیا۔ یہاں پھر اس نے پچھلی رات کھیت چرے تھے اور صبح ہوتے ہوتے تین میل چوڑے

جنگل سے ہو کر مالا ندی میں گھس گیا تھا۔ جہاں کسی نہ کسی ٹاپو میں دن بھر قیام کر کے دوسری رات پھر کسی اور طرف نکل جانا اس کے لیے ضروری تھا۔ بدّل اس کا کھوج پاتے ہی بھاگتا ہوا گاؤں واپس آیا۔ یہاں آکر زمیں دار کی گھوڑی نظر آگئی، جھٹ پٹ کمّل اس پر کس، سوار ہو، سیدھا پھر کوٹھی کی طرف روانہ ہوا۔ سرپٹ گھوڑی دوڑاتا جس وقت کوٹھی پہنچا تو دس بجے کا وقت تھا۔ صاحب بہادر بندوقیں، جھولے، تھرماس، دوربین، کیمرہ وغیرہ ایسی ہی ضروری چیزیں ہاتھی کے شکار کے لیے تین مزدوروں پر لادے ہوئے روانہ ہو رہے تھے۔ اس نے جاتے ہی دُہرے ہو کر ہاتھ زمین سے لگا کر سلام کیا اور کہا کہ کانے خونی ہاتھی کو میں تلاش کر کے آیا ہوں۔ اب دیر نہ کی جائے، فوراً چلا جائے لیکن صاحب بہادر نے اس کے جلدی مچانے کے باوجود آدھا گھنٹہ پوچھ گچھ میں لگا دیا۔ "کے ہاتھی ہیں؟ کانا ہاتھی بھی اُن میں ہے؟ کیسے جنگل میں ہیں؟ اس جنگل میں ایسے مضبوط درخت بھی ہیں جن پر چڑھ کر نشانہ لگایا جا سکتا ہے کتنی دور جانا ہے؟"

بدّل شکاری کی صورت اور سامان دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ کس قسم کا شکاری ہے۔ پھر بھی لال کُرتی کا بریلی کا صاحب تھا۔ اس کی بھاری بھاری بندوقوں کا اعتبار کرتے ہوئے اس نے جھوٹے سچے جواب دے کر صاحب بہادر کو فوراً چلنے پر راضی کر لیا۔ صاحب گھوڑی پر سوار ہوئے۔ ۴۰۰/۳۲ بور کا رائفل بدّل کو دیا گیا۔ اس کا بھرنا چلانا بتایا گیا۔ دوسرے دو اور جوڑی کے ڈبل بیرل۔ ۵۰۰/۴۷ بور ایکسپریس رائفل دو اور مزدوروں کو دیے گئے اور یہ لوگ گھوڑی کے آگے اور پیچھے کبھی بھاگتے اور کبھی تیز قدم چلتے ہوئے روانہ ہوئے۔ بدّل نے میل بھر کے بعد جنگل کا کنارہ پکڑ لیا اور اس طرح گاؤں اُلٹے ہاتھ پر چھوڑ کر جنگل جنگل ہی لیے چلا جا رہا تھا۔ ابھی اسے تین میل اور جانا تھا کہ صاحب بہادر کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ بہت زیادہ بگڑ کر دریافت کیا کہ "آخر کہاں تک چلنا ہو گا؟"

وہ ابھی تک اسی خیال میں تھے کہ میل دو میل کی بات ہے۔ اس کے اختتام پر کالے ہرن کی طرح نشانہ بنا کے کھڑا ہوا ہاتھی آجائے گا۔ چاند ماری کے معرکہ آرا صاحب بہادر دُور ہی سے اُسے دیکھ کر پٹ سے اسے گرا لیں گے لیکن یہاں کچھ اور ہی نکلا اور جب یہ دوش پورا کر چکے تو پہنچے کہاں؟ ہاتھی کے پیروں کے نشانوں پر۔ اب جنگل میں گھسنے کی باری آئی۔ صاحب بہادر لگے ہاتھ پیر پھیلانے اور سوالات کرنے۔ بدّل نے پھر سبز باغ دکھائے کہ بس اب کیا ہے۔ آ پہنچے ہیں۔ مار لیا سالے کو۔ غرض کہ ایک آدمی تو گھوڑی لے کر گاؤں واپس بھیجا گیا اور باقی دونوں کے ساتھ اب پیدل چلائی شروع ہوئی آگے آگے بدّل، بیچ میں صاحب، پیچھے قلی، پھر تیز تیز روانہ ہوئے۔ ایک لمبا سال بنی کا آیا، دوسرا آیا۔ وہ بھی ختم ہو گیا، تیسرا شروع ہوا۔ راستہ نہ آج ختم ہوتا ہے نہ کل۔ ہاتھی کا محلّہ ہی نہیں آتا۔ شروع میں تو سال بنی میدان کی طرح نیچے صاف تھی۔ پھر فٹ، ڈیڑھ فٹ اونچے پودے جھاڑیاں گھاسیں شروع ہو گئیں اور اب تو یہ حال تھا کہ اونچے سال کے درختوں کے نیچے اُگی ہوئی جھاڑیاں سر سے فٹوں اونچی تھیں تین چار گز سے آگے کا کچھ نظر آنا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ اب میجر لوسٹ کی یہ حالت تھی کہ نہ آگے بڑھنا سمجھ میں آتا تھا نہ لوٹنا۔ ہر لمحے اور ہر طرف سے ہاتھی کی سونڈ پتّوں سے نکل کر انھیں دبوچتی معلوم ہوتی تھی۔ اس پر غضب یہ تھا کہ بدّل بڑے اطمینان بخش لہجے میں صاحب کو یقین دلاتا جاتا تھا کہ بس اب تو بالکل نزدیک ہی ہے ہاتھی۔

خدا خدا کر کے دفعتہً یہ جنگل ختم ہو گیا۔ سامنے مالا ندی کا بھوری گھاس سے پٹا ہوا چوڑا پاٹ پھیلا ہوا تھا جس میں کہیں کہیں گہرے سبز جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ٹاپو دکھائی دے رہے تھے۔ ندی کے کگارے کے نیچے ہاتھی چھپواں بھوری گھاس سنسانی معلوم ہو رہی تھی۔ پُشت پر گھنے جنگل میں اندھیرا ساچھایا ہوا تھا اور اس میں سے ٹُرک ٹُرک ٹُرک کرکٹ۔ کِٹ کِٹ کُٹ کُٹ۔ کھٹ کھٹ بڑھئی کی آواز آ رہی تھی۔ دن ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ دو بجے کا وقت تھا۔ یہاں تینوں دم لینے کو ٹھیرے۔ میجر لوسٹ نے انتہا سے زیادہ لال مُنہ کا پسینہ بار بار پونچھتے ہوئے آگے کی گھاس اور پیچھے کا جنگل بُری نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد شکاری تھیلے سے برانڈی کی چھوٹی بوتل نکال کر منہ سے لگائی۔ چند گھونٹ لیے۔ لمبی سانس لی اور پھر چند گھونٹ لیے سگار نکالا، اسے جلایا، دس بیس کش اس کے لیے۔ جب جا کر پھر چلنے پر آمادہ ہوئے اب روانہ ہونے سے پہلے بدّل نے صاف بتا دیا کہ بس اس گھاس کے اندر جس ٹاپو میں یہ پیر کے نشان گئے ہیں، وہیں ہاتھی ہو گا، ہوشیار رہنا۔ پھر وہی آگے آگے بدّل، بیچ میں صاحب، پیچھے مزدور۔ ایک دو نالہ ۴۷۵ بور رائفل صاحب کے ہاتھ میں، دوسرا ابھرا ہوا پیچھے مزدور کے ہاتھ میں۔ ہاتھی کے

صاحب رکشا کے انتظار میں فٹ پاتھ پہ کھڑے تھے کسی گشتی تولیا فروش نے ان کے قریب آکے ایک تولیا اپنے ہاتھوں پہ پھیلائی اور اس کی خوبیاں بیان کرنے لگا۔ انھوں نے یُوں ہی پوچھ لیا کہ "کیا قیمت ہے اس کی؟"

"سوا سات رُوپے صاب!" تولیا فروش نے لجاجت سے کہا۔

انھوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا: "اتنی مہنگی؟ نہیں چاہیے۔"

تولیا والا اُن کے پیچھے پڑ گیا کہ کم از کم ایک تو خرید ہی لیجیے۔ انھوں نے ٹالنا چاہا مگر وہ جتنا ٹالتے اُس کا اصرار اتنا ہی بڑھ جاتا۔ آخر تنگ آکے انھوں نے اس سے پوچھا: "تمھیں ایک تولیا پر کتنا منافع ملتا ہے؟"

"صرف دو آنے صاب" اُس نے رونی صورت بنا کے کہا۔

انھوں نے جیب سے دو آنے نکال کے اس کی طرف بڑھا دیے۔ "یہ رکھ لو۔ اپنے دو آنوں کے لیے میرے سوا سات رُپے کا نقصان کیوں کراتے ہو۔"

*

پیروں سے کھُدی ہوئی گھاس کبھی خشکی کبھی پانی اور کبھی کیچڑ! چل پڑے گھاس کا گھن اور اونچائی ایسی تھی کہ اس میں غرق ہو گئے بلکہ یہ معلوم ہوا کہ گدلے پانی میں ڈبکی لگا کر اندر ہی اندر جا رہے ہیں۔ اپنے سے ایک فٹ بھی اِدھر اُدھر حتیٰ کہ اوپر بھی کچھ نظر نہ آتا تھا۔ جوں توں گھاس کا سمندر پار کیا، وہ ٹاپو۔ یہاں پھر ایک دفعہ گھنا سرسبز جنگل فرنوں اور پھولوں سے آراستہ آ گیا لیکن اب اس کا گھن اس بلا کا تھا کہ اس میں آگے بڑھنے سے صاحب نے قطعی انکار کر دیا اور پھر جب کہ یہ بات بھی یقینی تھی کہ خونی ہاتھی ضرور بالضرور اسی چھوٹے ٹاپو میں ہے، عقل نے آگے بڑھنا گوارا ہی نہ کیا۔ دل کی حرکت آٹھ روپے گز اُونی سرج عبور کر کے ظاہر ہونے لگی۔ صاحب بہادر دونوں ٹانگیں چیر کے ثابت قدمی سے وہیں کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے دونوں ڈبل بور بھرے ہوئے رائفل سامنے درخت کے تنے سے لگا کر کھڑے کر دیے۔ اپنے مقدر کو کوسا، اپنے کو کوسا۔ بدّل کو انگریزی زبان کی تمام تر گالیاں بخشیں اور جھولے سے سگار اور برانڈی کی بوتل نکال کر دونوں کا استعمال شروع کر دیا جب وہ سگار کے لمبے کشوں کے درمیان برانڈی کی بوتل سے چھوٹی چھوٹی چسکیاں لینے میں مصروف تھے، بدّل کے لیے اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ وہ چکی کے پاٹ جیسے ہاتھی کے پیروں کے نشان کچھ دیر دیکھنے کے بعد ایک سے دوسرے کو اور دوسرے سے تیسرے کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس کا خیال زیادہ دور جانے کا ہرگز نہیں تھا۔ محض شغل بیکاری۔ وہ ٹہلتا ٹہلتا پیروں کے نشانوں کے ساتھ ساتھ چل دیا تھا۔ یہ نشان کوئی پچاس گز تک گھاس سے جنگل کے اندر جانے کے بعد پھر گھوم کر ندی کے کنارے کے متوازی ہو گئے تھے۔ بدّل انھی کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا کہ اسے خیال آیا، وہ دور نکل آیا ہے، واپس جانا چاہیے اس لیے اس نے نشان چھوڑ کر ندی کے کنارے کا رُخ کیا جھاڑیوں اور پتوں کا گھن بلا کا تھا مگر یہ جھکتا اور بیٹھے بیٹھے کھسکتا، ان کے نیچے نیچے سے نکلتا پھر ندی کے کنارے نکل آیا لیکن جیسے ہی ریتیلے اور قدرے کشادہ کنارے پر آیا، اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہاں ہاتھی کی واپسی کے بالکل تازہ پیروں کے نشان تھے۔ گویا ہاتھی اسی وقت اس راستے سے صاحب کی طرف گیا ہے۔ بدّل نے اندازہ لگایا کہ وہ صاحب سے زیادہ سے زیادہ سو گز دور ہو گا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے جلدی سے ۴۰/۳۲ مارٹینی اکشن ونچسٹر رائفل کا لیور نیچے کھینچ کر مزید اطمینان کیا کہ نال میں کارتوس ہے اور پھر لیور چڑھا کر رائفل دونوں ہاتھوں میں تانے واپس بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے جیسے ہی وہ بیت کی ایک جھاڑی کی آڑ سے نکلا، سامنے صاحب ایک ہاتھ میں بوتل دوسرے ہاتھ میں سگار لیے آنکھیں بند کیے، منہ سے دھواں نکالتے نظر آئے اور ساتھ ہی اپنے اور صاحب کے درمیان جنگل کی آڑ میں اُن کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھی بھی دکھائی دیا۔ مکّار ہاتھی بے خبر شکاری کی طرح چھُپا ہوا دبے قدموں بڑھ رہا تھا۔ اب چند ہی قدم اور آگے بڑھنے کی دیر تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔ بدّل نے ایک بھیانک چیخ مار کر صاحب کو ہوشیار کیا۔ کانا ہاتھی اس آواز پر بجلی کی سرعت کے ساتھ گھوما اور اس چلّانے والے نئے دشمن پر جھپٹا۔ اب بدّل کے لیے مقابلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا "مارو صاحب مارو" کہتے ہوئے اس نے بندوق کندھے پر چھوائی۔ دھڑ سے فیر کیا۔ فوراً پھر پیچھے کی مٹھی میں پانچ کارتوس اور تھے۔ بندوق بھری اور پھر فیر کیا۔ پھر بھری اور پھر فیر کیا۔ ہاتھی کی چھ انچ موٹی ماتھے کی ہڈی پر گولیاں ٹھسا ٹھس پڑتی اور پھسلتی چلی جا رہی تھیں۔ تاہم ہاتھی اس تکلیف وہ مذاق سے گھبرا کر رُک گیا لیکن اب بدّل کا آخری کارتوس بھی خالی ہو کر نال سے گر چکا تھا۔ اس نے ہراساں ہو کر اس طرف دیکھا جہاں صاحب بہادر کھڑے تھے۔ پھر اس نے مڑ کر گھاس کے کنارے کی طرف دیکھا جس میں صاحب بہادر گھس کر غائب ہوتے ہوئے اسے دکھائی دیے تھے اور اس کے بعد اس نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہاتھی کے ایک ہی مکّے میں گرا اور تین فٹ موٹے پیر کی ایک ہی داب میں کچل کر جیتے جاگتے نوجوان انسان سے ہڈیوں، گوشت اور چیتھڑوں کا ملا جلا ڈھیر ہو گیا۔ جسے ٹھکرا ٹھکرا کر اور نوچ نوچ کر ہاتھی نے اور بھی زیادہ ناقابلِ تصوّر شہ پاروں میں بکھیر دیا۔

میجر لوسٹ کا دوسرا ساتھی ان سے پہلے ہی رفوچکّر ہو گیا تھا۔ تنہا صاحب بہادر جن مصیبتوں سے مالا کی کوٹھی تک واپس آئے ہیں، بس انھی کا دل جانتا ہے۔ تاہم خوش تھے کہ جان بچی اور لاکھوں پائے۔ کارتوسوں کا جھولا اور دونوں میں سے ایک رائفل وہیں رہ گیا تھا۔ جھولے کا تو خیر کچھ نہیں لیکن جوڑی کے رائفل قیمتی تھے جو چھوڑ آئے تھے۔ اس کی فکر تھی اس لیے دوسرے دن محکمہ جنگلات کو بدّل کے دونوں ۴۰/۳۲ اور ۴۵۰ بور رائفل کے فرار ہو جانے کی یا گم ہو جانے کی باقاعدہ اطلاع دے کر صاحب بہادر اینٹھتے، اکڑتے، چیختے چلّاتے بریلی روانہ ہو گئے۔

ان کے چلے جانے کے کچھ دیر بعد بدّل کا بوڑھا باپ کلوا پاسی، بلم کندھے پر رکھے پریشان گھبرایا ہوا کوٹھی پر آیا اور بڑی دیر تک سُونی کوٹھی دیکھتا رہا۔ آج یہاں چوکیدار بھی نہیں تھا جس سے وہ کچھ دریافت کرتا۔ آخر ایک لمبی سانس لے کے وہ پھر لوٹا اور سیدھا جنگل کی طرف چل دیا۔

صبح دس بجے سے آہیں بھرتا سر نیچا کیے پھرتے پھرتے آخر شام کے پانچ بجے ٹھیک اُس جگہ پہنچ گیا جہاں وہ لوگ ہاتھی کے پیروں کے نشانوں کے ساتھ ساتھ مالا ندی کی گھاس میں گھسے تھے۔ جیسے ہی اس نے کانے ہاتھی کے پیروں کے نشان دیکھے اور ان کے برابر فوجی فل بوٹ اور بدّل کے نال دار چرٹوے جوتے کے نشان بھی پائے، اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "او رہائے بھگوان جو کا ہے بھگوان!" ہاتھوں میں سر ہلا ہلا کر کہنے لگا۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر یک بارگی "بدّل، بدّل۔ اسے بل لہ آت ہوں" کہتا ہوا کھڑا

ہو گیا اور نہایت تیزی سے گھاس میں روانہ ہو گیا۔ گزوں اُونچی گھاس میں سُرنگ ایسا بے ترتیب راستہ کچلی ہوئی گھاس، کیچڑ اور دلدل میں بنا تھا۔ جہاں بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ پھر بھی کلوا اسی پر آنکھیں گاڑے چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک جگہ میجر پوسٹ کی واپسی کا نشان اسے نظر آ گیا تو اس وقت باپ کی محبت نے عقل خبط کر دی اس نے بے اختیار آواز لگائی "بدّل رے بدّل آت ہوں لل لہ" سنسناتی ہوئی گھاس میں آواز بھرائی اور پھر خاموشی ہو گئی۔

اب کلوا مجنونانہ اُس گھاس کی اندھیری گلی میں بھاگنے لگا۔ یہاں تک کہ گھاس ختم ہو گئی۔ وہ جنگل کے کنارے پہنچا اور اندر داخل ہونے ہی کو تھا کہ دفعتہً بائیں ہاتھ کے نشانوں کی طرف گھوم پڑا۔ دس قدم اور گیا ہوگا کہ ششدر کھڑا ہو گیا۔

سامنے ہاتھی کے پیروں کی کھوندن تھی۔ جا بجا سُوکھے ہوئے خون کے سیاہ دھبّے اور چھیکے تھے۔ انسانی جسم کے کئی ایک رُوندے کھوندے مٹّی میں لت پت مکھّیاں بھنکتے بدبودار ٹکڑے اِدھر اُدھر پڑے تھے بندوق کی ایک پتلی نال خم کھائی ہوئی ہاتھی کے پیر کے گڑھے میں دھنسی پڑی تھی اس سے کچھ دُور چیتھڑے جوتے کے پاس ہی بندوق کا کُندا ٹوٹا پڑا تھا۔

اس نظارے نے کلوا پاسی کو باپ کی حیثیت سے ہٹا کر ایک دفعہ پھر پرانے تجربہ کار شکاری میں تبدیل کر دیا۔ جوان بیٹے کی موت کا قلق سرِ دست ملتوی ہو کر موت کے واقعات کی جستجو میں سارا دھیان لگ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ نہایت غور سے ایک ایک نشان اور ایک ایک گری پڑی چیز دیکھنی شروع کی۔ پانچ عدد ۴۰۰/۳۲ بور کے پیتل کے خالی کارتوس خون کے سب سے بڑے دھبّے کے قریب سے ایک ایک کر کے بینے، پھر رائفل کی زمین میں دھنسی ہوئی ٹیڑھی نال نکالی، مٹی جھڑائی، نال میں دیکھا تو چلا ہوا ایک کارتوس اب بھی موجود تھا۔ اس نے ایک پکّے شکاری کی طرح داد دی "ساباس، ساباس۔ بھاگا نہیں، ڈٹا رہا۔ گولی ختم ہوئے گئیں تے بھی ڈٹا رہا" اسی طرح بڑبڑاتا ہاتھی کے پیروں پیروں چلا۔ اُس جگہ پہنچا جہاں سے ہاتھی صاحب کو چھوڑ بدّل کی طرف گھوما تھا۔ یہاں اس نے یہ دیکھا کہ ہاتھی اپنے بائیں طرف جب بدّل کے رُخ میں گھوما تھا تو ٹھیک بدّل ہی کی سمت نہیں گھوما تھا بلکہ کچھ زیادہ گھوم گیا تھا اور پھر کچھ اُلٹا گھوم کر قدرے سیدھا رُخ کر کے لیکن اب بھی کچھ دایاں رُخ لیے ہوئے بڑھا تھا کلوا بڑبڑایا "اکٹّی آنکھ ناہے۔ سیدھی ہی سے دیکھت ہے۔" اب اسے یہ جستجو ہوئی کہ ہاتھی اِدھر کہاں جا رہا تھا؟ اس نے تلاش کی تو صاحب کا جھولا درخت سے لگا دونالا رائفل بھی مل گیا۔ پھر صاحب کے پیروں کے نشان ملے۔ وہیں مُنہ سے گرا ہوا سگار اور ہاتھ سے گری ہوئی برانڈی کی بوتل ملی، رائفل کھول کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا۔ دونوں نالوں میں کارتوس تھے جھولے کا معائنہ کیا، اس میں شکاری چاقو، دو چار شیشیاں، سگریٹ کا بند ڈبّا اور ایسی ہی بہت سی چیزیں تھیں لیکن اس نے ان کی کچھ فکر نہ کی۔ اس نے کارتوس گنے اور مزید احتیاط کے لیے نئے کارتوس رائفل میں بھر کر دیکھے اتنے عرصے میں بالکل اندھیرا ہو گیا۔ کلوا اسی درخت سے پیٹھ لگا کر اس کی جڑ پر بیٹھ گیا اور پھر لڑکے کی موت کے وقوعات پر غور کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی دینا مشکل ہو گیا۔ درخت کے پتّوں سے اوس ٹپکنے لگی اور دُور مالا ندی کے باہر جنگلوں سے چیتلوں کے کُوکنے اور گونڈوں کے ڈونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔



صبح پَو پھٹتے ہی کلوا رائفل اور جھولا لے کر ہاتھی کے پیروں پیروں تیز روانہ ہو گیا اور شام تک برابر چلتا رہا۔ دن میں دو ایک دفعہ گڑھوں اور نالوں کے قریب سے گزرا تو پانی پینے ضرور رُکا' ورنہ ایک منٹ بھی کہیں نہیں ٹھیرا۔ ہاتھی نے مالا ندی کے اس ٹاپو سے دوسرے کنارے کا رُخ کیا تھا وہاں سے جنگل ہی جنگل شمال کی طرف چلا گیا۔ شام ہوتے ہی کلوا نے پھر نشان جُھک کر دیکھے، گوبر چٹکی سے مسلا اور مایوسی کی حالت میں سر ہلایا۔ ہاتھی اس سے پورے چوبیس گھنٹے پہلے کا چلا ہوا تھا۔ اب بھی یہ نشان کافی باسی تھے اور اب رات ہو رہی تھی۔ یعنی کلوا کو اپنا تعاقب موقوف کر کے رات گزارنی تھی اور رات ہی ہاتھی کو پھر کسی اور طرف روانہ ہو جانا تھا۔ اس طرح رات بھر میں پھر اُن دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھ جانے کا یقین تھا لیکن کلوا کر ہی کیا سکتا تھا؟ مجبوراً ایک درخت پر چڑھ کر رات بسر کی۔ دن بھر کا بھوکا اور تھکا ہوا تھا۔ ایک غنودگی کی حالت اس پر طاری ہو گئی اور اسی طرح صبح ہو گئی۔

صبح وہ پھر روانہ ہوا۔ اب اسے نہ جنگل کے ٹکڑوں کا دھیان رہا، نہ سمت کا خیال۔ نہ اس کا اندازہ رہا کہ کس قدر فاصلہ وہ طے کر چکا ہے؟ تھکن اور بھوک سے پیر ڈگمگا رہے تھے اور تعاقب کا جنون سر پر سوار تھا۔ انتقام کی آگ دل میں لگی تھی۔ ارادے کی قوت تھی جو آگے بڑھا رہی تھی۔

دن کے ایک بجے کے قریب اس نے جُھک کر ایک جگہ گوبر مسلا۔ اندر سے نرم اور تر تھا۔ کلوا کو یقین ہو گیا، ضرور صبح کا گوبر ہے۔ اسے خیال ہوا کہ ممکن ہے، ہاتھی قریب ہی کہیں رُکا ہوا دن گزار رہا ہو۔ یہ اُمید پیدا ہوتے ہی کلوا اور تیزی سے روانہ ہوا۔ اب یہ نالے کے گھنے کلک سے گزر رہا تھا۔ جہاں اکثر اسے چاروں ہاتھ پیروں پر ہو کر آگے بڑھنے کی ضرورت پڑ جاتی تھی کیونکہ اس کلک میں کھیر کے چھوٹے چھوٹے کانٹے دار پودے مخلوط تھے۔ کلوا جیسے جیسے آگے بڑھتا، کیچڑ اور دلدل زیادہ ہوتی جاتی۔ ان سب باتوں سے اسے یقین ہو گیا کہ اس کے آگے ہی کہیں ہاتھی نے دن گزارا ہے اور شام تک وہیں رہے گا۔ اب اس کے لیے صرف یہ تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے یہ اُس تک پہنچ جائے' ورنہ شام ہو گئی تو ہاتھی رات میں کہیں اور نکل جائے گا کلک کے ختم پر بیت کی جھاڑیاں شروع ہو گئیں۔ یہ اور بھی زیادہ گھنی اور کانٹے دار تھیں۔ ان میں سے اسے اوندھے لیٹ لیٹ کر آگے کھسکنے کی

ضرورت پڑنے لگی۔ ایک جگہ ایسے ہی لیٹے لیٹے کھسک کر جھاڑی سے نکلا تو دیکھا کہ سامنے ہاتھی نے اپنا راستہ خود کاٹا ہے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ راستہ کاٹنے کے نشان پر کچھ دور چلا تو پھر گوبر ملا۔ اب جو اسے چھوا تو بالکل تازہ گرم گرم۔ اب اس نے پیروں کے نشانوں کے بائیں طرف چلنا شروع کر دیا کیونکہ ہاتھی بائیں آنکھ سے کانا تھا۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا، پیروں کے نشانوں سے اور زیادہ ہٹ کر چلنے لگا۔ جنگل کے گھن کی وجہ سے بار بار اسے پھر سیدھے ہاتھ کی طرف نشانوں کے قریب آ کر اُن کا رُخ دیکھنا پڑتا تھا۔ اس وقت کلوا کی یہ حالت تھی کہ خفیف سے خفیف آواز پر اس کے کان لگے ہوتے تھے۔ نگاہیں دائیں بائیں ہر طرف یکساں چل رہی تھیں۔ دونوں مٹھیوں میں دو دو زائد کارتوس اور بھرا ہوا رائفل سامنے اُٹھائے چوکنا، جھاڑیوں سے کتراتا ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اسی حالت میں ایک دفعہ پھر جب وہ پیروں کے نشانوں کی طرف آ رہا تھا تو اسے ڈالیوں کے چرچرانے کی آواز سُنائی دی۔ اب وہ آہستہ آہستہ بڑھا یہاں تک کہ وہ اپنے سے بیس قدم دُور کھڑے ہوئے ہاتھی کے پاس پہنچ گیا۔ ہاتھی ترچھا کھڑا ایک درخت کی ڈالیاں توڑ رہا تھا۔ کلوا نے دو فیر تڑا تڑ اس کی کنپٹی پر کیے جن سے ہاتھی گھبرا کر بھاگ پڑا۔ اب کلوا نے شور مچاتے ہوئے اس کا پیچھا کیا۔ کچھ دُور جانے کے بعد اس شور کی وجہ سے ہاتھی کلوا کی طرف گھوم پڑا۔ کلوا ہاتھی کے سامنے ساکت کھڑا ہو گیا اور جیسے ہی ہاتھی اُس پر جھپٹا، یہ پھر سے اس کے بائیں طرف ہٹ گیا اور نیزے بھر کے فاصلے سے پے در پے دو گولیاں پھر اسی کنپٹی پر رسید کیں، جن سے ہاتھی گھٹنوں کے بل جھکا اور پھر دھماکے کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ گرے ہوئے ہاتھی پر کلوا نے دو گولیاں اور جمائیں اور اس کے ساتھ ہی خود بھی بندوق کا سہارا لیتے لیتے جُھکتا چلا گیا اور بے دم ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اب ہاتھ پیر جواب دے چکے تھے لیکن انتقام کی آگ اب بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے پھر پڑے پڑے بندوق کھولی۔ خالی کارتوس نکالے اور جھولا گھسیٹا وہ کارتوس بھر کر اور فیر کرنا چاہتا تھا لیکن بندوق ہاتھوں سے گر گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

لیکن دوسرے دن صبح دس بجے امیر احمد فارسٹ گارڈ دو چوکیداروں کے ساتھ جب اس طرف آئے تو کلوا اسی ہاتھی کے پیٹ پر بیٹھے ہوئے سر پکڑے رو رہے تھے۔ قانوناً انھیں گرفتار کیا گیا اور ناجائز اسلحہ کے استعمال کا مقدمہ اُن پر چلایا گیا اور ساتھ ہی پانچ سو روپے کے انعام کے مستحق ہونے کی بھی اطّلاع دی گئی اور ان سب کارروائیوں کے سلسلے میں ایک دن میجر بوسٹ کو بھی برسرِ عدالت سر جُھکا کر اپنے شکار کے تمام واقعات صحیح صحیح دُہرانے پڑے۔ اپنے بیان میں جہاں کہیں میجر بوسٹ اُڑنے کو ہوتے، فوراً ڈپٹی کمشنر یعنی لوئس کا باپ انھیں وہیں روک دیتا تھا اور پھر کلوا پاسی سے اس کی تحقیقات کے مطابق سوال کرتا تھا کیونکہ لوئس کی خوشی تھی کہ میجر بوسٹ سے خود اُن کی بُزدلی کا اقرار کرایا جائے جسے سُننے کے لیے وہ خود بھی عدالت میں موجود تھی۔



